جادۂ نسیاں

بھولتی یادیں

حکیم ڈاکٹر سید محمود احمد برکاتی

ترتیب: ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی



قافلہ ماضی کی لو دیتی ہوئی یادوں کا
"رہرو جادۂ نسیاں سے کوئی کیا جانے"

جادۂ نسیاں

بھولتی یادیں

از

حکیم ڈاکٹر سید محمود احمد برکاتی



ترتیب

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

کتاب سرائے
بیت الحکمت کا اشاعتی ادارہ
الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

۱۴۳۰ ہجری ۲۰۰۹ء

نام کتاب : جادۂ نسیاں

مؤلف : حکیم ڈاکٹر سیّد محمود احمد برکاتی

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۴۲۵روپے

ترتیب

جھلکیاں



عرضِ حال

میرے محبِ صادق اور پرانے کرم فرما حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب کا تعلق ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کے ایک معروف علمی خاندان یعنی خانوادۂ برکاتی سے ہے۔ ٹونک، ہنداسلامی تہذیب کے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ حکیم صاحب نے ٹونک کے علاوہ اجمیر اور دہلی میں تعلیمی مراحل طے کیے اور چند سال ٹونک میں مطب کرنے کے بعد کراچی چلے آئے۔ ان چاروں مقامات پر انھیں بہت سی معروف اور غیر معروف شخصیات سے ملاقاتوں کے مواقع میسر آئے۔ ان میں بیشتر ایسے تھے جن کی سیرت کے اوصافِ حمیدہ سے وہ متاثر ہوئے اور ان خوبیوں کو حرزِ جاں بنا کر انھوں نے صفحۂ قرطاس پر ان یادگار زمانہ لوگوں کی قلمی تصویریں کھینچ دیں۔ ان تحریروں کا قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ مصنف نے جہاں اپنے پیش کردہ کرداروں کے کمالات کا ذکر کیا ہے وہاں ان کی کوتاہیوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بعض ''بڑے'' لوگوں کی ''چھوٹی'' باتوں کا تذکرہ ہمارے لیے انکشاف کا حکم رکھتا اور ہمیں اچنبھے میں ڈال دیتا ہے۔ کچھ مضامین ایسے اشخاص پر ہیں جن سے حکیم صاحب کی ایک آدھ ملاقات رہی اور انھوں نے ان کے بارے میں مختصر تاثرات قلم بند کرنے پر اکتفا کی ہے۔ مولانا مودودی پر مضمون انفرادی حیثیت کا حامل ہے جس میں موصوف سے شخصی تعلق رکھنے والے حضرات کے

تاثرات بیان کیے گئے ہیں۔

یہ تمام مضامین مختلف اوقات میں قلم برداشتہ لکھے گئے تھے اس لیے بعض مقامات پر واقعات کی تکرار سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ ناگزیر تھا۔ ان نوشتوں کی سب سے بڑی خوبی ان کے مؤلف کا خلوص اور راست گوئی ہے۔ اس پر مستزاد زبان کی سادگی اور شیرینی جو قاری کو مسحور کر لیتی ہے۔

حکیم صاحب اپنے صاحب علم و فضل اسلاف کے صحیح جانشین ہیں۔ ان کی خصوصی دلچسپی علم و فن طب کے علاوہ تاریخ، تحقیق اور شعر و ادب سے ہے۔ اب تک ان کی کم و بیش دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں تاہم مختلف شخصیات پر ان کی یہ تحریریں اب تک یکجا نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں سے جو مضامین مختلف جرائد میں چھپے تھے وہ میری نظر سے گزرے تھے اور پسند آئے تھے۔ چنانچہ میں برسوں سے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کے مجموعے کی اشاعت کا منتظر تھا۔ ادھر حکیم صاحب اس ضروری کام سے یکسر بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔ آخر چند ماہ قبل کراچی کے بعض مشترک دوستوں اور حکیم صاحب کے نیازمندوں نے مجھ سے کہا کہ میں موصوف کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں۔ میری درخواست پر میرے محترم نے کمالِ شفقت و عنایت سے یہ سب لوازمہ مجھے ارسال کر دیا جس کے لیے میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

جب میں ان تحریروں کو ترتیب دینے بیٹھا تو ایک کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ حکیم صاحب کے جدِ امجد حکیم سیّد برکات احمد مرحوم و مغفور کے بعض نامور تلامذہ جن کو ہمارے مخدوم نے بخوبی دیکھا ہوا تھا اور جن کا تعارف وہ اپنی تالیف ''مولانا حکیم سیّد برکات احمد'' (کراچی، ۱۹۹۳ء) میں شامل کر چکے تھے، زیرِ نظر مجموعے سے غیر حاضر تھے۔ ان اصحاب میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا معین الدین اجمیری، علامہ سیّد مختار احمد اور مولوی عبدالجلیل عرف ٹونک ملا جیسے بے نظیر لوگ بھی تھے۔ چنانچہ میں نے حکیم صاحب کی اجازت سے انھیں اور ایسی

چند اور شخصیات کو اس مجموعے میں داخل کر لیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ان مضامین کی موضوع شخصیات، جو تعداد میں چھتیس ہیں، حکیم صاحب کے لیے ''مردم دیدہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مضامین کی ترتیب میں متعلقہ شخصیت کی تاریخ وفات کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر ملحوظ رکھی گئی ہے البتہ پہلا مضمون ''امّاں'' اس پابندی سے مستثنیٰ ہے۔ متذکرہ بالا چھتیس مضامین کے علاوہ نو عنوانات ایسے ہیں جو مختلف وجوہات کی بنا پر اس صف میں جگہ نہیں پا سکتے تھے تاہم میں انھیں چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا لہٰذا ان کو ''جھلکیاں'' کے نام سے بطورِ ضمائم کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

حکیم صاحب کی تحریروں میں کسی قسم کی اُلجھن محسوس نہیں ہوتی۔ عندالضرورت وہ حاشیہ بھی دے دیتے ہیں۔ بدیں سبب میں نے حاشیوں کا التزام نہیں کیا البتہ میرے والد مرحوم اختر شیرانی پر مضمون کے سہ ماہی ''سورج'' لاہور (سالنامہ ۲۰۰۶ء) میں شائع ہوتے وقت، اس کے مدیر محترم کے ایما پر میں نے کچھ حواشی کا اضافہ کیا تھا۔ وہ علی حالہ موجودہ اشاعت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان سے قطع نظر محض دو ایک مقامات پر پاورقی میں کوئی ضروری گزارش کی گئی ہے۔

حکیم صاحب کے پیش نظر مجموعہ ہٰذا کے بعض نام تھے تاہم مجھے اس کے لیے ''جادۂ نسیاں'' موزوں معلوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس میں جن شخصیات کا ذکر اذکار ہوا ہے، ان میں سے بیشتر پہلے ہی زینت طاق نسیاں بن چکی ہیں اور باقی ماندہ بھی جادۂ نسیاں پر گام زن ہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان لوگوں کے کردار آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لیے ''نور رستگاری'' کا فریضہ انجام دیتے رہیں:

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے ذکر کروں اور کہاں سے لاؤں ''انھیں''

مظہر محمود شیرانی



گفتنی

میرے یہ مضامین اپنے عہد کی کچھ شخصیات پر ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں کہ آج کل کی زبان میں انھیں خاکے کہا جائے گا یا کوئی اور نام دیا جائے گا۔ ان میں سے بعض تحریروں میں کسی سے اپنی ملاقاتوں کے تاثرات اور سرسری طور پر ان کے محاسن و مصائب بیان کیے ہیں۔ بعض پر سوانح کا رنگ غالب ہے۔ ایک دو کا انداز بیان کسی قدر جذباتی ہے۔ بعض پر مضامین میں نے اپنا فرض سمجھ کر لکھے ہیں اس لیے کہ میں یہ مضمون نہ لکھ دیتا تو پھر ان کے حالات کوئی نہ لکھ سکتا تھا۔ اور ان کے اخلاف تک ان کے متعلق اندھیرے میں رہتے۔

ان میں سے بعض نامور تھے اور علم و ادب کے کسی شعبے میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ بعض کسی شعبے میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے مگر نام نہیں پایا۔ صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے نام پانا ہی نہیں چاہا اور وہ نام وری سے گریزاں ہی رہے۔ دو ایک ایسے ہیں جن کا نہ تو نام ہوا معاشرے میں نہ ان کا کوئی مقام تھا حتیٰ کہ ان سے ملنے جلنے والے تک ان کی عظمت مقام سے بے خبر تھے مگر میری نظروں میں وہ ایک ''اہم شخص'' تھے۔

میں نے انھیں دیکھا تھا، بار بار دیکھا تھا، پرکھا تھا، برتا تھا اور انھیں بعض پہلوؤں سے بلند اور عظیم پایا تھا۔ ان میں سے کئی افراد میں بہت سی اور کسی میں ایک دو، سیرت و کردار کی وہ

خوبیاں، عظمتیں اور بلندیاں تھیں جواب کم یاب اور بعض بعض نایاب ہوتی جا رہی ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ عظمتیں اور بلندیاں اپنا مقام کھوتی جا رہی ہیں اور قدامت یا حماقت قرار دی جا رہی ہیں۔ دور جدید میں ان اخلاقی بلندیوں کو پستیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اسی لیے وہ لوگ مجھے یاد آتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو بڑی شدت سے یاد آتے ہیں۔ ان کی سادگی...... مزاج کی سادگی، دل کی سادگی، معاشرت کی سادگی، محبت، وضع داری، آداب کی پابندی، خودداری، باقاعدگی، ناسازگار حالات تک میں اصول کا پاس، شائستگی، جفاکشی، ایثار اور ان میں سے جو عالم تھے، ان کا کتابوں سے عشق، مطالعے کا شوق، اہل علم سے چشمک کے باوجود ان کا احترام، طلبہ پر شفقت، ان سے محبت، ان کی خدمت، ان کے احترام کی تلقین، یہ سب باتیں مجھے، جیسے جیسے میں بگڑتا جا رہا ہوں، میرا ماحول بگڑتا جا رہا ہے، گرتا جا رہا ہے، بدلتا جا رہا ہے، یاد آیا کرتی ہیں اور میں ان یادوں میں کھو سا جاتا ہوں۔ موقع دیکھا، گنجائش دیکھی تو اس ''ورثے'' کو منتقل کرنے اور اس ''امانت'' کے مستحق کی تلاش کے ولولے سے اپنے حلقے کو، اپنے بچوں کو، دوستوں کو سنا بیٹھتا ہوں اور چونکہ موت کے قدموں کی آہٹ صاف اور واضح سنائی دینے لگی ہے، کتاب زندگی کا ورق الٹنے ہی والا ہے، میں ان یادوں کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے، ان متفرق مضامین کو ایک مجموعے کی شکل دے رہا ہوں کہ میری زبان بند ہو جائے تو یہ نقوش قلم یہ فرائض انجام دیتے اور یہ سعی رائگاں کرتے رہیں۔

یہ تحریریں گزشتہ چند برسوں میں مختلف اوقات میں لکھی گئی تھیں۔ صرف دو مضمون فرمائش پر لکھے گئے تھے ورنہ باقی مضامین لکھ لکھ کر اپنے مزاج کے مطابق ''حفاظت'' سے رکھتا گیا۔ ان کو لکھتے وقت ان کی اشاعت کا کوئی تصور ذہن میں نہیں تھا نہ بعد میں کبھی خیال آیا۔ بس انھیں یاد کرنے کا یہ ایک ڈھنگ سمجھ میں آیا تھا۔ احباب نے دیکھا تو ان کی طباعت کے درپے ہوئے مگر اس کے لیے ان مضامین کی تبییض کی ضرورت تھی۔ مشکل یہ ہوئی کہ بدخط تو پہلے ہی تھا اور اب تو طول عمر نے خط اور بھی خراب کر دیا ہے۔ اس مشکل کا

حل میرے عزیز بھائی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے یہ نکالا کہ ان کی نقلیں خود کرنے بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی ان مسودات کو صاف کرتے وقت ان پر سرسری نظر ثانی بھی کی۔ بھلا اس لطف و کرم کی کوئی حد ہے کہ ڈاکٹر شیرانی جیسا علمی اور تحقیقی مشاغل میں مسلسل مصروف انسان اس کے لیے وقت نکالے۔ بعض احسانات پر اظہار تشکر کی جراءت ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کے مترادف ہوتی ہے۔

محمود احمد برکاتی



امّاں

دادی صاحبہ مرحومہ (مولانا برکات احمد کی اہلیہ) مولانا علی احمد محدث عظیم آبادی کی نواسی اور مولوی سیّد عبدالرحمٰن مونگیری کی صاحبزادی تھیں۔ ولادت ۱۸۶۹ء۔ فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا مولوی سیّد علی احمد محدث عظیم آبادی سے حاصل کی تھی جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ عربی اتنی جانتی تھیں کہ قرآنِ مجید کی آیات کا ترجمہ بے تکلف کر لیتی تھیں۔ روزانہ تلاوت کلام اللہ کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ قرآن (موضح القرآن) کا مطالعہ بھی پابندی سے کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کئی تفاسیر بھی مسلسل مطالعے میں رہتیں۔

مجھے جب عربی کی شدبد ہوئی۔ تو میں نے ایک بار کہا۔ اماں! (ہم لوگ دادی اماں کو اماں کہا کرتے تھے) اللہ میاں نے کہا ہے کہ اموال واولاد فتنہ ہوتے ہیں اور میں ناسمجھی سے فتنہ کا اردو مفہوم سمجھ رہا تھا۔ امّاں نے فرمایا: فتنہ کے معنی آزمائش بن جاتے ہیں اور انسان انصاف نہیں کر سکتا۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا ذخیرۂ کتب تھا جو انہیں جہیز میں ملا تھا۔ اُن کا یہ ذخیرہ چند جزدانوں میں بندھا رہتا تھا اور اردو فارسی، نظم ونثر کی دینی واخلاقی کتابوں پر مشتمل تھا۔ آثار محشر، گلزارِ جنت، طبّ نبوی، سرّ الشہادتین، راہِ نجات، علاج الغرباء، تفسیر الحمد سیّد احمد شہید، نصیحۃ المسلمین. مشارق الانوار، تفسیر عزیزی اور موضح القرآن کے نام اس وقت یاد رہ گئے

ہیں۔ ان میں سے ایک دو کتابوں کا مطالعہ روزانہ تلاوت کے بعد لازماً کرتی تھیں۔ صبح کی نماز کے بعد تقریباً دو گھنٹے اس کے لیے وقف تھے اور اسی لیے ان کتابوں کا بیشتر مواد انہیں یاد تھا۔ نصیحۃ المسلمین انہیں مکمل ازبر تھی۔ مثنوی جہادیہ پوری ازبر تھی۔ ہمیں بھی یاد کراتی تھیں۔ تلاوت بالجہر نہیں کرتی تھیں۔ کوئی اور کرتا تو منع کرتیں کہ دوسرے گنہگار ہوتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ حکم ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو سنو مگر دوسرے مصروفیت یا بے توجہی کی بنا پر سن نہیں سکیں گے۔ جب موج میں ہوتیں، مثنوی جہادیہ کے اشعار بلند آواز میں پڑھتیں یا ہم لوگ سنانے کی فرمائش کرتے تو خوش ہوتیں اور سناتیں۔ آپا جان (میری خواہر محترم) کو یہ سب نظمیں یاد کرادی تھی۔ وہ نہایت قوی الحفظ ہیں اور انھیں آج تک یاد ہیں۔ آپا جان سے سن سن کر مجھے بھی یاد ہوگئی تھیں۔ یہ شعر شاید سات آٹھ برس کی عمر سے مجھے یاد ہے:

اے مُسلمانو! سُنی تم نے جو خوبیٔ جہاد
اب چلو رن کی طرف اور چھوڑ دو تم گھر کی یاد

مغرب کی نماز کے بعد اُن کا دربار سجتا جس میں شہر کی خواتین، مسائل دریافت کرنے، خانگی مسائل میں مشورے لینے اور علاج کے لیے اُن کے پاس آیا کرتی تھیں۔ بچوں کے بہت سے امراض کے لیے چند دوائیں تیار کر کے رکھتیں۔ خمیرہ مروارید ہمیشہ تیار رہتا اور ضرورت مندوں میں تقسیم ہوتا۔ طب میں دسترس تھی۔ ایک بار میں نے کہا۔ اماں! کیا آپ حکیم ہیں جو یہ عورتیں دوائیں معلوم کرنے کے لیے آپ کے پاس آتی ہیں؟ فرمانے لگیں۔ حکیم کی بہو، حکیم کی بیوی، حکیم کی ماں ہوں۔ میں نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا: اور اب حکیم کی دادی بھی ہو جائیں گی. تو چہرہ فرطِ مسّرت سے کِھل اُٹھا۔

عربوں سے خصوصی عقیدت تھی۔ ٹونک کے رؤسا بھی عربوں کی خدمت کا خاص ولولہ رکھتے تھے۔ اس لیے عرب اور عرب نما ہندوستانی کثرت سے ٹونک آیا کرتے تھے۔ مولانا سید برکات احمد نے خاص طور پر عربوں کے قیام کے لیے اپنے والد ماجد کی مسجد سے متصل ایک مہمان سرائے (رباط الحکیم) تعمیر کروائی تھی۔ جب بھی کوئی عرب ٹونک آتا اُس کے قیام وطعام کے اہتمام میں اماں سرگرم ہو جاتیں اور چلتے وقت نذرانہ پیش کرتیں۔ طلبہ کی خدمت کو

واجبات میں سے سمجھتی تھیں۔ مولانا برکات احمد نے جب تک مدرسہ خلیلیہ کی بنا نہیں ڈالی تھی، اُس وقت تک ساٹھ ستر طلبہ ہمارے مکان میں رہتے تھے۔ مکان کا بڑا حصّہ طلبہ کے قیام کے لیے وقف تھا اور چھوٹا حصّہ مولانا اور متعلقین کے قیام کے لیے۔ ان تمام طلبہ کا کھانا بھی مولانا کے ذمے تھا، مولانا کے نہیں اماں کے ذمے تھا جو طلبہ میں 'بی' کہلاتی تھیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے ہشت سالہ قیام ٹونک کا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے 'بی' کے متعلق لکھتے ہیں:

حضرت (مولانا سیّد برکات احمد) کی یہ بیوی صاحبہ اُن گرامی قدر خواتین میں سے ہیں۔ جنھوں نے علم دین کی خدمت میں اپنے کو اپنے شوہر کا دستِ راست ثابت کیا۔ بیوی صاحبہ نے حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر مدارات کی۔ نہ صرف اُن کے قیام وطعام کا تیس پچیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ اُنھوں نے اُن بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ بعض بعض دفعہ ان غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے لیے بیوی صاحبہ کو اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑے۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو برکاتی سلسلے کو علمی آبادیوں میں ہم نہ پا سکتے۔ (معارف مئی ۱۹۹۲ء)

طلبہ کو بھی شاید معلوم ہو گیا تھا کہ 'بی' ہماری خدمت کو باعث اجر سمجھتی ہیں، اس لیے وہ بھی نازک مزاجیوں پر اُتر آتے تھے۔ مثلاً کھانے میں چند لمحوں کی بھی دیر ہو گئی یا ذرا سا نمک کم ہو گیا تو کھانا اُٹھا کر پھینک دیا۔ امّاں کے جونہی علم میں آیا تو برہم ہونے یا بُرا ماننے کے بجائے اُلٹا اُن کو منانے کی کوشش کرتیں۔ کبھی کسی ملازم کو کسی طالب علم سے کوئی شکایت ہو جاتی تو اُلٹا اُس کو سمجھاتیں:

> ''نیک بخت! تجھے یہ خیال نہیں کہ کتنی دور سے دوسرے مُلکوں سے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی اپنے ماں باپ کا لاڈلا ہوگا۔ آج یہ پردیسی ہیں۔ تمھارے بس میں ہیں۔ چار دن کی چڑیں ہیں، کل اپنے گھر سدھاریں گے، کیا یاد کریں گے۔''

طلبہ کے لیے امّاں کے ایثار کے سلسلے میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''حضرت حکیم صاحب بعض خاص پیچیدگیوں کی وجہ سے چند دنوں کے لیے مالی

پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن یہ ایک اندرونی واقعہ تھا۔ جس کی دوسروں کو خبر نہیں تھی۔ طلبہ کی جتنی تعداد پہلے کھانا کھاتی تھی، اندر سے اُن کے لیے ہمیشہ کھانا آتا رہا۔ ایک دن حضرت کی اہلیہ کو بالآخر اُنہی طلبہ کے لیے یہ کرنا پڑا کہ سونے کے کنگن اُنھوں نے اپنے ایک معتمد طالب علم (خود مولانا گیلانی) کو دیے کہ بازار میں بیچ کر یا گروی رکھ کر اُن کے روپے سے گھی اور گیہوں خرید کر لادے کہ طالب علموں کے کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ کنگن فروخت کیے گئے۔ اور ان طالب علموں کو کھلا دیے گئے جن کی طرف سے حکیم صاحب یا اُن کے اہلِ خاندان کو ایک جبے کا نفع نہ اُس وقت پہنچتا تھا، نہ اب پہنچ رہا ہے۔ اب قربانی کی ان مثالوں کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ لیکن انشاء اللہ یہی نیکیاں حضرت والا کے اب کام آ رہی ہوں گی اور خدا سے اُمید ہے کہ اُن کے پوتوں کے لیے آباء کا یہ صلاح باعثِ فلاح بن جائے۔''

(نظامِ تعلیم و تربیت)

مولانا گیلانی مرحوم میرے نام تعزیت نامے میں لکھتے ہیں:

''آپ کا جو غم نامہ ملا ہے، اس سے یہ معلوم کر کے کہ اپنی والدہ جن کے آغوش تربیت میں برسوں زندگی گزاری تھی، ان کا سایہ بھی ہمارے سروں سے اٹھا لیا گیا...... برسوں آپ کے والد مرحوم اور اس فقیر نے ایک ہی دسترخوان پر حقیقی بھائیوں کی طرح کھانا کھایا تھا اور مرحومہ تغمدہ اللہ غفرانہٗ نے ہم دونوں کے متعلق کبھی فرق نہیں کیا۔ جو وہ کھاتے تھے وہی اس غریب الوطن طالب علم کو بھی کھلایا جاتا تھا اگرچہ سچ یہ ہے کہ آپ کے گھر میں میرا قیام آٹھ دس برس تک جو رہا، وہ طالب علم کی حیثیت سے نہ تھا۔ میں اپنے گھر سے الگ ہو کر آیا تھا لیکن اس گھر سے زیادہ آرام دہ گھر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ماں باپ سے الگ کیا گیا تھا لیکن ان سے زیادہ شفیق ماں باپ کی گود میں ڈال دیا گیا میری ماں بھی ٹونک میں موجود ملیں اور میرے باپ بھی اور میرے بھائی بھی۔''

اس محبت اور شفقت کے نتیجے میں طلبہ بھی ان سے ماں کی طرح محبت کرتے تھے اور اس بت کے زور پر بعض طلبہ فارغ ہونے کے برسوں بعد متاہل اور خوش حال ہونے کے باوجود

کسی خاص کھانے کی فرمائش کردیتے تھے کہ 'بی' سے کہنا فلاں چیز کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔

ٹونک ایک اسلامی نو آبادی تھی، اس لیے وہاں آبادکاری کا سلسلہ آخر تک جاری رہا، افغانستان اور وسطی ایشیا کے بکثرت طلبہ فراغت کے بعد ٹونک ہی میں توطن اور تاہل اختیار کرلیتے۔ تاہل کے خواہش مند طلبہ کا رشتہ اماں خود تلاش کرتیں، خود پیغام دیتیں۔ اگر لڑکی کے والدین لڑکے کے حسب نسب کے سلسلے میں فکرمندی ظاہر کرتے تو فرماتیں ''حسب نسب تو مجھے بھی نہیں معلوم مگر یہ جانتی ہوں کہ اتنی دور سے علم دین حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ اور انہیں جن والدین نے اس سفر کی اجازت دی وہ یقیناً اللہ کے نیک بندے ہوں گے اور ان عالی نسب لوگوں سے یقیناً بہتر ہیں جو اپنی اولاد کو گٹ پٹ (انگریزی) پڑھا رہے ہیں۔ جو ان کو اپنی لڑکی دے گا خدا ان سے راضی ہوگا۔'' پھر شادی کے انتظامات کرتیں۔ رہنے کے لیے مکان تک تلاش کرکے دیتیں اور پھر اس جوڑے کو عمر بھر نوازتیں۔ ان کو وقتاً فوقتاً اپنا مہمان بناتیں، ان کی ہر نوع کی اعانت ونگرانی جاری رکھتیں، ان کی باہم شکررنجیوں کے وقت باہم صلح کراتیں۔ بیوی کو سمجھاتیں: نیک بخت اپنی قسمت پر ناز کر کہ ایک عالم دین سے بیاہی گئی ہے۔ ہر کسی کے مقدر میں عالم کہاں ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کو سمجھاتیں: میں بیچ میں پڑی تھی، آپ اس کے ساتھ بے پروائی یا زیادتی کریں گے تو میں اس کے والدین سے شرمندہ ہوں گی۔

سرائے (رباط الحکیم) کے مسافروں کی خدمت اگر ہم بھائیوں میں سے کسی کو کرتے دیکھتیں تو بہت خوش ہوتیں، بہت دعائیں دیتیں، حاجت مند مسافروں کی مالی اعانت بھی کرتیں۔ ہم نے کئی بار عربوں یا ضرورت مند مسافروں کے نام پر دھوکہ دے کر ان سے رقمیں وصول کی ہیں۔

نہی عن المنکر میں کسی بھی شخصیت اور اس کے معاشرتی درجے کا کوئی لحاظ نہ کرتیں۔ رئیس وقت کی بیگمات اکثر آرزو کرتیں کہ وہ ہمارے محلات کو رونق بخشیں۔ اوّلاً تو اماں ان دعوتوں کو ٹال دیا کرتیں کہ ''غریبوں کا امیروں سے کیا واسطہ''۔ بار بار کے اصرار پر تشریف بھی لے جاتیں تو کسی نہ کسی منکر، امر غیر شرعی اور رسم ناروا پر ٹوک کر ہی آتیں۔ سرکاری محلات کی

تقاریب میں بالالتزام مدعو کی جاتیں مگر ہمیشہ تقریب کے دو ایک روز پہلے یا بعد جا کر مبارک باد دے آتیں۔ ایک بار ایک بیگم کے اصرار و الحاح پر تشریف لے گئیں تو ڈیوڑھی ہی سے واپس آنے لگیں کیونکہ محل میں گانا ہو رہا تھا۔ بیگم کو اطلاع ہوئی اور انھوں نے گانا بند کروایا، جب اندر گئیں۔ شہر کی جس تقریب میں جاتیں تو اگر گانا ہو بھی رہا ہوتا تو موقوف کر دیا جاتا۔ ایک بار بھری محفل میں ایک ملکۂ وقت سے کہہ دیا کہ ''رکابی صاف کر کے اٹھو، برتن میں کھانا چھوڑنا منع ہے۔''

صبر و رضا کا یہ عالم تھا کہ میرے والد مرحوم اُن کی اکلوتی اولاد تھے۔ نو بچوں کے مرنے کے بعد بچے تھے۔ عین عالم شباب میں انھیں داغِ مفارقت دے گئے۔ اولاد کی موت کا داغ اور اولاد بھی سعید و رشید، فاضل اور کامل ...... مگر دیکھا یہ گیا کہ آنکھوں پر تو قابو نہیں چلا، وہ تو برس رہی تھیں اور مسلسل دس برس برستی ہی رہیں، مگر زبان پر اور دماغ پر اُن کا اقتدار حیرت ناک اور مثالی تھا۔ زبان سے کوئی بات نکلی تو بس یہ کہ اللہ کی امانت تھی اس نے جب چاہا، واپس لے لی۔ اتباعِ شریعت کا یہ عالم کہ بار بار کہتی تھیں:

''جلدی کرو، دفن میں دیر کرنے کا حکم نہیں ہے۔''

صابرہ شاکرہ، عالی حوصلہ، منتظمہ، بھولی بھالی۔ رمضان ۱۳۶۲ھ رستمبر ۱۹۴۳ء میں اس رابعہ عصر نے اُولیٰ سے اُخریٰ کی طرف سفر اختیار کیا۔

☆......☆......☆

مولانا سید شرف الدین یاس ٹونکی

۱۹۳۷ء میں مجھے اور میرے چھوٹے بھائی اختر میاں (مرحوم) کو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ حکیم نظام الدین صاحب کے اصرار پر کیا گیا تھا۔ وہی ہم دونوں بھائیوں کو لے کر دہلی گئے اور جامعہ میں ہمارا داخلہ کروا دیا مولانا شرف الدین بھیا کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی اس لیے جب ہم دفتر جامعہ (قرول باغ) پہنچے تو وہ بھی موجود تھے اور اگرچہ داخلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے متعلقہ کلرکوں ہی سے تمام مراحل بآسانی اور بلا سعی وسفارش طے ہو گئے تھے مگر وہ ہم دونوں کو ذاکر صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ مجھے آج بھی وہ منظر اچھی طرح یاد ہے کہ ذاکر صاحب کے دفتر میں میز کرسی نہیں تھی بلکہ فرش اور ڈسک تھا۔ مولانا شرف الدین بھیا کو دیکھ کر ذاکر صاحب نے سروقد تعظیم دی اور ادباً اپنی جگہ سے ہٹ کر بیٹھے۔ مولانا شرف الدین بھیا نے ہمارا یعنی ہمارے بزرگوں کا تعارف و تذکرہ شروع کیا اور دیر تک کرتے رہے اور ذاکر صاحب ان کے ہر جملے پر' گردن کو خم دے کر' ادب سے جی جی کہتے اور پھر ہماری طرف دیکھتے۔ بڑی دیر کے بعد اس کی نوبت آئی کہ ذاکر صاحب نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ تو پتہ چلا کہ مسئلہ کوئی نہیں ہے، داخلہ ہو چکا ہے مگر مولانا ذاکر صاحب پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ ایسے اور ایسے خانوادے کے بچے تمھارے یہاں داخلہ لینے آتے ہیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے جب دو ایک جملے اس مفہوم پر مشتمل کہہ دیے کہ ایسے خاندان

کے بچوں کا ہمارے یہاں داخلہ لینا، جامعہ کے لیے باعث افتخار ہے تو مولانا نے اس طرح سکون محسوس کیا گویا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہوں۔ شرف الدین بھیا سے ہماری دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ ان کے بھانجے مولوی سید احمد صاحب میرے رشتے کے چچا بھی ہوتے تھے اور ماموں بھی اور ہمارے خاندانوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ انھی روابط کی بنا پر ہماری دادی جان انھیں شرف الدین بھیا کہتی تھیں اس لیے ہماری زبانوں پر بھی یہی چڑھا ہوا تھا۔

جامعہ کا مدرسۂ ابتدائی غالباً اسی سال جامعہ نگر (اوکھلا) منتقل ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم بھی وہیں پہنچا دیے گئے۔ اب مولانا شرف الدین بھیا نے خود پر یہ فرض عائد کر لیا تھا۔ کہ ہر چند روز بعد اوکھلے فون کر کے مدرسۂ ابتدائی کے نگران سے ہمیں فون پر بلواتے اور خود ہماری زبان سے ہماری خیر و عافیت سن کر مطمئن ہوتے۔ فون پر گفتگو کرنے کا میرا پہلا اتفاق یہی تھا اور مجھے اب تک جامعہ کا فون نمبر ۲۲۱۹ یاد ہے۔

کئی بار مولانا کبر سن اور ضعف قویٰ کے باوجود قرول باغ سے اوکھلے تک آٹھ دس میل کی مسافت طے کر کے ہمارے پاس پہنچتے اور دارالاقامہ کے نگران کو' جو ان کا ادب کرتے تھے، ہمارا خیال رکھنے کی تاکید کر کے واپس لوٹتے۔ ایک بار جامعہ نگر میں کوئی جلسہ تھا جس میں مرکز (قرول باغ) سے بھی جامعہ کے اساتذہ شرکت کے لیے آئے تھے۔ مولانا جلسے میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ صرف ہم سے ملنے کے لیے سب کے ساتھ تشریف لائے۔ آنے والے عین وقت پر آئے تھے اس لیے سواریوں سے اتر کر سیدھے جلسہ گاہ میں پہنچے جہاں ہم پہلے سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مولانا نے پہنچتے ہی ہمیں بلوایا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ مولانا کے پاس ایک مٹی کی ہانڈی رکھی تھی جس میں وہ ہمارے لیے کھیر پکوا کر لائے تھے۔ کھیر مٹی کی ہانڈی میں پکائی اور مٹی کی رکابیوں میں نکالی جاتی تھی۔ اس طرح اس میں سوندھاپن آ جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ کھیر اپنے کمرے میں لے جانا اور تم دونوں ہی کھانا اور کسی لڑکے کو کھانے مت دینا۔ بار بار یہ تاکید فرماتے اور ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ پھر فرمایا "جاؤ، یہ ہانڈی اپنے کمرے میں لے جاؤ۔" چنانچہ ہم دونوں ہانڈی لے کر اپنے کمرے

کی طرف چل پڑے۔ راستے میں میری اور اختر میاں کی جھپٹ ہو گئی۔ میں حد سے زیادہ شرمیلا تھا (اور ہوں)۔ اس لیے مولانا سے جدا ہوتے ہی میں نے اپنی بھڑاس نکالنی شروع کی کہ "بھلا بھیا کو کھیر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ لائے بھی تھے تو بھرے جلسے میں سب کے سامنے بلانے اور دینے کی کیا ضرورت تھی۔ سب لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے تو بڑی شرم آرہی تھی۔ بھیا بھی عجیب آدمی ہیں۔" اختر میاں میں 'اللہ بخشے' میری طرح شرم اور جھجک نہیں تھی اس لیے ان کو یہ ساری کاروائی بالکل ہی نہیں اکھری تھی۔ کہنے لگے۔" وہ عجیب آدمی کیوں ہوئے۔ بچارے (بے چارے) ایک تو ہمارے لیے کھیر پکوا کر لائے ہیں اور آپ کو شرم آرہی ہے اور شرم آرہی ہے تو تم مت کھاؤ، میں اکیلا ہی کھالیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے دارالاقامہ کے زینے پر بیٹھ کر ہانڈی میں سے کھیر کھانا شروع کر دی۔ میں کچھ دیر تک برہمی کی وجہ سے الگ کھڑا رہا مگر جب دیکھا کہ اختر میاں کہیں کھیر ختم ہی نہ کر دیں تو میں بھی شریک ہو گیا۔ اور ہم دونوں نے ہانڈی صاف کر دی۔

مولانا سید شرف الدین یاس، ریاست ٹونک کے ایک معزز اور علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان اصلاً رام پوری تھا۔ رام پور سے یہ حضرات ٹونک منتقل ہو گئے تھے۔ [1] مولانا کے پرنانا مولوی سید محمد علی واعظ رام پوری، تحریک جہاد سے متاثر ہو کر سید احمد صاحب کے ساتھ ۱۸۲۴ء میں سرحد چلے گئے تھے لیکن سید صاحب نے انھیں میدان جہاد سے واپس بھیج دیا تھا کہ ہندوستان ہی میں تبلیغ کریں۔ چنانچہ انھوں نے بقیہ زندگی تبلیغ ہی میں بسر کی۔ ۱۸۴۲ء میں الہ آباد میں ان کا وصال ہوا۔ مولانا سید شرف الدین تقریباً ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۱ء) میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ٹونک ہی میں اپنے خاندانی بزرگوں بالخصوص اپنے ماموں مولوی حکیم سید سعید احمد اسعد (بن مولوی سید علی احمد سیماب) سے تعلیم حاصل کی اور سترہ سال کی عمر میں ریاست

---

[1] مولانا محمد علی واعظ، مشہور عالم دین مولانا سید حیدر علی رام پوری کے بھائی تھے جنھوں نے ۱۸۵۶ء میں ٹونک میں وصال فرمایا۔ مولانا واعظ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے چہل حدیث کا منظوم ترجمہ "باغ رحمت" کے نام سے کیا تھا جو نواب وزیر الدولہ نے چھپوا دیا تھا۔ مولانا کے تین لڑکے تھے، سید عبدالعزیز، سید ابراہیم اور احمد علی سیماب۔ آخر الذکر نے تزک جہانگیری وغیرہ کا اردو ترجمہ کیا تھا جو اسی دور میں شائع ہوا تھا۔ بیٹیاں چار تھیں۔ کلثوم، بانو، صغریٰ اور عائشہ۔ آخر الذکر یعنی عائشہ (زوجہ سید نظام الدین) کی بیٹی شمس النساء تھیں۔ مولانا شرف الدین انھی کے بیٹے تھے۔

کے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۹۶ء میں مدرسہ ناصریہ (ٹونک) میں مدرس ہوئے۔ کچھ عرصے راولپنڈی کے ایک کالج میں پڑھایا اور ۱۹۰۸ء میں اٹاوہ میں مولوی بشیرالدین کے قائم کردہ مدرسے میں پڑھانے لگے۔ وہاں سے ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی تاسیس کے وقت علی گڑھ پہنچ گئے۔ علی گڑھ سے جامعہ کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے اور آخر تک جامعہ سے وابستہ رہے۔ اٹاوہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ان کے سب بھائی مولانا کے شاگرد رہے تھے اس لیے جامعہ میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ مولانا جب تک حیات رہے، جامعہ کے مشاعروں کی صدارت فرماتے رہے۔ ٦۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو وصال فرمایا۔

مولانا شعر بھی کہتے تھے۔ مومن اور یاس تخلص کرتے تھے۔

مکتبہ جامعہ سے ان کا ایک مختصر سا مجموعہ "تسخیر یاس" شائع ہوا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں ٹونک کے ایک سرکاری مشاعرے میں بھی مولانا شریک ہوئے تھے جس میں مقامی اساتذہ کے علاوہ ظہیر دہلوی، نواب سلیمان خان اسد لکھنوی، خواجہ مرزا خاں راقم وغیرہ مشاہیر اساتذہ بھی شامل تھے۔

(حدیقۂ راجستھان، ص ٦۔۴)

جگر مراد آبادی کو مولانا سے خاص عقیدت تھی اور مولانا بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ جے پور کے مشہور آل انڈیا مشاعرے (۱۹۳۶ء) میں جگر عالم بے خودی و سرشاری میں تھے اور مولانا ان پر برہم ہو رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ کہ "میں نے تیرے لیے خانۂ کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعا کی ہے" اور جگر صاحب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شاید شعلۂ طور" میں جگر نے مولانا کے ایک مصرع:

جان جائے مگر ایمان نہ جانے پائے

سے پہلے اپنا مصرع لگایا ہے جو کچھ یوں ہے:

جان جائے کہ رہے دیکھ مری جان جگر

ذیل میں مولانا کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

موت آتی ہے نہ کم بخت قرار آتا ہے
تجھ پہ اب رحم بہت اے دل زار آتا ہے

سچ ہے آساں نہیں وفا کرنا
تم جفا سے بھی جی چرانے لگے
جیتے ہیں اک امید مرگ پہ یاس
اور ارماں تو سب ٹھکانے لگے

رہے بے کسی سلامت مجھے کیا کسی کی حاجت
شب وعدہ تم نہ آئے شب غم اجل نہ آئے

مناتے تو رہتے کہ کچھ آس رہتی
بلا سے نہ ہوتی صفائی نہ ہوتی
خدا کی قسم ہائے کیا چیز تھے تم
اگر اک ذرا بے وفائی نہ ہوتی

تری دریوزگی میں لطف آتا ہے اسے ورنہ
تجھے معلوم ہے جو تیرے سائل کی تمنا ہے

کیوں نہ نکلے بوالہوس کی آرزو
اس کے دل سے آرزو بیزار ہے

جانے کس انجمن ناز سے تو آئی ہے
اے صبا تجھ سے مجھے رشک کی بو آئی ہے

مولانا کے صرف ایک صاحب زادے تھے عبداللہ الحفیٰ، بڑے متقی اور متبع شریعت۔
توحید کا رنگ غالب تھا مگر نا قابل برداشت حد تک متقشف تھے۔ بیڈن پورہ، اجمل روڈ پر

قرول باغ، دہلی میں رہتے تھے۔

طبیہ کالج کے دوران قیام، ان کے یہاں چند بار جانا آنا رہا۔ وہیں ان کے پھوپھی زاد بھائی یعنی مولانا کے بھانجے سید محمد ٹونکی صاحب (علی گڑھ) سے ملاقات ہوئی تھی۔ تقسیم کے بعد قرول باغ چھوڑ کر کشن گنج میں رہنے لگے تھے۔ محض (عبداللہ المحض) میاں سے آخری ملاقات ۱۹۵۲ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ پھر سنا کہ اولاد کی مغربیت زدگی سے بیزار و مایوس ہو کر حجاز ہجرت فرما گئے اور ۱۹۶۴ء میں مکہ معظمہ میں وصال فرمایا۔

مولانا کے بھانجے اور شاگرد سید محمد ٹونکی، مولانا کے ساتھ اٹاوہ اور علی گڑھ میں رہے، مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر علی گڑھ کالج چھوڑ کر جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں چلے گئے۔ بعد میں پھر مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ٹی کی سند حاصل کر کے یونیورسٹی کے ہائی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ آخر میں اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ اشتراکیت کے حامی و داعی تھے اور اشتراکی جماعت کے بڑے فعال وسرگرم کارکن تھے مگر نماز کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب جامعہ ملیہ کے طلبائے قدیم کا جلسہ ہوا تو میں بھی جامعہ کے سابق طالب علم کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا تھا اور ٹونکی صاحب بھی (وہ تو جامعہ کے اولین طلبہ میں سے تھے) مجھے دیکھا تو پوچھا ''اچھا تم کیسے؟'' میں نے کہا ''میں بھی جامعہ کا سابق طالب علم ہوں۔'' خوش ہو کر گلے لگا لیا اور خوش دلی سے کہا ''چلو دونوں ایک صف میں آ گئے۔'' ''بانیٔ جامعہ'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا، جس میں مولانا محمد علی جوہر کو بانی جامعہ ثابت کیا تھا۔ ۵ ستمبر ۱۹۷۴ء کو انتقال ہوا (''صدق جدید'' شمارہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء)

مولانا شرف الدین کے متعلق ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم کا ایک بیان ان کے انٹرویو (''نگار کراچی، مارچ۔ اپریل ۱۹۸۲ء) سے نقل کرتا ہوں:

''مولانا شرف الدین ہم تمام بھائیوں کے استاد تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ اگرچہ وہ بہت مشفق تھے مگر ہم اپنی نت نئی شرارتوں سے انہیں بہت تنگ کرتے تھے۔ وہ کلاس میں اور کلاس سے باہر ہمیں اپنے شعر سناتے اور شعر سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ہم اپنا فرض منصبی سمجھ کر انھیں خوب داد دیا کرتے تھے۔ ان کے تخلص تھے مومن اور یاس۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یاس تھے

تو داغ کے رنگ میں کہتے تھے اور مومن بن کر مومن خاں مومن کے رنگ میں کہنے لگے۔ ایک دن ہم نے ان کے ایک شعر کے متعلق، داد دیتے ہوئے کہا کہ یہ داغ کے رنگ کا ہے۔ بڑے برہم ہوئے کیوں کہ یہ مومن کے رنگ میں تھا۔ کہنے لگے۔ محمود حسین خان! افسوس تمہیں ابھی تک شعر سمجھنا نہیں آیا۔ حضرت بیدم وارثی سے ان کی خوب چشمک رہتی تھی۔ مولانا اپنے اور بیدم کے اشعار کا موازنہ کرتے تھے۔ ہم بیدم کا شعر سنتے تو برا سا منہ بنا لیتے اور مولانا کے شعر پر دل کھول کر داد دیتے۔ وہ پہلے بیدم کا شعر سناتے اور پھر اپنا۔ ایک دفعہ ہماری جو شامت آئی تو پڑھتے پڑھتے یہ ترتیب بدل گئی۔ ہم بیدم کا شعر سمجھے جو دراصل مولانا کا تھا۔ ہم نے کہا "کیا پھسپھا شعر ہے۔" مولانا کا پارہ چڑھا۔ بولے "محمود حسین خان! افسوس تمھیں اب تک اچھے اور برے شعر کی تمیز تک نہ آئی۔" ہم نے فوراً کہا "مولانا! معاف فرمائیں۔ ہم سمجھے تھے حضرت بیدم کا شعر ہے۔" مولانا اور برہم ہو گئے۔"



مولانا معین الدین اجمیریؒ

ولادت ۱۸۸۱ء۔ قرآنِ مجید کی تعلیم حافظ مرتضیٰ اور ابتدائی کتب مفتی سید احمد مجتبیٰ، مولانا نصیر احمد، مفتی خلیل الرحمٰن وغیرہ سے حاصل کر کے مولانا سید برکات احمد کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور فنون اور علوم دینیہ کی تمام کتابیں مولانا سے پڑھیں۔ ۱۹۰۳ء میں فاتحہ فراغ پڑھا اور اسی سال مدرسہ نعمانیہ (لاہور) میں صدر المدرسین بن گئے اور ڈھائی سال بڑے انہماک اور جوش کے ساتھ وہاں داد تدریس دی۔ مگران کے والد نے واپس آنے اور اجمیر کو مستقر بنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ مولانا اجمیر آ کر بیٹھ گئے۔ لاہور سے مولانا کے ساتھ ان کے گرویدہ طلبہ کی ایک جماعت آئی تھی۔ ابتدا میں انھیں نجی طور پر پڑھاتے رہے اور ۱۹۰۹ء میں معین الحق کے نام سے ایک مدرسے کا اجراء کر دیا، جو تین چار سال اجمیر کے نادار عوام مسلمین کی اعانتوں سے چلتا رہا مگر ۱۹۱۳ء میں ایک دن اچانک نظام دکن نے مدرسے کا دورہ کیا اور مولانا کے فضل و کمال اور تقریر و تفہیم سے متاثر ہو کر ساڑھے بارہ سو روپے ماہانا کی مستقل اعانت مقرر کر دی اور مدرسے کا نام معین الحق سے مدرسہ معینیہ عثمانیہ ہو گیا۔ چھ سات سال بعد بعض اسباب کی بناء پر مولانا مدرسے سے مستعفی ہو گئے اور مدرسہ حنفیہ صوفیہ کے نام سے ۱۹۱۹ء میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ درمیان میں کچھ عرصے کے لیے مولانا سیال شریف کے مدرسہ شمسیہ ضیائیہ میں تشریف لے گئے لیکن اجمیر کی کشش نے انھیں سیال شریف میں ٹکنے نہ دیا اور پھر

مدرسہ حنفیہ صوفیہ میں سرگرم تدریس ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں مولانا اپنے چھوٹے بھائی شفاء الملک حکیم نظام الدین کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت روضہ نبوی کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی سال مولانا کو سرطان پشت (کاربنکل) کا عارضہ لاحق ہوا جس کا ازالہ ایک طویل جراحی عملیہ سے کیا گیا۔ ذیابیطس کا مرض پہلے سے لاحق تھا۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا کا نصف اسفل مفلوج ہو گیا اور ۱۹۴۰ء میں ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

تدریس کے علاوہ مولانا دوسری علمی سرگرمیوں میں بھی گاہے بگاہے دلچسپی لیتے رہے۔ تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد ۱۹۰۳ء میں انھوں نے ایک آریہ مناظر سے نبرد آزما ہو کر اسے شکست دی۔ دہلی میں مولانا عبدالحق حقانی کے زیر اہتمام مسلمانوں اور آریہ سماجیوں کے درمیان مناظرہ ہو رہا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے مگر آریہ حریف (پنڈت داشا نند) مغلوب نہیں ہو سکا تھا۔ مجلس مناظرہ کے ایک منتظم مرزا محمد علی خان دہلوی کی نظر مولانا پر پڑی۔ وہ ان کے والد کے دوست تھے اور مولانا کی صلاحیتوں سے واقف۔ انھوں نے مولانا کو بلا کر اسٹیج پر کھڑا کر دیا۔ مولانا نے صرف سات منٹ میں آریہ حریف کو خاموش اور لاجواب کر دیا۔ اس واقعے نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ ۱۹۱۵ء میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے ایک تحریری مناظرہ کیا اور القول الاظہر اور تجلیات انوار المعین اعلیٰ حضرت کے جواب اور جواب الجواب میں لکھیں۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا ایک اہل حدیث عالم مولوی عبدالحکیم نصیر آبادی سے مناظرے کے لیے مال پورہ (ریاست جے پور) مدعو کیے گئے مگر مولوی عبدالحکیم صاحب مولانا کی آمد کی اطلاع سن کر مال پورہ سے چل دیے اس لیے مناظرہ نہ ہو سکا۔ انھی مولوی عبدالحکیم صاحب کی سرگرمیوں کی وجہ سے کیکڑی (ضلع اجمیر) میں ایک مقدمہ عرصے سے چل رہا تھا۔ آخر اس میں احناف کی طرف سے مولانا معین الدین اور مانعین تقلید کی طرف سے مولانا ثناء اللہ امرتسری شہادت کے لیے بلائے گئے اور مولانا اجمیری کی تقریر نے سب جج کو متاثر کیا اور اس نے مولانا امرتسری کے دلائل کو رد کرتے ہوئے احناف کے حق میں فیصلہ دیا۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا نے ایک اور معرکے میں حصہ لیا۔ کچھ دن سے چند اکابر مسلمین اس تجویز کے سلسلے میں سرگرم تھے کہ ملک کے مسلمانوں کو اپنا ایک امام یا امیر منتخب کر

لینا چاہیے۔ اس لیے کہ دار حرب سے اگر ہجرت ممکن نہیں ہے تو پھر غیر شرعی اور جاہلی زندگی سے بچنے کیلیے نظم جماعت اور نصب امیر واجب ہے اور اس سلسلے میں امام الہند کے لیے عام طور پر مولانا ابوالکلام کا نام ذہنوں میں اور زبانوں پر تھا چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس (منعقدہ دہلی نومبر ۱۹۲۰ء) میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور امام الہند کے انتخاب کی تجویز پیش کی گئی اور پُر جوش تقاریر کے نتیجے میں ایسی جذباتی فضا پیدا ہو گئی کہ حاضرین اجلاس علماء کی اکثریت، اسی وقت مولانا آزاد کو امام منتخب کرنے پر آمادہ ہو گئی مگر بہت سے علماء مولانا آزاد کی بعض غیر ثقہ عادات (مثلاً تمباکو نوشی وغیرہ) غیر عالمانہ وضع قطع اور نوعمری کے پیش نظر متامل و مذبذب تھے مگر اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لمحے مولانا معین الدین کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ نصب و انتخاب امیر سے کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر یہ کیا ضروری ہے کہ یہ کام آج ہی کر لیا جائے۔ بڑا اہم مسئلہ ہے اس لیے غور وفکر اور صبر وسکون کے ساتھ فیصلے کی ضرورت ہے، عجلت مناسب نہیں ہے۔ مولانا کی اس تقریر نے دوسرے شرکاء اجلاس کو بھی جرات ہوئی اور اس تجویز التواء کے حق میں کئی علماء اعلام نے تقاریر کیں اور بالآخر یہ تجویز ملتوی کر دی گئی ورنہ بقول حکیم اجمل خاں یہ خطرناک بات ہوتی۔ (ص ۱۶۵، سیرت اجمل)

مولانا معین الدین ملکی وملی سیاست میں بھی ہمیشہ سرگرم حصہ لیتے رہے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے قیام (۱۹۱۹ء) سے اس کے رکن اور مستقل نائب صدر رہے۔ جمعیۃ کے ایک سالانہ اجلاس (امروہہ، ۱۹۳۰ء) کی صدارت بھی فرمائی۔ جس زمانے میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید محبوس تھے مولانا ہر ہفتے اجمیر سے دہلی جاتے اور جامع مسجد میں تقریر کر کے تازہ ترین صورت احوال پر ہدایات دیتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کی مہم عدم تعاون کے دوران مولانا نے حکومت برطانیہ کی ملازمت فوج و پولیس کی حرمت کا فتویٰ دیا جس پر مقدمہ چلا۔ آپ نے عدالت کے سامنے حکومت برطانیہ کے خلاف اپنی عداوت اور استیصال حکومت کے لیے اپنی کمر بستگی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم اپنی تمام قوت اور اس کے ذرائع استعمال کریں گے، ہم حکومت کو چیلنج کرتے ہیں کہ اس کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں آپ کو اٹھارہ مہینے قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

۱۹۱۳ء میں مولانا مدرسے میں تدریس میں مستغرق تھے کہ نظام دکن (جو ان دنوں اجمیر آئے ہوئے تھے) آ گئے۔ استاد سلطان فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں ساتھ تھے۔ مولانا ان حضرات سے بے خبر بدستور درس میں مشغول رہے اور نظام دکن درس گاہ کے فرش پر بیٹھ گئے۔ درس کے اختتام پر مولانا انوار اللہ خاں متعارف اور مخاطب ہوئے اور فرمایا سرکار نظام تشریف لائے ہیں۔ مولانا معین الدین نے سلام کی سنت ادا کی۔ نظام نے کہا آپ کی "تفہیم خوب ہے" مولانا اجمیری نے بے نیازی سے جواب دیا "آپ کی سمجھ میں آئی؟" "جی جی! اچھی طرح۔" نظام دکن مولانا کے وفور علم، انداز تقریر، قوت تفہیم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مزید چار روز مدرسے آ کر مولانا کا سبق سنتے رہے اور سوالات کرتے رہے۔ سنن ترمذی، نور الانوار، تفسیر بیضاوی وغیرہ کے درس میں شرکت کی پھر ایک ہزار روپے ملازمین اور طلبہ میں تقسیم کرنے کے لیے پیش کیے اور مدرسے کی مستقل ماہانہ اعانت بارہ سو پچاس روپے مقرر کی۔ زہد، استغنا، توکل، جرات حق گوئی، صبر و رضا، تحمل شدائد مولانا کی حیات کے عنوانات تھے۔ ماہانہ معاوضے کا بہت کم حصہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے باقی رقم طلبہ پر صرف ہوتی تھی۔ سرطان پشت (کاربنکل) کا ایک طویل عمل جراحی آپ نے تبنیج (بے ہوشی) کی تدبیر کے بغیر کروایا۔ جراحت کار (ڈاکٹر سورج نارائن) حیرانی سے کہا کرتا تھا کہ اتنا بڑا آپریشن بغیر بے ہوشی کے میں نے آج تک نہیں کیا۔

مولانا کے رسائل و تصانیف:

۱: ازاحۃ شبات الشادی عن کلام الفاضل الخیر آبادی (۱۹۰۷ء)

۲: القول الاظہر (۱۹۱۰ء)

۳: چہار تازیانہ (۱۹۱۶ء)

۴: تجلیات انوار المعین

۵: حواشی قطبی و میر (۱۹۲۱ء)

۶: ازاحۃ اوہام الغفول عن کلام امام المعقول (۱۹۲۴ء)

۷: حیات طیبہ (۱۹۲۳ء)

۸: چہل حدیث

۹: خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند (۱۹۳۰ء)

۱۰: کلمۃ الحق

۱۱: الاسفاف

۱۲: رسالۂ حدوث دہری (۱۹۳۶ء)

۱۳: مبحث وجود

۱۴: رسالہ جعل

۱۵: رسالۂ تشکیک ماہیات

۱۶: رسالۂ علم وعلوم (۱۹۳۶ء)

۱۷: تقسم تصور وتصدیق

۱۸: متعلق تصدیق

۱۹: وجود رابطی

۲۰: الفرق بین الفرد التدریجی والحرکت التوسطیہ

۲۱: الاستعارہ

۲۲: ما اہل بہ لغیر اللہ

۲۳: الحج والعمرہ

۲۴: العمر

۲۵: حاشیۂ بخاری شریف (پارہ اوّل)

۲۶: حاشیۂ ترمذی شریف

۲۷: نثار خواجہ

۲۸: رسالۂ کلی طبعی (۱۹۳۹ء)

☆......☆......☆

علامہ سید مختار احمد

علامہ سید مختار احمد، فن ہیئت الافلاک اور جغرافیہ کے ایک عالم اور لغات و اصطلاحات کے متخصص اور ان موضوعات پر متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے۔ علامہ کے لغات و اصطلاحات سے اسی شغف کی بنا پر علامہ اقبال کے ورود دکن کے موقع پر سر اکبر حیدری نے انھیں یہ کہہ کر متعارف کرایا تھا کہ یہ دکن کے ڈاکٹر جانسن ہیں۔ نظام دکن نے انھیں مخطط عثمانی کا خطاب اور تاحیات وظیفہ برائے مشاغل علمی پیش کیا تھا۔ حیدر آباد دکن میں علامہ کا حلقہ احباب مولانا نظم طباطبائی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد)، ڈاکٹر عبداللطیف، عماد الملک سید حسن بلگرامی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ہاشمی فرید آبادی، فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان اور بابائے اردو مولوی عبدالحق پر مشتمل تھا۔ وہ فضیلت جنگ کی انجمن اشاعت علوم دینیہ کے رکن انتقادی بھی تھے۔

علامہ کے والد مولوی سید عبداللہ ٹونکی (م۱۹۰۵ء) تھے جو ریاست ٹونک سے دکن جا کر متوطن ہو گئے تھے اور وہاں ملا عبدالقیوم، مولوی چراغ علی اور محسن الملک وغیرہ سے ان کے گہرے مراسم و روابط تھے۔ مولوی عبدالحق نے مولوی چراغ علی کے لیے علمی مواد کے حصول کی خاطر ان کے مصر جانے کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۴، چند ہم عصر)۔ مولوی چراغ علی کے رسائل اور محسن الملک کی آیات بینات کا بیش تر مواد مولوی سید عبداللہ ہی کا جمع کردہ ہے۔ مولوی سید

عبداللہ نے نواب محمد علی خان والیٔ ٹونک کی فرمائش پر ''کحل العیون'' کے نام سے ''قرۃ العیون شرح سرور المحزون'' از شاہ ولی اللہ کی شرح بھی تین ضخیم جلدوں میں لکھی تھی، جس کا مخطوطہ ادارۂ تحقیق عربی و فارسی، ٹونک کے کتب خانے میں ہے۔ (ص ۲۸۵، قصر علم)۔

علامہ سید مختار احمد (ولادت ۱۸۷۸ء) نے قدیم علوم کی تعلیم اپنے والد مولوی عبداللہ اور نانا (مولانا سید علی احمد بہاری شاگرد محمد اسحاق محدث دہلوی) سے حاصل کی تھی اور انگریزی اور فرنچ زبانیں نجی طور پر سیکھی تھیں۔ علامہ نے ابتداء دکن میں مختلف محکموں میں ملازمت کی مگر فرائض منصبی کو علمی مشاغل میں حارج پا کر مستعفی ہو گئے اور یکسو ہو کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے۔

سید حسن بلگرامی کی سعی سے نظام دکن نے ''منصب'' (علمی وظیفہ) مقرر کر دیا اور اسی پر قناعت کر کے قرطاس و قلم کے لیے وقف ہو گئے۔ حیدر آباد دکن میں علمی و ادبی حلقوں میں ان کے فضل و کمال کی پذیرائی کی گئی اور متعدد مجالس علمی کے رکن بنائے گئے۔ مجلس اشاعت العلوم (انجمن اشاعت علوم دینیہ) کے رکن انتقادی، انجمن ترقی اردو کے رکن، مجلس جغرافی میں معتمد اور مجلس تقدم العلوم کے معتمد رہے۔ مولوی عبدالحق سے ایک دور میں بہت ربط رہا اور مولوی صاحب ہی کی فرمائش پر علامہ نے فرہنگ اصطلاحات علمیہ مرتب کی تھی مگر جب ۱۹۲۵ء میں یہ شائع ہوئی اور اس پر علامہ کا نام نہیں چھپا تو یہ روابط ختم ہو گئے۔ دکن کے ایک علم دوست رئیس راجا راجیشور راؤ اصغر علامہ کے بڑے مخلص اور قدر شناس تھے۔ لغات ان کا خاص موضوع تھا، سو سے زیادہ کتابیں ان کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ یہ سب علامہ ہی کی کاوشیں تھیں جس کا راجا کی طرف سے علامہ کو معقول معاوضہ ملتا تھا۔ علامہ مختار احمد کی وفات ۱۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔

علامہ کی مطبوعہ تالیفات:

۱: مختار الصرف، پہلی بار ۱۹۲۲ء میں چھپی اور اس کے بعد کئی بار چھپتی رہی ہے۔

۲: قاموس الاغلاط، مکتبہ ابراہیمیہ سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی (دار الاشاعت کے لیے ''مکتبہ'' کا لفظ علامہ ہی کا مجوزہ ہے)۔

۳: اضافت (علم نحو کی بحث اضافت پر محققانہ تالیف)۔

۴: مختار البیان فی لغات القرآن مطبوعہ ۱۹۱۳ء۔

۵: نزہتہ القلوب (عربی سے اردو میں ترجمہ)۔

۶: ہیئت جدید ۱۹۲۴ء۔

۷: القاموس العلمی و الادبی (جدید و قدیم علوم وفنون کی تقریبا دو لاکھ اصطلاحات معانی، تخیل وغیرہ پر دو ہزار صفحات کی کتاب تھی جس کا صرف ایک حصہ طبع ہو سکا۔

غیر مطبوعہ تالیفات:

۱: علم ہیئت قدیم و جدید ۱۲ سو صفحات۔

۲: ظواہر الجو یے (کرۂ ہوائی کے حالات) ۱۵۰ صفحات۔

۳: مظاہر فطرت، ۶ سو صفحات۔

۴: علم طبعی، ۶ سو صفحات۔

۵: جغرافیہ (ریاضی و سیاسی) ۸ سو صفحات۔

۶: ایران قدیم (قبل اسلام)۔

۷: علم طبقات الارض، ۱۵۰ صفحات۔

۸: قواعد اردو (انگریزی اور اردو تقابلی نحو) ایک ہزار صفحات۔



سلطانِ زاہد

تاریخ ملت کا مطالعہ جو حضرات عیب چینی کی خاطر کرتے ہیں ان کو بے شک اپنا مفید مطلب بہ آسانی مل جاتا ہے اور وہ ان خطوط سے ایک تصویر بنا لیتے ہیں۔ بھدی، بدشکل اور خوفناک لیکن اس کام میں منفعت کے مقابلے میں نقصان کے پہلو زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی اپنی تاریخ کے روشن پہلو تلاش کرنے اُٹھے تو اسے ہر دور اور ہر علاقے کے ورق ورق پر ایسے واقعات اور حقائق نظر آئیں گے جن کی جمع اور ترتیب کے بعد ایک ایسا دلآویز مرقع تیار ہوسکتا ہے جس کا مطالعہ خود مسلمانوں کے لیے ولولہ انگیز اور ہمت افزا اور غیر مسلموں کے لیے اسلام میں وجہ کشش ہوسکتا ہے۔ حکام، وزراء، قضاۃ، سپاہ، صوفیاء، علماء، اطباء، تجار اور عوام، غرض ہر طبقے کے افراد نے حسنِ سیرت اور عظمت کردار کے وہ نمونے پیش کیے ہیں جن پر امت مسلمہ بجا طور پر ناز کرسکتی ہے اور جن سے تاریخ اقوام کے صفحات تہی دامن ہیں۔ حکام کے عدل وعفو، وزرا کی فرض شناسی، قضاۃ کی دادرسی اور خشیت الٰہی، علماء وصوفیاء کی حق گوئی و جرأت، امراء کے تدبر و اتقاء، تجار کے متقیانہ حسن معاملت، سپاہ کے سرفروشانہ جذبات۔ ان سب تصاویر پر جو مرقع مشتمل ہوگا وہ یقیناً دل آویز ہوگا۔

میں ایک حاکم کی زندگی کی چند جھلکیاں پیش کر رہا ہوں۔ یہ حاکم ماضیِ بعید کا نہیں ماضی قریب سے تعلق رکھتا ہے۔ بغداد واندلس کا نہیں اسی برعظیم کا ہے۔

ان کا نام ہے نواب سعادت علی خان اور القاب وخطابات ملا کر پورا نام ہوا سعید الدولہ وزیر الملک ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں جی۔سی۔آئی۔ای، فرماں روائے ریاست ٹونک۔ ۱۹۳۰ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ حافظِ قرآن تھے۔ درس نظامی کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل کی تھی اور چوں کہ قوی الحفظ تھے اس لیے علمی مشغلہ نہ ہونے کے باوجود علم سے ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ جب کبھی علمی مسائل پر گفتگو ہوتی تو اپنی رائے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے اور کبھی مذاکرے کے دوران کوئی کتاب کھولی جاتی تو کتاب خود ہاتھ میں لے لیتے اور متعلقہ مقام کی عبارت روانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔

یہ بھی سُن لیجیے کہ میری نظر میں وہ معیاری حکمران نہیں تھے۔ پوری طرح فرض شناس حاکم نہیں تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں ریاست کے باشندوں کو وہ تمام حقوق حاصل نہیں تھے، جو ہونے چاہییں اور جب تک وہ زندہ رہے ہم ان سے خوش نہیں تھے، شاکی اور نالاں تھے۔ مگر موجودہ چالیس سالہ جمہوری حکمرانوں کے دور میں ان کی یاد بار بار آتی ہے اور اکثر اس دور اور اس دور کا موازنہ کرنا پڑتا ہے اور اس سلطانیِ جمہور کے ہاتھوں اپنے حقوق کی پامالی کو دیکھتے ہوئے اس موروثی نوابی کی تصویر کچھ زیادہ گھناؤنی اور ڈراونی نہیں رہتی اور سامراج، آمریت، شہنشاہی اور مطلق العنانی وغیرہ اصطلاحوں میں پڑے بغیر جب بھی سوچا دل نے ان جمہوری نمائندوں کے ساتھ مقابلے میں ان موروثی نوابوں کو ترجیح دی۔

نواب سعادت علی خان ایک دیسی ریاست میں نواب ہونے کے باوجود مغرور اور متکبر نہ تھے۔ مزاج میں سادگی تھی۔ لباس بہت سادہ اور معمولی پہنتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا کہ ان کے کپڑے اجلے تک نہیں ہوتے تھے۔ کسی قدر زہد کی طرف میلان تھا اور فقیری کی لٹک سی بھی تھی اور درویشانہ رنگ بھی بہت سی باتوں اور چند عادتوں سے جھلکتا تھا۔ اپنی مدح اور توصیف ان سے شاید نہیں سنی جاتی تھی۔ کئی بار شاعر ان کے قصیدے لکھ کر لے گئے۔ مگر دو ایک شعر سن کر انھوں نے شاعر سے قصیدہ لے کر رکھ لیا کہ میں خود پڑھ لوں گا۔ کئی اخلاقی محاسن کے حامل تھے۔ متدین نہیں تھے۔ وہ ریاست کے پہلے حکمران تھے جو ڈاڑھی نہیں رکھتے تھے مگر دین کی محبت اور حمیت بہت تھی۔ دین داروں کا لحاظ اور احترام بہت کرتے تھے۔ علما کو بعض مراعات تو

ریاست میں شروع ہی سے حاصل تھیں۔ مثلاً کمر بستگی اور نذر پیش کرنے سے مستثنیٰ تھے۔ مگر سعادت علی خان کو علماء سے کچھ زیادہ ہی قرب تھا۔ وہ ان کی سخنِ تلخ اور لہجے کی تیزی بھی بڑی سعادت مندی سے برداشت کر لیتے تھے۔

ایک بار ان کی ریاست کے ایک وزیر نے، جو ان کے قریبی عزیز بھی تھے، اپنی تنخواہ میں اضافے کی خواہش کی تو انھیں جواب دیا۔ "ارے بھائی! اسی تنخواہ کو غنیمت سمجھو اور اللہ کا شکر ادا کرو، ورنہ میں نوابی کا اہل نہ تم وزارت کے۔"

ایک بار ریاست کی عدالت شرعیہ میں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک فریق کے گواہ نواب صاحب بھی تھے۔ چنانچہ حسب طلب عدالت میں پہنچے اور ایک طرف خاموش کھڑے ہو گئے۔ مفتیوں نے دیکھ لیا، مگر ان کی آمد کو محسوس کیا نہ محسوس ہونے دیا۔ نہ تعظیم، نہ ہٹو بچو کی ہلچل بس جیسے اور دوسرے عام افراد آتے ہیں اسی طرح یہ حاکم وقت بھی عدالت شرعیہ میں ایک آدمی تھا جسے کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔

جب مقدمے کی پیشی شروع ہوئی تو پوچھا گیا:

"تمھارا نام؟"

"سعادت علی خاں۔"

"والد کا نام؟"

"نواب ابراہیم علی خاں"

یہ عدالت شرعیہ ہے، یہاں کوئی نواب نہیں ہوتا، ٹھیک ٹھیک نام بتاؤ۔

"ابراہیم علی خاں"

(فریق متعلق سے مخاطب ہو کر) دوسرا گواہ ہو تو پیش کرو۔ یہ مردودِ شہادۃ ہے اس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے۔"

اور...... اور سعید الدولہ وزیر الملک ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں جی سی آئی ای فرماں روائے ٹونک، مودبانہ پیچھے ہٹ گئے۔

اسی عدالتِ شرعیہ کے ناظم نے ایک بار نصیحت کا حق اس شان سے ادا کیا تھا کہ نواب لرز

کر رہ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ ریاست میں امساکِ باراں تھا۔ برسات کا موسم گزرا جا رہا اور بارش نہیں ہوئی تھی اس لیے نماز استسقا ادا کرنے کا فیصلہ ہوا اور جیسا کہ حکم ہے کہ ایسی نماز پیادہ چل کر میدان میں جا کر پڑھیں۔ نواب صاحب پیادہ چل کر عدالتِ شرعیہ گئے اور عدالت کے ناظم (قاضی محمد عرفان خان) صاحب سے کہا:

"چلیے قاضی صاحب قحط سالی ہے چل کر نماز پڑھیں۔" قاضی صاحب نے فرمایا، "جی ہاں سرکار! قحط سالی ہے نماز پڑھنے چلنا چاہیے، آپ اور ہم سب گنہ گار ہیں، مگر آپ راعی ہیں، رعایا کے بہت سے گناہوں کی ذمے داری بھی آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔ سچے دل سے توبہ کریں، پھر کیوں رحمت الٰہی جوش میں نہیں آئے گی۔"

نواب خاموشی اور تاثر کے ساتھ یہ باتیں سنتے رہے اور کہنے لگے:

"بے شک میں خاطی و عاصی ہوں اور میری ہی شامت اعمال سے یہ خشک سالی ہے۔ آپ چلیے، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کروں گا۔"

نماز ہوئی، امام صاحب نے مسنون دعائیں پڑھیں۔ نواب زور زور سے الحاح وزاری کر رہے تھے۔

"بارِ الٰہ! میں گناہ گار ہوں، سیاہ کار ہوں، تو نے مجھے اپنے بندوں پر راعی بنایا ہے۔ مگر میں ان کے حقوق ادا نہیں کر سکا اور میری ہی شامت اعمال نے یہ دن دکھایا ہے۔ تجھے ان بزرگوں اور معصوم بچوں کا واسطہ، ان بے زبان جانوروں کا واسطہ، ہم پر رحم فرما، ہماری خطائیں معاف کر دے اور بارانِ رحمت برسا دے۔ میں تجھ سے عفو کی بھیک مانگتا ہوں۔ میں اپنے تمام خفیہ اور ظاہر گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔"

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نواب کی آنکھیں ابھی برس رہی تھیں کہ گھر کر بادل آ گئے اور ٹوٹ کر برسنے لگے۔ سب نمازی اپنے اپنے گھروں کو بھیگتے ہوئے لوٹ رہے تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔

اسی عدالت شرعیہ کی اپیل، تین ارکان پر مشتمل ایک عدالتِ مرافعہ بھی تھی۔ دو مفتی ایک نواب، یہ عدالت اپیلیں سنتی اور فیصلے دیتی تھی، کبھی کوئی زیادہ پیچیدہ اور مختلف فیہا مقدمہ زیر

سماعت ہوتا تو اس عدالت کی ہنگامی توسیع کر لی جاتی اور شہر کے چند جید علماء کو بھی مدعو کر لیا جاتا تھا اور وہ آزادانہ ماحول میں تبادل خیال کر کے فیصلہ کرتے تھے۔ نواب اس مجلس میں برابر کا حصہ لیتے تھے۔ اس قسم کی ایک مجلس غالباً ۱۹۳۶ء میں ایک بار منعقد ہوئی تھی اور اس میں شہر کے دوسرے علماء کے ساتھ ایک عالم مولانا عبدالرحمان چشتی بھی شریک ہوئے تھے۔ انھیں شاہی مجلس میں شرکت پر بمشکل راضی کیا گیا تھا ورنہ وہ ایک قلندر مزاج، ارباب دنیا سے گریزاں بزرگ تھے۔ مولانا چشتی وہاں پہنچے تو اولاً نواب کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ ثانیاً چوں کہ پان اور تمباکو کا شغل فرماتے تھے اور بار بار پیک تھوکنا پڑتی تھی اس لیے نواب کے سامنے سے اگالدان اُٹھا کر اس میں پیک تھوک دی۔ یہ محفل اگر چہ علماء کی محفل تھی، مگر تھی تو محل شاہی میں۔ آداب شاہی کے خلاف یہ عمل دیکھ کر چوب دار نے اپنا فرض منصبی ادا کیا۔۔۔ باادب با ملاحظہ ہوشیار مگر نواب نے اس سے کہا۔۔۔ ''نہیں بھئی اس وقت نہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ یہ علماء کرام ہیں۔ یہ درباری پابندیوں سے مستثنٰی ہیں۔ مگر مولانا چشتی نے ایک بار پھر آدابِ شاہی کی خلاف ورزی کی اور خلاف ورزی بھی ایسی ویسی نہیں، شاہ کار قسم کی۔ مولانا کی عادت تھی کہ ان کا مخالف کوئی مہمل بات کہتا تو پہلے ایک قہقہہ سر کرتے اور پھر اس قائل کے قولِ مہمل کی تردید فرماتے۔ اس مجلس میں بھی مولانا نے نواب کی کسی بات کو مہمل قرار دے کر قہقہہ سر کر دیا۔ قہقہہ، ایوانِ شاہی میں ؟ وہ بھی نواب کی کسی بات پر، چوب دار نے پھر نعرہ لگایا۔۔۔ ''باادب۔'' ۔۔ مگر نواب کو اللہ غریق رحمت کرے، انھوں نے اب کی بار تو چوب دار کو جھڑکتے ہوئے فرمایا۔ ''یہاں سے نکل جا۔ یہ علماء کرام کی محفل ہے۔'' اور مولانا کی جوابی تقریر بڑے غور و ادب سے سنتے رہے۔

ایک بار ایک محفل میں باہر سے آئے ہوئے ایک خطیب بھی تھے۔ شہر کے کئی علماء بھی خصوصاً مفتی عبدالرحیم صاحب بھی تھے۔ جو عدالت مرافعہ کے رکن تو تھے ہی مگر یوں بڑے عالی مقام انسان تھے۔ صائم الدہر، حق گو اور علماء سلف کا ایک نمونہ۔ نواب صاحب کی ایک تجویز اور رائے تھی جسے وہ علمائے شہر پر بار بار پیش کر چکے تھے مگر وہ اسے رد کر دیا کرتے تھے۔ ان باہر سے آئے ہوئے خطیب اور انگریزی میں تقریر پر ان کی قدرت کی شہرت سن کر نواب نے سوچا

کہ ممکن ہے یہ اتنے قدامت پسند نہ ہوں اس لیے ان کے سامنے یہ تجویز رکھوں۔ قصہ یہ تھا کہ ریاست کی عدالت شرعیہ میں فقیہان کرام بے ریش گواہ کو شاہد عادل نہیں مانتے تھے۔ اور اس کو مردود قرار دے دیتے تھے۔ (ایک بار خود نواب کو مردود کر دیا گیا تھا) نواب کا کہنا یہ تھا کہ شریعت کا بے شک یہ حکم ہے، مگر چوں کہ اس دور میں عام طور پر داڑھی صاف کرواتے ہیں اس لیے ضروری نہیں کہ ہر قضیے کا ہر گواہ داڑھی والا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو ایسا فریق ہار جاتا ہے، جس کا حقیقی گواہ ڈاڑھی والا نہ تھا، اور کبھی کبھی وہ کسی داڑھی والے کو فرضی گواہ بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اس لیے عموم البلوئی کی بنا پر شاہد کے باریش ہونے کی شرط ساقط کر دیں، چناں چہ انھوں نے خطیب صاحب کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا، اللہ ان خطیب صاحب کو معاف فرمائے۔ انھوں نے حق گوئی کے بجائے فرمایا۔۔۔ "سرکار کی بات میں بڑا وزن ہے۔"

یہ سن کر نواب صاحب نے فاتحانہ انداز میں مفتی عبدالرحیم صاحب کی طرف دیکھا کہ دیکھو ملک کا مشہور عالم میری تائید کر رہا ہے۔ مفتی عبدالرحیم صاحب گرجے "مبارک ہو سرکار! مولوی صاحب (خطیب کی طرف اشارہ) نے بھی تائید کر دی، کر دیجیے قانون نافذ کہ آج سے شاہد کا باریش ہونا لازم نہیں ہے، رہا عبدالرحیم، تو اس میں جرات کہاں کہ وہ محمد رسول اللہ کی شریعت کو بدل دے۔ سرکار! سوچیے تو، آپ راعی ہیں، حاکم ہیں، آپ کہہ رہے ہیں کہ چوں کہ لوگ زیادہ تر داڑھیاں نہیں رکھتے اس لیے شاہد کے ڈاڑھی رکھنے کی شرط ساقط کر دی جائے۔ اس کے بجائے آپ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ میری حدودِ مملکت میں کوئی مرد ڈاڑھی صاف نہ کرنے پائے۔"

مفتی صاحب جلال کے عالم میں سرگرم تقریر تھے کہ نواب نے قطع کلام کیا اور دونوں ہاتھوں سے منھ پیٹتے ہوئے کہا۔

"توبہ! توبہ! مفتی صاحب! میں تو اُن (سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم) کی گلی کا ایک ناپاک کتا ہوں، ایک حقیر اور سیاہ رو امتی ہوں، میں ان کی شریعت میں تبدیلی کی جسارت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں آپ حضرات علماء سے استفادہ کر رہا ہوں استفتاء کر رہا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے نواب کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

ٹونک میں اکثر ہیضے کی وبا پھوٹ پڑتی تھی، ایک بار ہمارے ہوش میں بھی ہیضہ پھیل گیا تھا۔ اس وبا میں نواب نے جس طرح خدمتِ خلق اور عوام کی خبر گیری کی اس کا نقش دلوں پر اب تک تازہ ہے۔ تمام اطباء کو سواریاں دی گئیں۔ کثیر مقدار میں ہیضے کی ادویہ دی گئیں۔ اور حکم ہوا کہ وہ چوبیس گھنٹے برسرکار ہیں اور مفت دوائیں تقسیم کریں۔ خود صبح سے شام تک گشت پر رہتے۔ اطبا اور ڈاکٹر جلو میں ہوتے دوائیں ہوتیں، گلی گلی گھومتے۔ صفائی اور حفظ صحت کے انتظامات کی نگرانی کرتے، بیماروں کی عیادت کرتے، مرنے والوں کے اعزہ سے تعزیت کرتے، تسلی دیتے۔ ہندو باشندے ایسے موقع پر آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر ڈیرے ڈال دیتے تھے اور ان کے محلے ویران ہو جاتے تھے۔ جس کو ہیضہ ہو جاتا اس کے قریب نہیں جاتے تھے اور وہ دوا اور تیمار سے محروم رہ جاتا تھا۔ ایک دن تختے (ہندوؤں کے ایک محلے) میں جا نکلے اور دیکھا کہ ایک غریب ہندو بنیا ہیضے میں مبتلا ہے، دست اور قے سے اس کے کپڑے آلودہ ہیں، سب اعزہ اسے چھوڑ کر چل دیے ہیں، اکیلا پڑا ہے۔ نواب نے خود کھڑے رہ کر اس کے کپڑے بدلوائے، اس کے حلق میں اپنے ہاتھ سے دوائی ڈالی اور اس کی تیمارداری کے لیے آدمی متعین کیے۔ ایک طبیب کو حکم دیا کہ وہ اس کا علاج کریں اور مجھے اس کی خبر دیتے رہیں۔

ریاست میں عورت کے مہر کی مقدار مہر حضرت فاطمہؓ کی بنا پر سوا سو روپے مقرر کر دی گئی۔ کسی کو اس سے زیادہ مہر باندھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مہر میں اضافے کا اختیار براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ کسی حاکم کو اضافے کا اختیار نہیں تھا۔ اور خود بڑی مشکل سے اضافے کی اجازت دیتے تھے۔

شادیاں کروانے کا بہت شوق تھا۔ چاہتے تھے کہ لڑکا لڑکی کی شادی میں دیر نہ کی جائے۔ زیادہ عمر نہ ہونے پائے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے گئے وہاں دو ایک مزید شادیاں کروا کر اٹھے۔ کسی صاحب سے کہتے تمہاری بیٹی کا نکاح ان کے بچے سے کیسا رہے گا؟" وہ جواب دیتے، "جیسے سرکار کی مرضی۔" اب لڑکے کے باپ سے استصواب کرتے، ان کا جواب بھی ایسا ہی ہوتا۔ تو کہتے۔ "بسم اللہ کرو" دیر کیوں کرتے ہو؟" اور

اچانک ایک اور نکاح بھی ہو جاتا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں گیہوں کی قلت ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں گاؤں گاؤں جا کر زمین داروں سے گیہوں خریدتے اور سرکاری دکانوں پر وہ فروخت ہوتا۔ اس دور میں شاید نا قابل یقین ہو کہ سترہ روپے من خرید کر سولہ روپے من بکواتے تھے۔ یعنی ایک روپیہ قیمت خرید سے کم میں۔

مولانا محمود الحسن صولت ٹونک کے ایک بزرگ شاعر تھے۔ زود گوئی اور فی البدیہہ گوئی میں ممتاز تھے۔ عرصے سے شہر کے اساتذہ میں سے، کثیر تعداد شعراء کی ان سے مشورہ کرتی تھی۔ شہر کے کئی روسا بھی ان کے شاگرد تھے۔ یعنی شاعر نہ ہونے کے باوجود اصلاح کے پردے میں ان سے غزلیں لکھوا کر مشاعروں پڑھتے تھے اور صاحب دیوان بلکہ ایک صاحب تو صاحب دواوین ہو گئے تھے۔ پورے سترہ دیوان صولت صاحب نے ان کی طرف سے مرتب کیے تھے۔ صولت صاحب قلندر مزاج اور جلالی طبیعت کے مالک تھے۔ مہمل بات پر انھیں جلال آ جاتا خواہ مہمل بات کسی بڑے سے بڑے آدمی کا ہی "نتیجہ فکر" کیوں نہ ہو، صولت صاحب بڑی بے باکی اور بے دردی سے اس سے معاملہ کرتے اور اہل محفل لطف لیتے تھے۔ نذر باغ میں سالانہ مشاعرہ ہوتا جس میں نواب صاحب اول سے آخر تک شریک رہتے تھے۔ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ صولت صاحب بطور خاص اس بزم میں بلائے جاتے اور التزاماً شریک ہوتے تھے۔ ایک بار وہ نواب صاحب کی کسی بات سے ناخوش تھے۔ مشاعرے میں پہنچ تو گئے اور طرح پر غزل بھی کہہ کر لے گئے۔ مگر طرحی غزل سنانے کے بجائے ایک نظم سنا ڈالی۔ وہ نظم ہجویہ، انتہائی گستاخانہ اور باغیانہ تھی۔ چند شعر اس وقت یاد آ رہے ہیں:

ظلم اتنا نہ کر، خدا سے ڈر
الحذر، الحذر، خدا سے ڈر

شعر پرداد، شہر پر بے داد
شاہِ بیداد گر، خدا سے ڈر

خیر ہم تو تری رعیت ہیں
ہم سے چاہے نہ ڈر، خدا سے ڈر

سامعین اور شعراء تو سناٹے میں آ گئے اور صولت صاحب کے بہی خواہ اور احباب و تلامذہ کے خون خشک ہو گئے کہ یہ کیا کیا؟ مگر نواب صاحب بڑی توجہ سے، بڑے سکون سے سنتے رہے، بعض مصرع دہراتے بھی اور نظم ختم ہونے پر کہا، ''جزاک اللہ!''

صولت صاحب نظم سنا کر جانے لگے تو، کہا:

''جا کہاں رہے ہو، طرحی غزل تو سناتے جاؤ۔''

''سرکار! میں لکھ نہیں سکا۔''

''اجی جیبیں ٹٹولو، کہی ہوگی، مل جائے گی نہیں کہی ہے تو پھر ابھی کہو، تمھیں کیا مشکل ہے؟''

صولت صاحب کی برہمی نواب صاحب کے انداز گفتگو سے دور ہوگئی اور ہنس کر جیب میں سے غزل نکال کر سنائی، جس پر نواب نے معمول سے ہٹ کر داد دی اور غزل کے اختتام پر کہا:

''ہمارے کلومیاں (صولت صاحب کا عرف) شمشیر برہنہ ہیں۔''

صولت صاحب اس داد سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے اور پھر ایک قصیدہ لکھ کر لے گئے۔ اس کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

ریاست رہے تا قیام قیامت
تو قایم رہے تا قیام ریاست

☆......☆......☆

اختر شیرانی مرحوم

رات کا وقت تھا۔ [1] چچا کے وسیع مردانے کے صحن میں محفل احباب آراستہ تھی۔ اختر صاحب اور چچا کے دو ایک مشترک احباب جمع تھے۔ ہم دو ایک نوعمر بھی اختر صاحب کی محبت و عقیدت کی وجہ سے اپنا رات کا مطالعہ چھوڑ کر شریک محفل تھے۔ ہماری موجودگی کے باعث مدرسے کے ایک نوجوان طالب علم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مردانے کے بیرونی دروازے کے برابر ایک کھانچا سا تھا۔ جس میں ایک طاق بھی تھا۔ اختر صاحب نے مردانے میں داخل ہوتے وقت شیروانی کی جیب سے ایک اڈھا نکال کر اس طاق میں رکھ دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر گوشے میں جاتے اور ایک منٹ بعد واپس آ جاتے۔ میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ بار بار ادھر کیوں جاتے ہیں۔ مگر وہ مدرسے کے مولوی صاحب تاڑ گئے اور ان کی رگ جہاد پھڑک اٹھی۔ وہ اٹھ کر طاق کی طرف چلے۔ معاً اختر صاحب کو بھی تنبہ ہوا اور وہ مولوی صاحب کے پیچھے لپکے۔ مولوی صاحب نے جیسے ہی اختر صاحب کو اپنے تعاقب میں پایا، وہ طاق سے

---

[1] شفاء الملک حکیم ظہیر احمد برکاتی کا تعلق حضرت سید احمد شہید کے معتمد خاص شیخ ولی محمد پھلتی کے اخلاف سے تھا۔ وہ ٹونک کے معروف فاضل حکیم مولانا برکات احمد کے بھانجے تھے۔ ۱۳۲۲ھ (۰۵۔۱۹۰۴ء) میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔ عالم دین اور ماہر طبیب تھے۔ نواب صاحب ٹونک کے معالج خاص اور دار العلوم خلیلیہ کے مہتمم رہے۔ ۱۹۶۰ تک ٹونک میں مطب قائم رکھا۔ پھر جے پور میں برکاتی دواخانہ کے نام سے یہ سلسلہ جاری کیا۔ ۲ فروری ۱۹۸۷ کو جے پور میں وفات پائی اور ٹونک لے جا کر اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (مظہر)

بوتل اٹھا کر باہر کی طرف دوڑ پڑے۔ گھر کے سامنے ہی مسجد تھی۔ [1] جس کی کرسی اونچی تھی۔ مولوی صاحب اس کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ ہم بھی پیچھے پیچھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اختر صاحب بھی سیڑھیاں چڑھنا چاہتے تھے۔ مگر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک ایک جھٹکے سے رک گئے۔ تقریباً ۶۵۔۷۰ سال پہلے کی بات ہے۔ مگر اب تک یہ منظر یاد ہے کہ جیسے ہی انھوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے قدم پکڑ لیے بلکہ جکڑ لیے۔ پھر فوراً ہی اس پہلی سیڑھی سے بھی نیچے اتر آئے۔ اور خاص تیور کے ساتھ کرارے لہجے میں کہا:

"مولوی صاحب! نیچے آ جاؤ، شرم کرو شرم، اس ناپاک بوتل کو لے کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ مجھے دیکھو۔ اللہ کے فضل سے ایک سیڑھی سے آگے نہیں بڑھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹے۔ سب بزرگ گھر کے پھاٹک پر کھڑے تھے اور اس منظر سے ششدر سے تھے اب اختر صاحب ایک خاص عالم میں چچا کی طرف متوجہ ہوئے:

"ظہیر میاں! آپ طلبہ کو علم دین کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کو تربیت بھی دیا کیجیے۔ شراب ناپاک ہے، حرام ہے، گندی چیز ہے۔ میں سیاہ کار شرابی ہوں مگر شراب کی حرمت کا قائل ہوں بالکل اسی طرح جیسے آپ اور یہ طلبہ اور علماء ہیں۔ بزرگوں کی تربیت کام آئی اور گناہگار اور مدہوش ہونے کے باوجود میں مسجد کی سیڑھیاں نہ چڑھ سکا اور یہ مولوی صاحب مسجد میں داخل ہو گئے۔"

اب مولوی صاحب بھی نیچے اتر آئے تھے اور حیران حیران سے، سہمے سہمے سے کھڑے تھے۔ اختر صاحب بولے:

"مولوی صاحب! بوتل نالی میں پھینک دو۔ اب یہ میرے کام کی نہیں رہی۔ میں گندہ آدمی ہوں میرے مقدر میں گندگی لکھی ہے۔ یہ بوتل تمہارے طفیل مسجد میں ہو آئی ہے اب میرے کام کی نہیں"

یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف بڑھے اور ان کے ہاتھ سے بوتل لے کر پوری طاقت سے دیوار پر دے ماری۔ بوتل بکھر گئی، شراب بہہ گئی۔

---

[1] مسجد حکیم برکات احمد جو عرف عام میں ہتو کی مسجد کہلاتی تھی۔ (مظہر)

اس واقعے پر ماہ و سال کی کم و بیش ستر تہیں چڑھ چکی ہیں۔ اور ان گردشوں نے میرے حافظے پر خوب خوب مشق کرم کی ہے۔ اس کے باوجود مجھے یہ سب کچھ اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اختر صاحب کی آواز یاد ہے، اپنی حیرت یاد ہے، اور اس وقت کا یہ تاثر اب تک یاد ہے کہ ان کا ایمان بڑا قوی تھا۔ وہ بادہ خوار تھے اور اس وقت بھی نشے میں تھے۔ ایک شخص ان کی بوتل لے کر بھاگ رہا تھا اور وہ پوری طاقت سے اس کا پیچھا کر رہے تھے کہ اس سے چھین لیں۔ اسی کوشش میں وہ مسجد کی سیڑھی پر بھی چڑھ گئے۔ مگر صرف ایک سیڑھی پر۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکے اور پھر اس پہلی سیڑھی سے بھی فوراً اتر گئے اور اس کے بعد انھوں نے جو باتیں کیں وہ ہوش وحواس کی باتیں تھیں، ایک مسلمان کی سی باتیں تھیں، جس کے دل میں شراب کی حرمت کا وہی عقیدہ تھا اور مسجد کے تقدس کا وہی جذبہ تھا جو ایک مسلمان کے دل میں ہوتا ہے۔ اس بوتل کے مسجد کے در تک لے جانے پر ان کا ملال دیدنی تھا۔

اسی مردانے کا ایک اور واقعہ بھی حافظے کی لوح سے محو نہیں کیا جا سکا، جوان کی ایمانی کیفیت اور ذکر رسول ﷺ کے احترام کا ثبوت ہے۔ چچا سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ اس زمانے میں اختر صاحب کی ایک نعت آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ بالخصوص ہر اتوار کی صبح کو نشر ہوتی تھی۔

سحر دم رحمت حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہل ایمان کو کہ وہ خیر الانام آیا

چچا کو یہ بہت پسند تھی۔ ایک بار اختر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ چچا نے ان سے یہ نعت سنانے کی فرمائش کی۔ اختر نے معذرت کی۔ چچا نے اصرار کیا تو بڑی لجاجت سے کہنے لگے:

"ظہیر میاں! آپ کہیں تو کوئی نظم سنا دوں۔ اس وقت نعت نہیں سنا سکوں گا۔ میں پھر آؤں گا اور یہ نعت ضرور سناؤں گا مگر اس وقت نہیں۔"

انکار کی وجہ سب لوگ سمجھ گئے۔ گویا نعت رسولؐ کے لیے جس طہارت جسم و ذہن کی ضرورت ہے اور حضور قلب کی جو کیفیت، اس کے لیے، ان کی نظر میں مطلوب تھی، اس وقت وہ

اس سے محروم تھے۔

اختر صاحب کا نام تو میں نے بہت ہی کم عمری میں سن لیا تھا اور ان کے ماہنامہ ''رومان'' کے شماروں کی ورق گردانی بھی کر لی تھی، جو ہمارے یہاں آتا تھا۔ پھر یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے ہی شہر کے ہیں، شاعر ہیں، بہت مشہور ہیں۔ کچھ دن بعد جب ہر چیز پڑھنے کی لت اور شعر و ادب سے فطری والہانہ شغف کی بنا پر ان کی نظمیں پڑھنے میں آئیں تو خوب خوب جھوما ہوں۔ ان دنوں حافظہ، جو آج کل بے جان ہو گیا ہے، اتنا ہی جان دار تھا، اس لیے طویل طویل نظمیں نوک زبان پر تھیں۔ ''رومان'' کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی ان کی نظمیں نظر سے گزرتیں۔ بعض قدیم رسائل کے فائلوں میں بھی اختر صاحب کی نظمیں پڑھیں مثلاً مولانا آزاد کے ''البلاغ'' میں ان کی ایک نظم غالباً ''ماں'' پڑھی تھی۔

اختر صاحب کو دیکھنے کی آرزو ۱۹۴۱ء میں پوری ہوئی جب وہ لاہور کی سکونت ترک کر کے ٹونک آئے۔ ان کے والد حافظ محمود خاں شیرانی اپنا عہد ملازمت ختم کر کے ٹونک آ رہے تھے۔ سعادت مندی کا بے مثال نمونہ ہے کہ اختر صاحب بھی لاہور جیسے علمی و ادبی مرکز کو چھوڑ کر، جہاں انھوں نے اپنے فن کے علم لہرا رکھے تھے، ٹونک آ بسے۔ ایک دن وہ میرے چچا سے ملنے تشریف لے آئے تو اپنے محبوب شاعر کی زیارت ہوئی۔ قد متوسط، بدن بھرا بھرا، رنگ سرخ و سفید، خدوخال دلکش، شیروانی اور چوڑے پائینچے کا پاجامہ، تمباکو نوشی سلسلہ نوشی کی حد تک، عقیدت کے جواب میں شفقت، مرعوبیت کے جواب میں بے تکلفی۔ اس وقت تک ان کا ایک ہی مجموعہ ''نغمہ حرم'' [1] شائع ہوا تھا، وہ بھی خواتین کے لیے۔ اس کی ایک بار اختر صاحب کو ضرورت لاحق ہو گئی۔ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ میرے پاس نکلا تو یہ باہم تعارف پختہ ہو گیا۔

پھر ان کا دوسرا مگر درحقیقت پہلا مجموعہ کلام ''صبح بہار'' [2] چھپا تو شاید ٹونک میں اس کا

---

[1] ''نغمہ حرم'' پہلی بار مکتبہ اردو، لاہور نے ۱۹۳۹ء میں شائع کی تھی۔ (مظہر)

[2] ''صبح بہار'' پہلی مرتبہ اختر صاحب نے خود چھپوائی تھی اس کی پرنٹ لائن یوں تھی: ''مسٹر اختر شیرانی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، لاہور سے چھپوا کر ٹونک راج سے شائع کیا'' ملنے کا پتہ ''میسرز حامد اینڈ سنز، علی گنج، ٹونک راج۔'' (مظہر)

پہلا خریدار میں تھا۔ ان کو خبر ہوئی تو اپنی شخصیت میں میری والہیت نے انھیں متاثر کیا۔ قریب آنے کی ہمت ہوئی تو میں مختلف ادبی و علمی موضوعات پر ان سے طالب علمانہ سوالات کرتا رہتا اور وہ بزرگانہ شفقت اور معلمانہ توجہ سے جوابات دیتے۔ ان کی شفقت نے کسی قدر گستاخ اور بے تکلف بھی کر دیا تھا۔ اس لیے نامناسب سوال بھی کر گزرتا تھا مگر وہ مایوس نہ فرماتے۔ مثلاً ان کی نظم ''یورہائی نس'' کے سلسلے میں میرے سوال کے جواب میں۔۔۔۔ ''فلاں رئیس کی فلاں صاحبزادی'' کی نشان دہی بھی بے خیالی میں فرما گئے۔ میں نے بھی آج تک ان کی امانت کا تحفظ کیا ہے۔ اسی طرح ''وادی سندھ سے ایک دعوت عشق'' کے سلسلے میں...... ''فلاں خاندان کی فلاں خاتون'' کی نشاندہی بھی اپنے بھولپن میں اور مجھ سے اپنائیت اور مجھ پر اعتماد کی بنا پر فرما گئے۔ الحمد اللہ میں نے بھی اب تک اس راز کو راز ہی رکھا ہے۔ انھی خاتون کا وہ خط بھی میں نے دیکھا تھا، جس کے جواب میں ''میرا موجودہ مشغلہ'' کے نام سے طویل نظم لکھی گئی تھی۔ اس خط کا جواب بھی میں نے لیٹر بکس میں ڈالا تھا۔

میں اسی تعلق اور عقیدت کی بنا پر، جوان سے تھی اور اس شفقت کے سہارے، جو وہ فرماتے تھے، ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا رہتا تھا۔ ایک بار ان کے والد مرحوم، حافظ محمود خاں شیرانی کا ذکر آیا تو فرمانے لگے۔ کہ آخر وقت میں کسی (شاید والدہ صاحبہ) نے میرے متعلق پوچھا کہ آپ اس سے خوش ہیں تو رو کر فرمانے لگے۔ ''اس کے علاوہ میرا کون ہے؟''

یہ کہتے ہوئے اختر صاحب کی آواز بھی رندھ گئی۔ پھر فرمانے لگے ''زندگی میں صرف ایک بار باوا نے ہمیں منہ لگایا تھا اور تنقید شعر العجم کا مسودہ دے کر فرمایا، اس پر ایک نظر ڈال لو۔ میں نے دیکھا تو جہاں جہاں لہجہ سخت ہو گیا، پنسل سے وہاں نرم کر دیا۔ ایک موقع پر انھوں نے یہ مصرع تک لکھ دیا تھا۔

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست''

حافظ صاحب کچھ دن انجمن ترقی اردو، دہلی میں بھی مولوی عبد الحق کے ساتھ رہے تھے۔ اس زمانے کا ذکر سنانے لگے کہ ایک دن ہم دونوں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے

تھے۔ مولوی صاحب کو شوخی سوجھی تو حافظ صاحب سے کہنے لگے۔ ''آپ کو معلوم ہے، اختر بہت مشہور (یا بڑے) شاعر ہیں؟''

باوا مسکرا کر چپ ہو گئے۔

اس زمانے میں جگر صاحب کی ایک غزل بہت مقبول تھی:

اے ہجوم نامرادی دل بہت گھبرائے ہے

''گھبرائے ہے، آئے ہے، جائے ہے، زمین تھی، مجھے متروکات کا استعمال بہت اکھرا ہم سنوں سے ذکر کیا تو انھوں نے حسب توقع طنز فرمایا۔ ''ماشاء اللہ آپ اتنے بڑے شاعر پر اعتراض فرما رہے ہیں؟'' مگر یہ بات نہ اس دو۔ میں دل کو لگی نہ آج تک کبھی یہ سوچا کہ فلاں شخص فلاں فن میں باکمال ہے لہذا اس کی غلطی کی تقلید کی جانی چاہیے۔ اس کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لیے میں نے اسی زمین میں چند شعر گھڑ لیے:

اس کے بارے میں غلط فہمی تھی ہم کو کس قدر
شیر سمجھے تھے اسے ہم، وہ تو لیکن گائے ہے
دوسروں کے واسطے ہیں اور بھی چیزیں کئی
میرے حصے میں وہاں بس ایک پیالی چائے ہے
کر رہے ہیں آپ متروکات کو پھر اختیار
اپنا اپنا ذوق ہے اور اپنی اپنی رائے ہے

مختصر یہ کہ میں اس باب میں حساس سا ہو گیا تھا۔

اختر صاحب اور ملک کے چند دیگر شعراء نے تک'' کے بجائے اشعار میں ''تلک'' بھی استعمال فریایا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے ان سے بڑے ادب سے عرض کی۔ ''اساتذہ نے تلک کو متروکات میں شامل کیا ہے، پھر آپ یہ لفظ کیوں استعمال فرماتے ہیں؟'' فرمایا ''تک کی نسبت تلک کانوں کو بھلا لگتا ہے۔'' ان کا یہ جواب میرے دل نشین نہیں ہوا۔ چونکہ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ ضرورت شعری تھی۔ چنانچہ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر آپ گفتگو میں بھی تلک استعمال فرماتے ہوں گے؟'' میری اس گذارش پر ایک لحہ تامل کے بعد وہ

کھل کر ہنسے، لطف اندوز ہوئے اور فرمایا۔ "چبھتا ہوا سوال ہے۔"

ان کے مزید قرب اور ان کے مزاج سے تعارف کا ایک نادر موقع یوں ملا کہ ایک بار بھری برسات میں گوٹ (پکنک) کا پروگرام بنا۔ چچا نے اپنے احباب [1] مولانا فضائی اور اختر صاحب کو مدعو کیا تھا۔ ہم نوعمر بھی بزرگوں کے ساتھ تھے۔ شہر سے دو تین میل دور ایک سرسبز پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا گھنا باغ تھا اس لیے اسے اندھیرا باغ کہتے تھے۔ ہم لوگ روانہ ہوئے تھے کہ کالی گھٹا چھا گئی اور ابھی ہماری منزل نہیں آئی تھی کہ گھٹاؤں سے زیادہ صبر نہیں ہو سکا اور وہ ٹوٹ کر برسنے لگیں۔ یہ دیوانہ گر موسم بھلا ہم نوجوانوں سے کیسے برداشت ہوتا چنانچہ ہم لوگ سواریوں سے اتر پڑے اور بھیگتے ہوئے دھومیں مچاتے، چہلیں کرتے، کھیلتے کودتے، راستہ طے کرنے لگے۔ اختر صاحب کے علاوہ سب لوگ اپنے کپڑے محفوظ رکھنے کی خاطر سواریوں میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ مگر اختر صاحب نے ہمارا ساتھ دیا اور موسم سے لطف اندوز ہونے میں ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ بھیگتے ہوئے ہنستے ہنساتے چلتے رہے۔ ہمارے ایک ہجولی ایک گھنے درخت کے نیچے پانی سے پناہ لینے لگے تو اختر صاحب چیخے۔ "یہ بچہ بے ذوق بڈھا ہے۔ اس کو بڑوں کے ساتھ سواری میں بٹھا دو۔ یہ برسات کی، ان گھنگور گھٹاؤں کی توہین کر رہا ہے۔" میں نے گرہ لگائی "ناشکرا ہے۔" بہت خوش ہوئے۔ "ہاں ناشکرا بھی ہے۔ کیسی نعمت ہے یہ بارش۔" اتفاق سے مجھے اختر صاحب کی ایک نظم یاد آ گئی۔

کوہساروں کا، بیابانوں کا، گلزاروں کا
منہ دھلاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
کوک کوئل کی، پپیہے کی صدا' مور کا شور
غل مچاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

---

[1] ابوالعرفان مولانا حبیب اللہ خاں فضائی کا شمار زمرہ علماء میں ہوتا تھا۔ وہ اختر صاحب کے لڑکپن کے استاد مولوی محمد صابر شاکر کے بھانجے اور اختر کے ہم سبق تھے۔ دونوں میں کمال بے تکلفی تھی۔ اختر صاحب ان کو فضائی کی تصحیف کر کے قصائی صاحب کہتے۔ شاعری سے بھی رغبت تھی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک اجمیر سے ماہنامہ "کیف" نکالتے رہے۔ اخبار "اتفاق" کی ادارت بھی کی۔ سیاسی میدان میں مولانا معین الدین اجمیری کے ساتھ کام کیا۔ مدتوں اجمیر میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ٹونک میں انتقال ہوا۔ (مظہر)

اس وقت یہی دو شعر یاد آرہے ہیں، اس وقت تو پوری نظم سنا دی تھی۔ اختر صاحب پر یہ نظم سن کر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ غرض ہم اس طرح کھیلتے کودتے اختر صاحب کی سربراہی میں منزل پر پہنچے۔ دیکھا کہ سب بزرگ ایک بارہ دری میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ کسی نے کہا۔ ''ان سب کے کپڑے خشک ہیں۔'' اختر صاحب چہکے۔ ''یہ سب خود بھی خشک ہیں۔'' ایک بزرگ نے کہا آپ لوگ تو تربتر ہو رہے ہیں۔ اختر صاحب نے جواب دیا۔ ''یہ ظالم گھٹائیں ایسی موسلا دھار بارش اور اس جنوں انگیز موسم میں اپنے کپڑے بچانے کے لیے مولانا فضائی کی سی بے ذوقی اور بے حسی کی ضرورت ہے۔ وہ ہم غریبوں کو کہاں نصیب؟'' پھر وہ ان بزرگوں کو بیٹھا چھوڑ کر اور ہم نوجوانوں کی ٹولی کو ساتھ لے کر باغ میں اتر گئے۔ بارش تیز ہوگئی اور ہم سب کا نشہ بھی تیز ہوگیا۔ یہ عرض کر دوں کہ اس روز اختر صاحب پیے ہوئے نہیں تھے۔ مگر ایسی موج میں تھے جیسے دو چار جام نہیں، خم کے خم لنڈھا چکے ہوں۔ ہم لوگ جامن توڑ کر لا رہے تھے۔ اور اختر صاحب بھی ہمارے ساتھ کھا رہے تھے۔ اسی ثناء میں بزرگوں کی طرف سے بلاوا آ گیا اختر صاحب بولے۔ ''جاؤ کہہ دو ہم کھائیں گے نہیں، ہم پی رہے ہیں۔'' مگر ہم نوجوانوں کی آنتیں کلام اللہ کی بہت سی آیات پڑھ چکی تھیں۔ اس لیے اختر صاحب بادل ناخواستہ اس رنگین ماحول سے نکلنے پر راضی ہوئے اور اوپر جا کر کھانا کھانا پڑا۔

اختر صاحب اس دن بڑی موج میں تھے اگرچہ کم سخن تھے مگر اس روز خوب چہکتے رہے کئی لطیفے اور مشاہیر شعراء کے بہت سے قصے سنائے ایک مشہور شاعر کے ترنم کی نقل مطابق اصل اتاری، غرض آخر تک چہکتے رہے۔

ایک بار دہلی میں اچانک ملاقات ہوگئی۔ میں ان دنوں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ کبھی میں ایسا کرتا تھا کہ ہوسٹل سے رخصت لے کر رات کو اپنے رفیق درس حکیم سید اشتیاق احمد مرحوم کے گھر چلا جاتا اور ہم مل کر امتحان کی تیاری کرتے تھے۔ ایک دن مغرب کے بعد اسی نیت سے نکلا تھا کہ چاندنی چوک میں اختر صاحب اور مجاز صاحب مل گئے۔ دونوں سرشار تھے اور بازار کا چکر لگا رہے تھے۔ اختر صاحب نے مجاز صاحب سے میرا تعارف کروا دیا اور ہم ایک پارک (غالباً کمپنی باغ) میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے ادبی مطالعے کے اظہار کے لیے مجاز

صاحب کے چند شعر، ان کی نظموں کے دو تین بند سنائے تو مجاز صاحب ترنگ میں آ گئے اور کئی نظمیں سنا ڈالیں۔

• اختر صاحب داد کے طور پر "شاباش" کہتے اور مجاز صاحب مسکرا دیتے۔ میں نے کہا "مجاز صاحب! نظم تو آپ نے ایک ہی کہی ہے۔" کہنے لگے "کون سی؟" میں نے کہا "خواب سحر"

اختر صاحب نے وہ نظم نہیں سنی تھی یا ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ اس لیے سنانے کی فرمائش کی۔ مگر مجاز صاحب جانے کیوں ٹال گئے۔ یہ میرا وہ دور تھا کہ ادب خصوصاً شعری ادب کے مطالعے کا جنون سا تھا۔ ان دنوں نئے شعراء میں سے شاید ہی کسی کا مجموعہ چھپا ہو اور میں نے حاصل نہ کیا ہو۔ نو عمری کا اتھلا پن بھی تھا کہ جو پڑھا ہے اس کا اظہار بھی ہو۔ چنانچہ جوش، جگر، حسرت، فراق، آرزو، اثر، حفیظ، پھر میرا جی، فیض، ن۔م۔ راشد، جاں نثار اختر، جذبی، ساحر وغیرہ نجانے کتنے شاعروں کا نام بتایا گیا اور یہ بھی بتا گیا کہ ان کے مجموعے میرے پاس ہیں، میں نے پڑھے ہیں اور ان پر اپنی "رائے گرامی" بھی بتاتا گیا۔ مثلاً میں نے کہا "جن جن شاعروں نے پہلے غزل گوئی کی مشق کی ہے وہ نظم میں بھی کامیاب ہیں۔ دیکھیے جاں نثار اختر نے اپنی فلاں نظم میں ایک نئے مضمون اور ایک طویل بات کو ایک شعر میں موزوں کر دیا ہے:

جس طرح اندھیرے میں ابھرتے ہیں بتدریج
ڈھلتی ہوئی تصویر کے برعکس نشانات

اس پر مجاز نے کہا۔ "ہاں بھئی، اس شعر پر تو میں نے انھیں داد دی تھی،، اور پھر جوش میں آ کر اپنی نظم، اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!

خوب لہک لہک کر سنائی۔

۱۹۴۶ء میں میری شادی کے موقع پر جیسا کہ رواج ہے، دوستوں اور عزیزوں نے میرے سہرے لکھے۔ شہر کے بعض بزرگ شعراء ① صولت صاحب، بسمل ② صاحب اور سیف

---

① استاد الشعراء سید محمود الحسن صولت ٹونکی، ولادت ۱۸۹۸ء وفات ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء۔ (مظہر)

② حضرت بسمل سعیدی۔ اصل نام سید عیسیٰ میاں تھا۔ ولادت ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۲ء) وفات ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء بمقام دہلی۔ (مظہر)

صاحب ❶ نے بھی کرم فرمایا۔ اختر صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے بھی از راہ محبت ایک سہرا لکھا حال آں کہ اس سے پہلے انہوں نے شاید ہی کسی کا سہرا لکھا ہو۔ یہی نہیں، میری بہنوں کی درخواست پر ان کی طرف سے بھی ایک سہرا لکھا۔ یہ دونوں سہرے ڈاکٹر یونس حسنی نے اختر صاحب پر اپنی کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔

اختر صاحب شراب پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ نجانے کیسے ان کو یہ لت لگی تھی۔ ان کی پرورش سخت نگہداشت کے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے ایسی کسی لغزش کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ٹونک چھوڑنے کے بعد ان کو کس قسم کا ماحول ملا کہ یہ کافر منہ لگ گئی اور اسی نے آخر ان کا کام تمام کیا۔ وہ پی کر بہکتے ضرور تھے۔ مگر بے قابو نہیں ہوتے تھے۔ چھوٹوں کا خیال، بڑوں کا لحاظ، آداب محفل کسی چیز میں فرق نہیں آتا تھا۔ صرف میرا ہی نہیں اور دوسرے کئی حضرات کا بیان ہے کہ نشے کی حالت میں بھی کبھی ان کی زبان سے خدا، رسول، مذہب، دینی شعائر کے سلسلے میں کوئی گستاخانہ جملہ سننے میں نہیں آیا۔ ان کے بزرگ سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے وابستہ رہے تھے اور ان کے ٹونک منتقل ہونے کا موجب ومحرک بھی یہی تعلق تھا۔

اختر صاحب عملی کوتاہی کے باوجود اپنے بزرگوں کی روش سے سرمومنحرف نہیں ہوئے تھے۔ ان کے کردار کا دامن شراب نوشی کے سوا ہر نوع کی آلودگی سے پاک تھا۔ وہ اخلاق و سیرت کے محاسن کے حامل تھے۔ مشرقیت اور قدامت ان کی ادا ادا سے جھلکتی تھی۔ ''نغمہ حرم' میں پردے کی حمایت میں ان کی بڑی موثر نظم ہے۔ ان کی جوانی کے دوست' مشہور کالم نگار نصر اللہ خاں نے لکھا ہے اور مجھ سے زبانی بھی فرمایا کہ اختر ایسے شرمیلے انسان تھے کہ اگر کوئی عورت ان کے دفتر میں آجاتی تو وہ گھبرا جاتے تھے۔ ان کے قومی وملی جذبات کی آئینہ دار وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے افغانستان کے سلسلے میں لکھی تھیں۔ ''فتح کابل'' اور ''آرزوئے یک جوان افغانی'' وغیرہ ان کی بڑی پر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں ہیں۔ نعتوں کی ایک خاصی تعداد ان کے حب رسول کی شاہد ہے۔ میں نے ایک بار ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق دریافت کیا تو

---

❶ مولوی محمد شریف خاں سیف ٹونکی، امام الشعراء حافظ عالمگیر کیف ٹونکی کے فرزند اور حکیم سید برکات احمد کے شاگرد تھے۔ ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ (مظہر)

فرمایا۔ ''مجھے بھی دعوت دی گئی تھی مگر بے دینوں اور خدا ناشناس لوگوں کا ساتھ میں کیسے دے سکتا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور اسی وجہ سے ترقی پسند اہل قلم اور نقاد مجھ سے ناخوش اور ہمیشہ برسر تنقیص رہے یا کم از کم نظر انداز کرتے رہے۔''

اختر کی منظومات میں لائے جانے والے اسماء سلمیٰ، ریحانہ، عذرا، وغیرہ میرے علم کی حد تک فرضی نام ہیں۔صرف تخیل کی کارفرمائیاں ہیں، یہ سب ان کی ذہنی تخلیق ہیں۔آب وگل کی دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔''رومان'' میں ایک نظم شائع ہوئی تھی۔''اک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔'' اس کے بعد''رومان'' ہی میں ایک گم نام نظم چھپی تھی۔''کیوں دیکھے۔'' اس نظم کے متعلق بعض حضرات سے سنا گیا تھا کہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا کی نظم ہے مگر کراچی میں جب محترمہ سے ملاقات ہوئی اور بار بار ہوتی رہی ہیں اور ان میں اختر صاحب موضوع گفتگو رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس قیاس اور سوءظن کی کوئی اساس نہیں ہے۔ وہ ایک باوقار اور بلند کردار خاتون ہیں۔ ان کا خاندان ایک شریف وموقر ومعزز خاندان ہے۔اختر صاحب کا جب بھی میں نے ان سے ذکر چھیڑا تو ان کی باتوں سے اختر صاحب کے ساتھ احترام وعزت کا وہی جذبہ جھلکتا نظر آتا ہے جو ایک نامور اور پسندیدہ شاعر کے لیے کس قاری کے دل میں ہوتا ہے۔

اختر صاحب ایک بار لکھنؤ کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔محترمہ کے گھر بھی ان کی دعوت ہوئی تھی۔مگر اس دور میں ان کے یہاں پردے کا رواج تھا۔اس لیے وہ پردے ہی میں رہیں۔اس وقت وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد تھیں۔ایک بار انھوں نے اختر صاحب کو آموں کا پارسل بھیجا تھا۔اختر صاحب نے ان کے شکریے میں یہ قطعہ لکھا تھا:

حیا نے لکھنؤ سے آم بھیجے
ہمیں بھیجے ہمارے نام بھیجے
نہ ہوں کیوں بندہ بے دام ان کے
کہ بھیجے آم اور بے دام بھیجے

سلمیٰ اور ریحانہ وغیرہ ناموں کے سلسلے میں اپنا یہ خیال بھی عرض کر دوں کہ شاید اختر

صاحب نے ابتدائی عمر میں عربوں کی تاریخ اور عربی شاعری کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ایک اثر ان کا یہ جرات مندانہ قدم ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار محبوب کے لیے صیغہ تانیث استعمال کیا۔ بعد میں دوسرے شعراء نے ان کی تقلید کی۔ یہ نام بھی عربی ادب سے ہی اخذ کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی نظموں میں عربی ماحول جھلکتا ہے، مثلاً ایک نظم ہے ''مرا نھا جواں ہوگا'' اس میں ماں کہتی ہے:

''ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا''

اردو ادب کی تاریخ میں اختر صاحب کا جو مقام ہے وہ میرا موضوع نہیں ہے۔ مختصر عرض ہے کہ وہ جوش اور جگر کے عہد کے صف اول کے شاعر تھے، غزل سے زیادہ نظم پر توجہ تھی اور رومانی شاعری میں وہ اپنے دور کے بیشتر شعراء سے ممتاز تھے۔ ن۔م۔ راشد، احمد ندیم قاسمی جیسے متعدد شعراء انھی کی رہنمائی میں آگے بڑھے تھے۔ اردو شاعری کی حد تک محبوب کی تانیث کی ترویج انھیں کا کارنامہ تھا۔ اس خصوص میں ان کو تقدم حاصل تھا۔ بعد کا ہر شاعر اس باب میں ان کا مقلد کہلائے گا۔

☆....

سیماب اکبرآبادی

سیماب صاحب کا نام میں نوعمری سے سنتا آ رہا تھا۔ میرے وطن (ٹونک) میں سیماب صاحب اور ساغر صاحب کا اس صدی کے دوسرے عشرے سے آنا جانا تھا۔ وہاں ان کے چند شاگرد بھی تھے۔ بسمل، شفق، فضائی وغیرہ۔ وہاں پر ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا، اس میں چند دوسرے مشاہیر شعراء کے ساتھ سیماب و ساغر بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ حضرات آگرے سے ایک ماہنامہ "پیمانہ" نکال رہے تھے۔ اس کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں ان کی کئی بار آمد ہوئی تھی اور ہم نے ہوش سنبھالا تو ان کی آواز بھی سنی۔ سیماب صاحب کی زودگوئی، مقامی اساتذہ سے ان کے معرکے، ساغر صاحب کا حسن صورت اور سحر ترنم، نئے نئے موضوعات پر ان کی نظمیں (مثلاً قطرہ سفر میں ہے) اور نیا رنگ تغزل ان سب باتوں کے چرچے ٹونک کے ادبی حلقوں میں سنے۔ مجھے ابتدا ہی سے شعر و ادب سے شغف رہا ہے۔ اس لیے بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سنتا تھا۔ مثلاً ایک بار سیماب صاحب نے ایک مشاعرے میں جب اپنی غزل کا یہ مقطع پڑھا:

سیماب تیرا شعر اترتا ہے عرش سے
میری بیاض شعر، خدا کی کتاب ہے

تو ٹونک کے ایک استاد اور ملک کے نامور نعت گو کیف ٹونکی نے (جو شاید نواب سلیمان

خان اسد کے شاگرد تھے) برجستہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی:

یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

(اپنے ہاتھ سے کتاب لکھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کا کلام ہے)

ٹونک میں برسوں سیماب کے اس شعر اور کیف صاحب کی اس برجستہ ''داد'' کے چرچے رہے۔ اسی طرح ساغر صاحب کے ان اشعار:

صبر وسکوں دو دریا ہیں بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکیں دل کی بارش ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے
کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

اور سیماب صاحب کے یہ شعر:

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

☆☆☆

کوئی یہ شکوہ سرا یاں جور سے پوچھے
وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے

☆☆☆

مری رو داد رو دادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

☆☆☆

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

ایک بار سیماب صاحب دہلی کے برلا مندر میں جانا چاہتے تھے۔ وہ ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ مہنت نے انھیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی جس پر انھوں نے ایک نظم لکھی تھی:

مجھے مہنت نے مندر کے در پہ کیوں روکا
سمجھ رہا ہے ابھی تک کہ بت شکن ہوں میں

ملک کی آزادی کے موقع پر ''شاعر'' میں ان کی ایک فارسی نظم چھپی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

ختم شد سلسلہ سطوت آل بابر
صاحب تاج و علم برہنے ساختہ اند

غالباً ۱۹۴۱ء میں ان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی ''موحد اعظم''۔شیطان نے آدم کو سجدہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ موحد اعظم تھا۔اس پر اخبار مدینہ بجنور میں مسلسل مخالفانہ مضامین شائع ہوئے اور سیماب صاحب کے شاگردوں نے بھی ''شاعر'' میں ان کے دفاع میں مضامین لکھے۔ایک مدت یہ سلسلہ رہا۔ہم لوگ دونوں طرف کے مضامین کا اجتماعی مطالعہ کرتے تھے اور مستفید اور محظوظ ہوتے تھے۔

انھیں شعر گوئی کی فقید المثال قدرت حاصل تھی۔طبیعت میں استقلال بھی تھا۔جو کام کرتے جم کر کرتے اور ختم کر کے رہتے چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کا مکمل منظوم ترجمہ کیا۔مثنوی مولانا روم کا مکمل ترجمہ کیا تھا جو فیروز سنز سے شائع ہوا تھا مگر ان کے نام سے شائع نہیں ہوا تھا۔ان دو کارناموں کے علاوہ غزلوں، نظموں کے متعدد مجموعے جن میں ایک کے متعلق دعویٰ تھا کہ صرف بیس روز میں منظوم کیا ہے اور اس دعوے کی صحت میں کلام کرنے کا جواز نہیں ہے۔اس کے علاوہ دوسروں کو غزلیں، نظمیں لکھ کر دینے کا مستقل سلسلہ تھا۔باقاعدہ دفتر بھی تھا اور ہر غزل کا نرخ مقرر تھا۔فرمائش پر بروقت تعمیل ہوتی تھی۔قدرت کلام کے ساتھ زود گوئی میں بھی ایسی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں (زود گوئی میں ایک محمود علی عرشی اجمیری اور دوسرے رئیس امروہوی کا مجھے ذاتی تجربہ ہے)۔

ایک حیرت انگیز واقعہ میرے سامنے کا ہے۔ٹونک تشریف لائے ہوئے تھے۔ایک مشاعرہ ہونے والا تھا جس کی صدارت انھی کو کرنی تھی۔مصرع طرح غالب کا مصرع تھا۔آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے۔رات کو مشاعرہ تھا۔صبح ایک صاحب نے فرمائش کی کہ خطبہ صدارت منظوم ہونا چاہیے۔سیماب صاحب نے بخوشی اقرار کیا کہ منظوم ہوگا۔ایک صاحب

نے بھولے پن سے پوچھ لیا کہ طرح میں؟ اس پر دو ایک شریک محفل حضرات بول پڑے کہ طرح میں خطبے کا کیا سوال ہے لیکن سیماب صاحب نے فرمایا ''جی نہیں' انشاء اللہ خطبہ صدارت منظوم ہوگا اور طرح ہی میں ہوگا۔'' اور پھر میں نے دیکھا کہ انھوں نے اس مشکل طرح میں منظوم خطبہ صدارت پڑھا جس میں خطبے کے سب اجزا تھے، شکریہ' انکسار وغیرہ۔

انھیں مادہ تاریخ نکالنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ بعض تو بڑے نادر مادے نکالے تھے مثلاً فانی بدایونی کی تاریخ وفات کا مادہ ان کے نام شوکت علی [1] خان میں مستتر تھا۔ خان بہادر میر ناصر علی دہلوی کا مادہ تاریخ وفات ہے ''میر ناصر علی خاں'' (۱۳۵۲ھ)

اتنے بہت سے شعبوں میں باکمال ہونے اور پھر بڑے استقلال سے ایک طویل عرصے تک مستقل سرگرم رہنے کے باوجود نہ زندگی میں انھیں پذیرائی حاصل ہوئی نہ انتقال کے بعد۔ صرف گنتی کے چند شعر اہل ذوق کو یاد ہیں۔ ان کی شخصیت میں جاذبیت نہیں تھی۔ مزاج میں سنجیدگی کسی قدر متجاوز تھی خشک طبیعت اور شئے لطیف کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ مسکراتے اور ہنستے کم ہی ہوں گے۔ قہقہہ تو میرے خیال میں انھوں نے کبھی لگایا ہی نہیں ہوگا۔

میں ان کے ''شاعر'' کا خریدار اور قاری تھا۔ دو ایک مضمون اور ایک دو غزلیں بھی میری اس میں چھپی تھیں۔ ایک بار انھیں ایک خط بھی لکھا تھا جس کا جواب بھی انھوں نے دیا تھا۔

ملاقات ایک بار ۴۴ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اور مشاعرے سے لوٹ کر شمس زبیری صاحب کے یہاں رات بسر کی تھی۔ رات کیا بسر کی تھی تین بجے آئے تھے اور علی الصباح اٹھ بیٹھے تھے۔ شمس صاحب نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ علی الصباح آ جاؤ اور ناشتہ بھی یہیں کرو۔ میں پہنچا اور تعارف ہوا تو اس طرح خوش آمدید نہیں کہا کہ طبیعت شگفتہ ہوتی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ ان کا مزاج ہی یہ ہے۔ ویسے بزرگانہ شفقت کا معاملہ کیا۔ میں نے بے تکلفی مگر ادب کے ساتھ باتیں کیں اور بہت سے سوالات کیے۔ انھوں نے اختصار کے ساتھ سب کے جوابات دیے۔ ناگواری کسی سوال پر محسوس نہیں کی۔ میں نے ان کی نظم ''موحد اعظم'' میں استعمال ہونے والے لفظ ''سرشتا'' کے لیے پوچھا تو

---

[1] فانی کا سال وفات ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) ہے۔ ''شوکت علی خاں'' سے یہ دونوں سن نہیں نکلتے، صراحت کی ضرورت تھی۔ (مظہر)

فرمایا اساتذہ نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ میں نے کہا کوئی مثال مستحضر ہے۔ فرمانے لگے ''بکثرت'' پھر میں نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

ان کے بعض تلامذہ کا بیان تھا کہ وہ باقاعدہ فارغ التحصیل عالم نہیں تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ عربی کہاں تک پڑھی ہے تو فرمایا بہت دور تک۔ شرح جامی وغیرہ پڑھ چکا ہوں۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ ابتدائی درجات کا نصاب ہے۔

ان کی غزل کا ایک شعر ہے جس کا مصرع:

مذاق غنچہ نشینی پہ یہ تبسم ناز

غنچہ نشینی کا مطلب میں نے اپنے یہاں کے مقامی اساتذہ سے بھی پوچھا تھا۔ اب سیماب صاحب سے پوچھا تو ان کا جواب تو اس وقت یاد نہیں مگر یہ تاثر یاد ہے کہ جواب دل نشین نہیں ہوا تھا اسی لیے شاید یاد نہیں رہا۔ مولانا حامد حسن قادری نے اپنے ایک مضمون میں ان پر اعتراض کیے تھے۔ ان میں سے ایک ''جوان العمر'' تھا۔ میرے دریافت کرنے پر سیماب صاحب نے فرمایا میں نے اپنے مضمون کا مسودہ دیکھا ہے اس میں جوان العمر نہیں جوان عمر ہے۔

شعراء کی مئے خواری کی بات چھڑی۔ اس زمانے میں یہ بات کہی جا رہی تھی کہ شاعر کے لیے بادہ نوشی ضروری ہے اور سب شاعر شراب پیتے رہے ہیں۔ فرمانے لگے شاید اسی لیے بعض چھوٹے شاعر بھی شراب پینے لگے مگر بڑے شاعر تو وہ نہیں بن سکے۔ صحت ضرور خراب کر لی ہے۔ اس سلسلے میں فرمایا کہ یہ لوگ بدی کے مبلغ بھی ہیں اور بہ جبر تبلیغ کرتے ہیں۔ ایک بار جوش میرے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا اور پلانا چاہ رہا تھا۔ مگر مجھے اللہ نے بچایا اور میں نے آج تک چکھی تک نہیں۔ اس سلسلے میں اپنی تحریک ''شعر مہذب'' کی تفصیل بتائی۔

سلسلہ شعر مہذب کا مرے گھر سے چلا

میں نے بتایا کہ میں ''شاعر'' کا بھی مستقل قاری ہوں اور آپ کے مجموعہائے کلام اور خطبات صدارت پڑھ چکا ہوں۔ سیماب صاحب ان میں شراب اور اس کے لوازم کے ذکر اور محبوب کے لیے یار کے لفظ کے استعمال سے اجتناب کی تاکید و تلقین اپنے تلامذہ کو کرتے رہتے

تھے۔ میں نے اس پر کسی قدر شوخی اور بے تکلفی کے انداز میں اپنے عدم اتفاق کا اظہار کیا‘ جس کو انھوں نے بزرگانہ فراخ دلی سے سنا اور خاموش ہو گئے۔ مولانا کا ایک شعر تھا:

تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمر محبت بسر کریں

میں نے عرض کیا کہ یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا۔ فرمانے لگے کیا سمجھے؟ میں نے کہا ''جن خاتون سے مجھے محبت تھی اور ان سے شادی کرنا چاہتا تھا‘ انھوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ میں سرے سے شادی ہی نہیں کروں گی اس پر میں نے کہا تمھارا تو شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے مگر ہمارا تو ارادہ ہے اور محبت ہم نے تم سے کی تھی اب شادی کس سے کریں۔'' اس پر فرمایا ''چند سال بعد اس کا مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ ابھی آپ کی عمر کم ہے''۔ (اس وقت میری عمر ۱۸ سال تھی) شاید میں ابھی تک جوان نہیں ہوا۔

☆......☆......☆

مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانیؒ کا اسم گرامی تو شعروسخن سے مناسبت طبع کی وجہ سے نوعمری ہی میں سن لیا تھا۔ ان کی غالباً پہلی غزل جو کسی رسالے میں نظر سے گزری اور نظر سے گزر کر جگر میں اترتی چلی گئی، وہ تھی جس کا پہلا شعر ہے:

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

پھر معلوم ہوا کہ حسرت صف اول کے غزل گوشعراء میں ممتاز ہیں۔ پھر جب میں ۱۹۴۲ء میں درس نظامی کا ایک مرحلہ طے کر کے آخری مراحل کی تکمیل کے لیے اجمیر پہنچا اور وہاں اخبارات ورسائل کے مطالعے اور ادبی حلقوں میں شرکت کے مواقع ملے تو معلوم ہوا کہ مولانا شاعر کے علاوہ ملک کے اہم سیاسی قائد بھی ہیں۔ پھر چند ماہ بعد ہی مولانا کی زیارت بھی نصیب ہوگئی۔ پھر درسِ نظامی سے فراغت کے بعد میں نے طبیہ کالج، دہلی میں داخلہ لیا تو دہلی میں بھی بار بار ہوتی رہی۔

میں نے جب پہلی بار مولانا کا دیدار کیا تو استعجاب وحیرت کا عجیب عالم مجھ پر طاری ہوگیا۔ سوچتا رہ گیا یہ ہیں حسرت! اتنے حسین اشعار کا خالق اور حسن ظاہر سے اس حد تک محروم اور نہ صرف فطرتاً محروم بلکہ خود بھی اس قدر غافل۔ سر پر ترکی (رومی) ٹوپی، شیروانی اور

پاجامہ۔ٹوپی خود مولانا کی ہم سن ہوگی، لباس بہت معمولی کپڑے کا۔وہ بھی اچھا سلا ہوا نہیں۔
مجھے مولانا کی یہ زیارت اجمیر شریف میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنے مسلک اور ذوق کے ہاتھوں سال میں کئی بار آیا کرتے تھے۔ خواجہ بزرگ کے مزار کی زیارت کی لگن ان کو لے آتی تھی۔ مسلم مشاہیر و اکابر میں اس ذوق و مسلک کے حضرات بکثرت اجمیر آتے رہتے تھے۔ شاعر، ادیب، مصنف، سیاسی راہ نما، عالم، رؤسا اور درویش نما امراء مگر ان میں سے کسی کو اپنے ظاہر کی طرف سے اتنا بے پرواہ نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس ان میں سے زیادہ حضرات تو اس کا خاص اہتمام کرتے تھے اس لیے یقین نہیں آتا تھا کہ فلاں فلاں میرے پسندیدہ اشعار کا خالق اتنا ''نادیدنی'' ہوسکتا ہے۔ مولانا چوں کہ قوالی کے لذت آشنا بھی تھے اس لیے درگاہ میں جو قوالی کی محفلیں دن رات گرم رہتی تھیں ان میں بھی بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے اور دیر تک شریک رہ کر جھوما کرتے تھے۔ فاتحہ خوانی اور قوالی سننے کے علاوہ ان کا زیادہ وقت درگاہ پر شاہ جہانی مسجد کے صحن میں گزرتا تھا، جہاں ان سے نیاز حاصل کرنے والوں میں شعراء بھی ہوتے اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے بھی۔ میں اوقات فرصت میں موقع نکال کر اس محفل میں جا پہنچتا تھا اور مختلف النوع موضوعات پر مولانا کی گفتگو سے، اپنی استعداد کے بقدر متمتع ہونا چاہتا تھا۔ زیادہ تر میری توجہ ان گفتگوؤں سے زیادہ مولانا کے انداز ملاقات' آنے والے کا استقبال، انداز نشست، لہجے اور صبر وتحمل کو دیکھتے رہنے پر تھی۔ اجمیر آنے والے بہت سے ''بڑے لوگوں'' کو اسی محفل میں بیٹھتے، بولتے دیکھا کرتا تھا مگر مولانا کا انداز ان سب سے الگ تھا۔ ان کی نشست میں نہ کسی قسم کا امتیاز تھا کہ ناواقف شریک محفل کو یہ تعین کرنا آسان ہوتا کہ جان محفل کون ہے، نہ ان کا انداز خطاب مرعوب کن تھا، نہ خود ہی بولے جانے کا جنون بلکہ وہ ایک اچھے سامع بھی تھے۔ تحمل سے بہت چھوٹے چھوٹے نیاز مندوں کی باتیں غور سے سنا کرتے تھے۔ دوران گفتگو بہت سے سیاسی رہنماؤں کا اور ان کے بیانات کا ذکر بھی آجاتا مگر اپنی رائے کے اظہار کے سوا نہ کسی کی تخفیف شان کرتے نہ ان کے کردار کا ذکر کرتے۔ خاص بات مجھے یہ محسوس ہوتی تھی کہ اس سادگی کے باوجود جو آتا مودب بیٹھتا اور اس کی نگاہیں مولانا کا طواف کرتی رہتیں۔ ہر شخص کو ان میں محبوبیت کا جمال نظر آتا تھا۔

مولانا کے اجمیر کے دوروں میں کئی بار ان کو قریب سے دیکھا، کئی بار مصافحہ کیا، دو ایک سوال بھی کیے اور دل پر ان کی عظمت کا نقش جمتا چلا گیا۔ ایک بار دہلی میں مولانا سے ملاقات، ان سے مختصر سی گفتگو، ان سے مصافحہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ غالباً ۱۹۴۵ء میں ہم نے طبیہ کالج (دہلی) کے ایک جلسے میں جن حضرات کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا تھا ان میں مولانا بھی تھے۔ چنانچہ ہم سسل ہوٹل پہنچے تو یوسف ہارون صاحب (کراچی) نظر آئے۔ انھوں نے کہا ''مولانا یہاں کہاں، یہاں تو ہم جیسے گنہگار ٹھہرتے ہیں۔ اللہ کے وہ نیک بندے تو مسجد میں ٹھہرتے ہیں۔'' ہم اسمبلی کی مسجد پہنچے تو وہاں مسجد کے ایک خادم نظر آئے۔ انھوں نے کہا: ہاں مولانا یہاں مقیم ہیں اور نماز کا وقت ہونے والا ہے، اس لیے وہ آتے ہی ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں مولانا تشریف لے آئے اور مسجد کے خادم سے اپنا کھانا طلب کیا۔ اس نے ایک پوٹلی لا کر پیش کر دی۔ مرکزی اسمبلی کے اس رکن کا کھانا ایک کپڑے میں بندھا ہوا تھا۔ مولانا ہم لوگوں کو لے کر ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ اپنا ''لنچ'' نکالا جو تین چار چپاتیوں اور ایک سبزی پر مشتمل تھا۔ مولانا نے کھانا شروع کرنے سے پہلے ہمیں بھی شرکت طعام کی دعوت دی۔ ہم تین طلبہ تھے جن میں سے دو نے معذرت کر لی۔ پر میں فوراً شرکت پر آمادہ ہو گیا۔ جا کر ہاتھ دھوئے اور مولانا کے ساتھ شریک ہو کر چند لقمے کھائے اور آج فخر کے جذبے کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میں نے اس فخر روزگار کے دسترخوان پر اس کے ساتھ کھانا کھانے کی عزت حاصل کی ہے۔

کھانے کے دوران ہی ہم نے اپنے جلسے میں شرکت کی درخواست کی۔ مولانا نے اپنا الٹا ہاتھ شیروانی کی جیب میں ڈال کر ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر ہمیں دی اور فرمایا: ''ذرا اس میں دیکھیے کہ اس تاریخ کو اور اس وقت کہیں مدعو تو نہیں ہوں۔'' ہم نے دیکھا کہ اس تاریخ اور اس وقت مولانا ایک جگہ مدعو تھے۔ مولانا نے معذرت کی کہ پھر تو میں آپ کے یہاں حاضر نہیں ہو سکوں گا۔ ہم نے عرض کی'' کالج کے طلبہ کو آپ کی شرکت کی بڑی آرزو تھی۔ کاش آپ تشریف لا سکیں۔'' مولانا نے فرمایا'' کاش آ سکتا مگر میں وعدہ کر چکا ہوں، معذور ہوں۔'' مولانا کی معذرت سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ کیونکہ اس جلسے میں مولانا کو مدعو کرنے کی تجویز میری ہی تھی جو میں نے بمشکل منظور کروائی تھی۔ مولانا نے میرے چہرے سے میرے ملال و

کرب کو پڑھ کر فرمایا ''ایک صورت سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ یوں کہ بہت سے حضرات وعدہ کروا جاتے ہیں مگر لینے نہیں آتے۔ اس لیے اگر وہ حضرات نہیں آتے تو میں آپ کے ساتھ چلا چلوں گا۔'' ہم اس مشروط وعدہ پر ہی خوش ہو گئے اور مقررہ تاریخ اور وقت پر مسجد پہنچ گئے اور دعا کرتے رہے کہ اللہ کرے وہ حضرات نہ آئیں۔ جب وہ وقت نکل گیا۔ اور وہ حضرات نہیں آئے تو ہم نے خوش ہو کر عرض کی ''مولانا! اب چلیں۔'' مولانا نے بڑی ملائمت سے فرمایا'' ابھی نہیں چلیں گے کسی آدمی سے اتنی باقاعدگی اور وقت کی اتنی پابندی کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔'' ہم خاموش ہو گئے اور ہماری بدقسمتی سے آدھ گھنٹے کی تاخیر سے وہ لوگ آ گئے۔ مولانا نے بڑے پیار سے ہم سے معذرت کی اور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

اب میں تھا اور میرے رفقا کے سوالات۔ طنزیہ جملوں اور تند لہجوں کا سہارنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تو مولانا کو مدعو کرنے پر ہی بصد مشکل آمادہ ہوئے تھے اور عالی شان ہوٹل کے بجائے ایک مسجد میں مقیم ان صاحب اور مرعوب کن انداز و اطوار کے بجائے ان کے متواضعانہ اور مخلصانہ سلوک اور ان کے شان دار لنچ سے بددل اور برہم تھے۔ انھیں مولانا کے ساتھ میری شرکت طعام پر بھی شرم محسوس ہو رہی تھی اور ان کے خیال میں میں نے کالج کی عزت بھی خاک میں ملا دی تھی وہ سابقہ داعیان کا انتظار کرنے پر بھی مبتلائے سوءظن تھے کہ مولانا کو ان سے ''نذرانہ'' ملنے کی امید ہو گی، ہم طلبہ سے انھیں کیا ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔

مختصر یہ کہ اس واقعہ کا ہر جز ان لوگوں کے لیے اجنبی اور انوکھا تھا اور اس کے برعکس مولانا کی عظمت کردار کا ایک اور نقش جمیل میری لوح قلب پر مرتسم ہو گیا تھا۔

ان میں بہت صلاحیتیں تھیں۔ وہ اپنے دور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی بی۔ اے (علیگ) تھے۔ اس سند سے وہ اعلیٰ مناصب حاصل کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انھیں کلکٹری پیش بھی کی گئی تھی۔ چاہتے تو وہ بآسانی اچھی خاصی خوش حال زندگی بسر کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی پوری زندگی عسرت و ناداری کی حالت میں گزار دی۔

وہ برسوں مرکزی اسمبلی کے رکن رہے۔ اور انھیں اس کا معقول الاؤنس ملتا تھا مگر پھر بھی ان کی اپنی حالت تبدیل نہیں ہوئی۔ وہ یہ رقم جمع کر کے ہر سال حج کے لیے جایا کرتے تھے۔ یہ

بھی کہیں پڑھا ہے یا کسی معتبر آدمی سے سنا ہے کہ اسی رکنیت کے دوران ان کو ایک ملازم بھی ملتا تھا۔ وہ خریداری کے لیے نکلتے تو ملازم ساتھ ہوتا اور لوٹتے ہوئے ایک تھیلا ان کے ہاتھ میں ہوتا اور ایک ملازم کے ہاتھ میں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انھیں طلبہ کے زبانی امتحان کے لیے بلایا گیا۔ وہ علی گڑھ پہنچے اور امتحان لیا مگر جب انھیں مصارف سفر اور نذرانہ پیش کیا گیا تو کسی صورت سے اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے گویا اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے نہ تو وہ وسائل اختیار کرتے نہ جائز مواقع سے جو کچھ حاصل ہو رہا تھا اس کو قبول کرتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں ناداری میں لطف آتا تھا اور روکھی سوکھی غذا میں انھیں لذت آتی تھی اور کم معاشی میں وہ خوش حال اور خوش دل رہتے تھے۔

معاملات میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک بار خلافت یا مسلم لیگ کے کسی کام کے سلسلے میں کوئی مختصر سا سفر درپیش تھا اس لیے دفتر سے چند آنے کرائے کے لیے حاصل کیے اور سفر سے واپسی پر ان چند آنوں میں سے جو چند پیسے بچ رہے تھے وہ واپس کیے۔

''اردوئے معلی'' کے ایک مضمون کے اصل مصنف کا نام بتانے کی بجائے خود اس کی ذمے داری قبول کی جس کے صلے میں ماہنامے کا ڈیکلریشن ضبط کر لیا گیا۔ انھوں نے یہ نقصان برداشت کر لیا مگر اپنے اصول سے انحراف کا کوئی ''شرعی حیلہ'' پیش نہیں کیا۔

بدیشی مال کے مقاطعے کا عہد کیا تو زندگی بھر اسے نباہتے رہے۔ ایک بار کہیں مہمان رہے تو وہاں اوڑھنے کے لیے انھیں بدیشی کمبل دیا گیا۔ انھوں نے موسم سرما کی پوری سرد رات ٹھٹھرتے ہوئے گزار دی مگر کمبل استعمال نہیں کیا۔

اپنی حالت پر توجہ دینے سے غافل رہتے تھے۔ نہایت معمولی اور ارزاں لباس استعمال کرتے تھے۔ ایک بار چشمے کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی، اس کے بجائے تاگا باندھتے تھے۔ ایک بار اجمیر آئے ہوئے تھے۔ وہاں کے ایک رئیس نے ایک تقریب میں انھیں شرکت طعام کی دعوت دی۔ داعی کو مولانا کی شرکت کی بڑی تمنا تھی مگر جب وقت پر مولانا تشریف نہیں لائے اور تلاش کیا گیا تو وہ ایک گلی کے ایک معمولی سے ہوٹل سے چند آنے کا کھانا کھا کر نکل رہے

تھے۔ امرا اور ارباب دنیا کے قرب سے احتراز، فقرا کا خاص ذوق ہے۔ یہ شاہان بے تاج ہمیشہ تاجوروں سے گریزاں ہی رہے ہیں۔

یہ صفات مولانا جیسے گدایان رہ نشین ہی سے مختص ہیں۔ بہت سے ''بزرگ'' اور ''صاحبان جبہ و دستار'' ان عیوب اور ان کم زوریوں سے پاک پائے گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے۔

وہ صحافی بھی تھے، سیاسی رہ نما بھی اور شاعر بھی مگر ان سے بڑھ کر وہ ایک سچے مسلمان تھے، ایک معیاری انسان تھے۔ ان کی عظمت کردار نے ان کو ایک بہت بڑا انسان بنا دیا تھا۔ زہد و اتقا، فقر و غنا، جرات و حق گوئی، جفاکشی، عالی ظرفی، تحمل شدائد، اپنے ظاہر کی طرف سے بے پروائی، باطن کی آراستگی پر ارتکاز توجہ۔۔۔ یہ ہیں ان کی کتاب حیات کے خاص خاص ابواب و مضامین۔۔ میں ان کو اہل اللہ اور فقرا میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی زندگی درویشوں کی زندگی تھی۔ جن اخیار و صلحا کے تذکرے ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں، مولانا شاید اسی گروہ میں سے تھے جو کسی ''تذکرۃ الاولیا'' کے اوراق سے نکل کر ہم ناشناسوں کی دنیا میں بھٹک کر آ گئے تھے۔

☆......☆......☆

مولانا محمد شریف مبارک پوری

مصطفیٰ آباد قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں قرن سیزدہم کے اواخر میں پیدا ہوئے۔
شرح ملا تک مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری سے پھر مولانا ہدایت اللہ خان رام پوری سے پھر مولانا محی الدین جعفری زینبی (الہ آباد) سے تحصیل علم کی پھر ٹونک پہنچ کر مولانا سید برکات احمد سے درس نظامی کی تکمیل کی، فراغت کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صدر المدرسین مقرر ہوئے پھر مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں (تقریباً بیس سال) پھر مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنو میں پھر دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر میں دس سال صدر المدرسین رہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں ملازمت ترک کر کے وطن میں اقامت اختیار کر لی، ۲ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ / ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو وصال فرمایا اور جھوائی ٹولہ لکھنو میں مدفون ہوئے۔

مولانا محمد شریف کو معقولات اور منقولات سے یکساں مناسبت تھی اور وہ عمر بھر بڑی شان اور بڑے ذوق وشوق سے درس دیتے رہے اور اپنے معاصر مدرسین میں تقریر درس کی تاثیر اور تفہیم کے لحاظ سے ممتاز رہے۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے وہ اہل اللہ میں سے تھے۔ سادگی، زہد، اخیار امت سے حسن عقیدت اور بھولپن ان کی کتاب حیات کے عنوانات جلی تھے، وہ مولانا شاہ بدر الدین پھلواروی سے آغاز عمر ہی میں بیعت ہو گئے تھے اور اوراد و اذکار اور نوافل کا اہتمام ہمیشہ سے ہی فرماتے تھے اور آخری دور حیات میں اس طرف زیادہ توجہ ہو گئی

تھی۔ شیوخ واساتذہ سے والہانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کے لیے دعاء خیر سے کبھی غافل نہیں رہے۔ عہد شباب میں متعدد علماء سے بعض علمی اور فنی مسائل پر ان کے مناظرے بھی رہے اور اس میں ہمیشہ ان کے حریف کو ہی ناکامی ہوئی لیکن بعد میں یہ مشاغل ترک کر دیے تھے اور ان واقعات کا جب بھی ذکر آتا تو مسکراتے اور فرماتے:

آگ تھے ابتداء عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

قدیم ماحول کے پروردہ ہونے کے باوجود جدت پسند بھی تھے۔ اپنی عربی فارسی اور اردو تحریروں میں جدید اسلوب اختیار کرتے اور تحریر کی زبان میں سادگی اور سلاست کا خیال رکھتے تھے، نہایت سادہ، رواں اور شگفتہ زبان لکھتے تھے، عربی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ مولانا برکات احمد کی کتاب الحجتہ البازغہ اور نبراس الحرکتہ پر منظوم تقریظیں لکھی تھیں، ایک بار ایک صاحب کی دعوت مبارزت کے جواب میں لکھا تھا کہ آپ فوراً جواب مانگتے ہیں جو عربی نثر میں نہیں انشاء اللہ عربی نظم میں جواب دوں گا اور فی البدیہہ دینے پر آمادہ ہوں۔ آپ مجلس کی تاریخ مقرر کر دیں۔ تقریر کی بجائے تحریر کا ملکہ اور ذوق تھا۔ وعظ و خطابت سے گریز کرتے اور ایسی فرمائش کے جواب میں فرماتے ہمارے خیر آبادی خاندان میں خطابت اور امامت کا رواج نہیں ہے۔ یہ میدان ہم نے دوسرے احباب کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ مولانا مقرر و خطیب نہیں تھے اہل قلم تھے ان کا رجحان ابتداء ہی سے تالیف و تصنیف کی طرف رہا۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کئی بار طبع ہوئیں۔ کئی کتابیں مختلف نظام ہائے امتحانات کے نصاب میں شامل رہیں مثلاً الہ آباد بورڈ وغیرہ میں۔

۱۹۱۶ء میں جب مولانا سید برکات احمد اور شمس العلماء مولانا عبدالوہاب بہاری مرحوم کے درمیان رام پور میں مناظرہ ہوا اور اس کے طرفین سے رسائل کی اشاعت کا سلسلہ چلا تو مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے سعید تلامذہ، مہر بلب یا غیر جانب دار رہے وہاں بعض تلامذہ نے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ ان حضرات میں مولانا محمد شریف کا نام نمایاں ہے، مولانا نے اس معرکے میں متعدد رسائل تالیف فرمائے۔

(۱) الرماح الخطیہ علیٰ الصحیفۃ الملکوتیہ

(۲) الاعلان

(۳) التقریر الکامل فی تنبیہ الغافل

(۴) حقیقت مناظرہ رام پور

خاکسار راقم سطور کو مولانا سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ میں نے درس نظامی کے آخری تین سال مولانا ہی کی خدمت میں گزارے اور میرا سلسلہ سند حدیث مولانا ہی کے واسطے حضور اکرمؐ تک پہنچتا ہے۔ اس تین سال کی مدت میں میرا قیام مولانا ہی کے ساتھ رہا اور میں نے ان کی سادگی، سادہ دلی، تقویٰ، زہد، حسن عقیدت، عظمت کردار، رقت قلب، قوت ایمان، خوف خدا، بے نیازی، حب رسول اور کیف و سرمستی کے جو مناظر دیکھے ہیں ان کی یاد میرا سرمایہ ہے۔

تصانیف وتالیفات:

۱: الافاضۃ القدسیہ فی الحکمۃ (عربی)

۲: نسیم الکلام فی تائید شریعۃ خیر الانام (عربی)

۳: جواہر الحکم فی توضیح السلم (عربی)

۴: التقریر الاسلم فی توضیح المسلم (فارسی)

۵: حاشیہ تفسیر بیضاوی

۶: احسن الانتخاب (شرح قطبی تصورات)

۷: ابہر الانتخاب (شرح قطبی تصدیقات)

۸: جامع الانتخاب

۹: کامل الانتخاب

۱۰: سوال وجواب نور الانوار

۱۱: سوال وجواب قطبی و میر

۱۲: حاشیہ سلم (تصورات)

۱۳: حاشیہ سلم (تصدیقات)

۱۴: رموز الحکمۃ (اردو)

مولانا سید سلیمان ندوی

مولانا کا نام تو ہوش سنبھالتے ہی سن لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی کتابوں سے استفادہ کے بھرپور مواقع ملتے رہے اور مولانا کے فضل و کمال اور تاریخ اسلام پر ان کی وسعت نظر کا نقش ذہن و دماغ پر مستحکم ہوتا چلا گیا۔ مگر ان کے اخلاق و کردار کا کوئی خوشگوار اثر، افسوس ہے کہ ان سے چند ملاقاتوں میں ذہن نے قبول نہیں کیا۔ وہ ایک مصنف کی حیثیت سے جس ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اخلاق و کردار میں انھیں اسی نسبت سے اس مقام پر نہیں پایا۔

مولانا سے پہلی ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی، میں کراچی میں جہانگیر روڈ پر ان کے مکان پر اپنے چھوٹے بھائی اختر میاں [1] کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ مگر مل کر دل خوش نہیں ہوا۔ ہم نے مولانا کے رویے میں ملاطفت اور بزرگانہ شفقت نہیں پائی اور ان کے یہاں سے نکل کر میں نے اختر میاں سے کہا ہم مولانا سے نہ ملے ہوتے تو اچھا تھا۔ میں فطرتاً کم آمیز اور کہیں آنے جانے اور ملنے جلنے میں بہت کوتاہ واقع ہوا ہوں۔ اس دن بھی اختر میاں ہی مجھے لے گئے تھے۔ وہ بھی لے جا کر پچھتائے اور میں بھی مایوس ہوا۔ ہم لوگ ان کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ بہار سے مشترک نسبت کے علاوہ ہمارے دادا سے وہ اپنی کئی تحریروں میں اپنی ارادت کا اظہار کر چکے تھے۔ ہمارے والد سے ان کے مراسم اور مراسلت رہتی تھی مگر ہماری نیازمندانہ بے غرض

---

[1] مرحوم سید اختر احمد برکاتی (وفات ۱۹۵۸ء)

حاضری کا مولانا نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مولانا نے ہم سے کوئی سوال نہ کیا اور اس سے پہلے ہم جن جن بزرگوں سے ملے تھے، مولانا کا رویہ ان سے بہت مختلف تھا۔ ہندوستان میں کتابوں کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا مولانا آزاد کی وزارت، مخطوطات کی بڑے پیمانے پر خریداری کر رہی ہے تو مولانا نے فرمایا ''ابوالکلام کتابوں کا کیا کریں گے۔ چائے بنا کر پئیں گے؟'' میں مولانا آزاد کے متعلق مولانا ندوی کے یہ خیالات سن کر متحیر رہ گیا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے آزاد کے متعلق مولانا ندوی کی جو تحریریں پڑھی تھیں اس سے اخلاص اور ایک قسم کی ارادت ظاہر ہوتی تھی اور یہ باتیں اس کے برعکس تھیں۔

ایک دن نصیر بھائی [1] کے یہاں مولانا کے ساتھ مفتی محمد شفیع بھی مدعو تھے، وہ رخصت ہوتے ہوئے فرمانے لگے۔ حضرت! مجھ میں تواضع بہت ہے۔ مولانا نے فرمایا تواضع ز گردن فرازاں نکوست اور مفتی صاحب کے جاتے ہی نصیر صاحب سے کہنے لگے۔ دوسرا مصرع کیا پڑھتا (دوسرا مصرع ہے گدا اگر تواضع کند خوئے اوست) مولانا کی سیرت کا یہ پہلو میرے لیے حیران کن تھا۔

ایک بار نصیر بھائی نے پوچھا حضرت! آپ تھانوی صاحب سے بیعت کیوں ہو گئے؟ مولانا نے فرمایا ''میں تو ان سے ملنے گیا تھا۔ انھوں نے بیعت بھی کر لیا، خلافت بھی دے دی اور ایک نظم بھی میری شان میں لکھ دی۔'' میں یہ سن کر حیران رہ گیا کیوں کہ وہ اس سے پہلے کئی بار مولانا تھانوی سے حسن عقیدت کا اظہار کر چکے تھے۔

مولانا والئی بھوپال کی دعوت پر اعظم گڑھ سے بھوپال منتقل ہوئے تھے، جہاں وہ قاضی شہر ہو گئے تھے۔ وہاں سے بھیم سین سچر کے خیر سگالی وفد کے رکن کی حیثیت سے ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے مگر وفد کے کئی روز کے بعد پاکستان پہنچے اور کسی مرحلے پر بھی وفد کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ وفد چلا گیا تو مولانا یہیں رہ گئے اور حکومت پاکستان کے مقرر کردہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے صدر نشین ہو گئے، جو پاکستان کے دستور کی تدوین میں مشورے دینے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ بورڈ کے ارکان میں ڈاکٹر حمید اللہ، مفتی محمد شفیع، مولانا راغب احسن وغیرہ

---

[1] مولانا حکیم نصیر الدین ندوی، نظامی دواخانہ، کراچی

شامل تھے۔اس کے سیکریڑی مولانا ظفر احمد انصاری تھے۔ بورڈ نے جو سفارشات پیش کی تھیں ان میں انصاری صاحب کی سعی و کاوش کا بہت دخل تھا۔ بعد میں بھی دستور میں اسلامی دفعات شامل کرنے میں بھی وہ مسلسل سرگرم رہے۔ بورڈ پر حکومت کی طرف سے مسلسل دباؤ تھا کہ سفارشات اس کی مرضی کے مطابق ہوں اور اس سلسلے میں لیاقت علی خاں نے جب مولانا سے یہ خواہش ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ ''میں تو کردوں مگر انصاری نہیں کرنے دیتا۔''



مجاز

۴۴ء میں جب میں طبیہ کالج دہلی میں داخل ہوا تو درس گاہ سے فارغ ہوتے ہی میرا زیادہ وقت دہلی کی مختلف لائبریریوں میں گزرتا تھا۔ قرول باغ میں مکتبہ جامعہ اور صدر میں ہارڈنگ لائبریری وغیرہ میں رسائل کا مطالعہ کرتا تھا اور اہتمام اور کثرت سے کرتا تھا۔ ہارڈنگ لائبریری کے لائبریرین اس زمانے میں مجاز صاحب تھے۔ وہ ہال کے وسط میں ایک اونچی سی کرسی پر بیٹھے ہوتے تھے۔ اور مشاعرے میں پڑھتے وقت جتنے اچھے لگتے تھے، اتنے ہی برے اس وقت لگتے تھے جب وہ میز پر ایک لکڑی کا ہتھوڑا بجا کر وقت ختم ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ ان سے کبھی بات نہیں ہوئی تھی مگر ایک بار جب اختر صاحب کے ساتھ ان سے ایک تفصیلی ملاقات ہوئی اور تعارف ہوا تو میں ان سے کام لینے لگا اور کام بس یہ تھا کہ لائبریری کی کوئی کتاب نکلوا کر ان سے کہتا کہ اسے اپنے نام سے جاری کروا دیجئے۔ پہلی بار جب ان سے کہا تو انھوں نے چند لمحے سوچا پھر جاری کروا دی۔ ایک بار ایک ضخیم کتاب میں نے جاری کروائی اور دوسرے دن شام کو واپس کرنے لگا تو کہنے لگے کہ کل شام کو لے گئے تھے۔ میں نے کہا جی ہاں کل شام سے آج صبح تک پڑھ لی۔ سن کر چپ ہو گئے، مگر شاید یقین نہیں آیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں رات بھر پڑھتا رہا اور صبح ختم کر کے اُٹھا تھا۔

ایک بار اختر صاحب دلی آئے ہوئے تھے اور مجاز صاحب سے ملتے رہتے تھے۔

ہمارے امتحانات قریب تھے۔ میں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں رات کو اپنے ایک دوست کے پاس ہوسٹل سے شہر آجاتا تھا۔ ایک دن مغرب کے بعد چاندنی چوک میں اختر صاحب اور مجاز مل گئے۔ دونون عالم سرخوشی میں تھے اور سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ اختر صاحب نے مجاز صاحب سے میرا تعارف کروایا اور پھر میری ہی درخواست پر ہم لوگ ایک نزدیک پارک غالبا کمپنی باغ میں جاکر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے ادبی مطالعے کے اظہار کے لیے مجاز صاحب کے چند شعر اور کسی نظم کے ایک دو بند سنائے تو مجاز صاحب ترنگ میں آگئے اور اپنی کئی نظمیں سناڈالیں۔ اختر صاحب داد کے بجائے شاید ہنس دیے اور مجاز صاحب مسکرادیے۔ میں نے مجاز کی نظم خواب سحر کی تعریف کی تو اختر صاحب نے شاید وہ سنی نہیں تھی یا ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ اس لیے سنانے کی فرمائش کی مگر مجاز صاحب جانے کیوں ٹال گئے۔ میرا یہ وہ دور تھا کہ ادب خصوصا شعراء ادب کے دواوین کے مطالعے کا جنون سا تھا۔ ان دنوں شاید ہی کسی نئے یا پرانے شاعر کا مجموعہ کلام چھپا ہو اور میں نے نہ خریدا ہو، نہ پڑھا ہو۔ نوعمری کا اُتھلا پن بھی تھا۔ کہ جو کچھ پڑھا ہے اس کا اظہار بھی ہو چنانچہ فانی، سیماب، جوش، جگر، حسرت، فراق، آرزو، اثر، حفیظ پھر میراجی، فیض، راشد، جان نثار اختر، ساحر، جذبی، ماہر القادری، احسان دانش اور نہ جانے کتنے شاعروں کے نام لیتا گیا اور یہ بھی بتاتا گیا کہ ان کے مجموعے میرے پاس ہیں اور ان پر اپنی ''رائے گرامی'' بھی دیتا گیا اور یہ دونوں بزرگانہ تحمل کے ساتھ خاموشی سے سنتے رہے۔ مثلا میں نے کہا جن جن شعراء نے پہلے غزل گوئی کی ہے وہ نظم گوئی میں بھی کامیاب ہیں۔ دیکھیے جان نثار اختر نے غزل کے آغوش میں پرورش پائی اور ابتداً غزلیں کثرت سے کہی تھیں۔ اس لیے وہ نظم میں ایسے شعر بھی کہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نظم کا نام یاد نہیں رہا۔ اس کا پہلا شعر ہے۔

جس طرح اندھیرے میں ابھرتے ہیں بتدریج
ڈھلتی ہوئی تصویر کے برعکس نشانات

اس جیسے مضمون اور ایک طویل بات کو ایک شعر میں نظم کر دینے کی قدرت غزل گوئی کی مشق کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس پر دونوں حضرات خاموش رہے۔ اور مجاز نے اپنی نظم ''اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو'' لہک لہک کر سنانی شروع کر دی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی

ابن حافظ سید ابوالخیر بن مولانا محمد احسن [1] گیلانی بن سید شجاعت علی حسینی واسطی، ولادت ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی پھر چودہ سال کی عمر میں ۱۳۲۴ھ/ ۷۔۱۹۰۶ء میں ٹونک پہنچ کر برکاتی درس گاہ سے استفادہ شروع کیا اور سات آٹھ سال تک وہاں رہ کر درس نظامی کا بڑا حصہ ختم کیا۔ وہاں سے ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء میں دیو بند گئے اور علم حدیث کی تحصیل کر کے ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء میں فراغت حاصل کی اور وہیں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے ساتھ دارالعلوم کے علمی جریدوں القاسم اور الرشید کی ادارت بھی قبول کی۔ چند سال کے بعد ۱۳۳۸/ ۱۹۲۰ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں دینیات کے معلم کی حیثیت

---

[1] مولانا احسن گیلانی اپنے دور کے نامور مدرس اور مصنف تھے، وہ ۱۲۱۲ھ / ۸۔۱۷۹۷ء میں مانے (شیخوپور، ضلع مونگیر) میں پیدا ہوئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی واجد علی بناری، مولوی نعمت اللہ فرنگی محل، مولانا عالم علی نگینوی وغیرہ سے عقلی و دینی علوم کی تحصیل کی۔ عمر بھر اپنے گھر پر ہی درس دیتے رہے جس میں دور دور سے طالبان علوم آ کر شریک ہوتے تھے۔ رسالہ وجود رابطی، حاشیہ بر شرح سلم بحر العلوم، حل العقود اور حاشیہ مقالہ اولیٰ اقلیدس طوسی ان کی تالیفات ہیں، اقلیدس پہلی بار انھی کے تحشیہ اور تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ مولانا کی شادی میر امام بخش ساکن گیلانی کی دختر سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد انھوں نے مانے کو چھوڑ کر گیلانی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں مدفون ہوئے۔ گیلانی کا اصل نام محی الدین پور گیلان ہے۔ مولانا محمد احسن کے دو صاحبزادے تھے۔ مولانا حکیم سید ابونصر جن کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسرے حافظ سیّد ابوالخیر جن کے تین صاحبزادے تھے۔ مولانا سید مناظر احسن سید مکارم احسن، ڈاکٹر سید مظہر احسن، (صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ دکن و مصنف اسلام کے معاشی نظریے) مولانا محمد احسن کی وفات ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں ہوئی۔

سے تقرر ہو گیا۔ بعد میں شعبہ دینیات کے صدر ہو گئے اور پچیس سال بعد ۱۹۴۹ء میں وظیفہ یاب ہو کر وطن واپس لوٹ گئے۔

ٹونک میں مولانا کا قیام ۸/۷ برس رہا۔ اس عرصے میں وہ تعلیم کے ساتھ نچلی جماعتوں کی تدریس بھی کرتے رہے۔ تعلیم کے دور میں ہی مولانا قومی وملی مسائل سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ جنگ بلقان کے زمانے میں وہ مساجد میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ جن میں مسلمان بڑے ذوق شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں اہلحدیث حضرات مولانا محمد سورتی (عربی ادب کے مشہور فاضل) کو لاتے اور ان سے تقریریں کرواتے تھے مگر ان کی تقاریر بے اثر رہتیں۔ مولانا گیلانی کی تقریروں سے چندہ خوب ملتا تھا۔ جامع مسجد میں ایسی ایک تقریر کا ذکر مولانا نے اپنے ایک مضمون میں بھی کیا ہے ("میری محسن کتابیں")۔ شعر گوئی کا شوق بھی ان دنوں شباب پر تھا اور مولانا باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں مولانا کی ایک غزل کا ایک شعر ان کے اس دور کے ایک رفیق (مولوی محمد شریف سیف ٹونکی) نے سنایا تھا۔

چھوڑ سکتا ہے بھلا تجھ کو مری جاں کوئی
چاہنے سے کبھی ہوتا ہے پشیماں کوئی

وہ اپنے اشعار پر جانشین داغ صاحب زادہ احمد سعید خان عاشق ٹونکی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ریاست کے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر مولانا اجمیر پہنچ گئے اور "شکوہ خواجہ" کے نام سے ایک طویل اور پر جوش "باغیانہ" نظم کہی اور اجمیر کے ایک سیاسی جلسے میں سنائی تھی، جس سے عوام میں بڑا جوش وخروش پیدا ہو گیا تھا اور یہ نظم کئی بار چھپ کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوئی تھی۔ مولانا کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے اور مولانا روپوش ہو کر واپس ٹونک پہنچ گئے۔ اس نظم کا ایک شعر یہ تھا۔

اٹھ مرے خواجہ! پھر اجمیر کے کہساروں سے
لے عوض خوں کا ان عیاروں سے غداروں سے

ایک اور شعر

حیف باشد کہ درین وقت نہ خیزی آقا !

لختے بر حالت ما لطف و ترحم فرما

مولانا کی شعر گوئی کا سلسلہ آخر تک جاری رہا، مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر انھوں جو نظم کہی تھی اس کا مصرع ہے:

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی

اسی طرح مولانا محمد سجاد بہاری کی وفات پر بھی انھوں نے ایک نظم کہی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر بھی اپنے جذبات کا اظہار ایک طویل نظم میں کیا تھا۔ مگر زیادہ تر نعتیہ اشعار کبھی کبھار کہتے رہے۔

''عرض احسن'' کے نام سے ان کی نعت کا یہ بند بڑا مقبول ہوا تھا:

ہر ایک سے ٹکرا کر، ہر شغل سے گھبرا کر، ہر فعل سے شرما کر، ہر کام سے پچھتا کر،

آمد بدرت بنگر، اے خاتم پیغمبر

اس طرح حج و زیارت کے موقع پر ان کی بہاری زبان میں یہ نعت بھی بارگاہ رسالت میں مقبول ہوئی:

تم سے توڑوں، کس سے جوڑوں؟

تمری گلی کی دھول بٹوروں

پیارے محمد جگ کے ساجن

تمری گلی میں دم بھی توڑوں

مولانا کا وصال ۵ جون ۱۹۵۶ء کو ہوا۔

وصال کا واقعہ بڑا ایمان افروز ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی مرحوم سید مکارم احسن نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے ایک خط میں اس کی تفصیل لکھی ہے:

'' قلب پر حملہ متواتر تین سال سے ہوتا رہا اور اکثر اتنا شدید حملہ ہوا کہ ہم لوگ تو یہی سمجھے کہ بس اب وقت آ گیا مگر ہر بار سکون ہو جاتا، ہفتہ دو ہفتہ قائم رہتا کہ پھر وہی حال ہو جاتا۔ مرض قلب کا ہر ممکن ڈاکٹری علاج موجودہ زمانے کے مطابق ہوتا رہا چنانچہ رمضان

المبارک میں دو شدید حملے ہوئے۔ شوال میں سکون ہی سکون ایک حد تک رہا یہاں تک کہ ۴ جون (۲۴ شوال) کو کچھ عجیب علامات نمودار ہوئیں۔ دن میں بکثرت اشعار فنا کا مضمون لیے ہوئے وجد کے ساتھ پڑھتے اور گنگناتے رہے مثلاً ''فانی بدایوانی کا یہ شعر:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

اور ہر چھوٹے بڑے سے' گھر کے لڑکوں سے خوش کلامی کرتے رہے بلکہ کمرے کے اندر اور کچھ باہر چہل قدمی بھی کر لی۔ رات آئی تو بڑی خوشی خرمی اور شعر و غزل کی تکرار، یقین کیجیے کہ بھائی صاحب کو اتنا مسرور میں نے برسوں نہیں دیکھا تھا اور یہ دیکھ کر میں خود اور گھر کے سب لوگ مسرور تھے، گیارہ بجے سو گئے، میں بھی قریب ہی لیٹ گیا۔ نماز فجر کے وقت ہم دونوں جاگے۔ میں حسب معمول مسجد چلا گیا اور انھوں نے کمرے ہی میں نماز ادا کر لی۔ عام دستوران کا فجر کے بعد بھی کچھ سوتے رہنے کا تھا۔ میں نے تکیہ وغیرہ درست کیا اور وہ سو گئے۔ ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میرے منجھلے لڑکے نے محسوس کیا کہ سانس تیز چل رہی ہے۔ چند منٹ میں معتدل ہو گئی لیکن دو ہی ایک منٹ بعد بالکل بند ہو گئی۔ اس کو شک ہوا، اٹھ کر متوجہ کیا، کیا دیکھتا ہوں کہ روح پرواز کر چکی ہے آنکھیں بند ہیں اور لب پر مسکراہٹ ہے۔ چند منٹ کے اندر خبر جوار بھر میں پھیل گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مسلمان جوق در جوق آنے لگے۔ بہار شریف سے متعدد علماء بس پر آ گئے اور انھوں نے غسل و تجہیز و تکفین کا نظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ بعد نماز ظہر جنازہ پڑھا گیا۔ نماز میں اس قدر ہجوم تھا کہ ایک بہت بڑے میدان کو تلاش کرنا پڑا۔ گیلانی کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔

ایک بات جو عام طور پر کہنے کے لائق نہیں آپ کو لکھے دیتا ہوں۔ آپ کے یہ محبوب دوست تین سال سے مرض اور پرہیز کی سختیاں جھیل کر اب صرف چرم و استخواں ہو کر رہ گئے تھے لیکن روح کے پرواز کرتے ہی چہرہ نوجوانوں جیسا ہو گیا تھا، فربہ، خوش رنگ، سرخ، ڈاڑھی کے بال سیاہ ہو گئے۔ غسل کے وقت جسم پر گوشت تھا اور سینہ چوڑا پہلوانوں جیسا ہو گیا تھا۔ علماء نے یہ منظر دیکھا اور سب حیرت زدہ تھے۔ خاندانی قبرستان میں جو گھر کے قریب ہی ہے مولانا

ہی کے لگائے ہوئے باغ انبہ کے وسط میں جو آج کل پھولوں سے لدا ہوا ہے جگہ ملی۔ عجیب سماں پیدا تھا۔" (المنبر، لائل پور، ۶ جولائی ۱۹۵۶ء بحوالہ صدق جدید، لکھنو)

مولانا کی تالیفات وتصانیف:

الدین القیم، النبی الخاتم، الغفاری، اسلامی معاشیات، مقالات احسانی، تدوین حدیث، تدوین فقہ، نظام تعلیم و تربیت، امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ہزار سال پہلے، سوانح قاسمی، کائنات روحانی، قرآن عربی، مکاتیب گیلانی، الاسفار الاربعہ (ترجمہ اردو، جلد اول، دو حصوں میں) الشیخ الاکبر (عربی میں)

☆......☆......☆

مولانا عبدالرحمٰن چشتی

باادب، باملاحظہ، ہوشیار، چوب دار نے بلند آواز سے انتباہ کیا۔

''نہیں بھئی، اس وقت نہیں'' نواب سعادت علی خان نے اسے روک دیا اور محفل جاری رہی۔ قصہ یہ ہے کہ ریاست ٹونک میں مسلمانوں کے معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) کے تصفیے کے لیے ایک عدالت شرعیہ قائم تھی۔ وہ مقدمات کی باقاعدہ سماعت کر کے فیصلے دیا کرتی تھی جو نافذ ہوتے تھے۔ اس عدالت شرعیہ کے ایک ناظم تھے جن کے ساتھ ججوں کے طور پر متعدد مفتیان کرام ہوتے۔ اس سے بالاتر ایک عدالت عالیہ تھی جو دو مفتیوں اور والئی ریاست پر مشتمل ہوتی تھی اور عدالت شرعیہ کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتی تھی۔

کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی اہم پیچیدہ اور زیادہ مختلف فیہ مقدمے کی اپیل سننے کے لیے عدالت عالیہ کے دو مستقل و مامور مفتیوں کے ساتھ شہر کے دوسرے معتبر و معتمد علماء کو بھی مدعو کر لیا جاتا۔ یہ ہنگامی مجلس علماء اس مسئلے اور مقدمے پر مذاکرہ کرتی اور بے تکلفانہ اور آزادانہ اظہار رائے کیا جاتا۔ گفتگو میں خود نواب صاحب برابر کا حصہ لیتے۔ وہ خود حافظ قرآن اور باقاعدہ فارغ التحصیل عالم تھے۔ قوی الحفظ ہونے کی بنا پر کتابوں کی عبارتیں اُنہیں ازبر تھیں اور وہ موقع بموقع ان کے حوالے دیا کرتے۔ اسی قسم کی ایک ہنگامی مجلس علماء ایک بار (تقریباً) ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی۔ شہر کے دوسرے اکابر علماء کے ساتھ مدرسہ خلیلیہ برکاتیہ کے صدر مدرس مولانا

عبدالرحمٰن چشتی بھی اس میں شریک تھے، شریک کیا تھے شریک کیے گئے تھے۔ نواب صاحب نے چچا (حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی) کے ذریعے مولوی صاحب کو دعوت دی تھی، کیونکہ چچا مدرسے کے مہتمم تھے۔ چچا نے جب مولوی صاحب سے نواب صاحب کی اس دعوت میں شرکت کا ذکر کیا تو انھوں نے شان بے نیازی سے فرمایا:

''میں کہاں نوابوں کے دربار میں جاتا پھروں گا۔'' مولوی صاحب کا یہ انکار متوقع تھا۔ اس سے چچا نے جو ان کے مزاج شناس تھے اور شاگرد بھی، تیر آزمایا:

''اپنے مدرسے کی نمائندگی شایانِ شان ہوتی تو اچھا تھا۔''

اپنے مدرسے کی بات نے رنگ دکھایا اور برف پگھل گئی۔ چچا نے ان کا شکر یہ ادا کیا کہ مولوی صاحب کی 'بابِ امیر' پر حاضری سے کراہت میں جواز کا پہلو نکل آیا اور وہ مدرسے کی خاطر ٹس سے مس ہو گئے۔

مولوی صاحب دعوت قبول کر کے مقررہ دن مجلس میں پہنچ بھی گئے۔ نواب صاحب کے پاس ہی نشست تھی۔ مولوی صاحب سے وہاں ایک تو یہ آداب شکنی ہوئی کہ حسب عادت وہاں بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ دوسری کوتاہی، ان سے یہ سرزد ہوئی کہ چونکہ پان میں تمباکو کھاتے تھے اور بار بار پیک تھوکنا پڑتی تھی، اس لیے وہاں نواب صاحب کے سامنے سے اُگال دان اٹھا کر اُس میں پیک تھوک دی۔ آدابِ شاہی کے خلاف یہ عمل دیکھ کر چوبدار نے انتباہ کر کے اپنا فرض منصبی ادا کیا تھا اور خود نواب صاحب نے چوبدار کو روک دیا تھا۔

مولوی صاحب کو قہقہہ مارنے کا خاص ذوق تھا۔ مہمل اور غلط بات پر پہلے قہقہہ مارتے اور پھر قائل سے نمٹتے۔ اس مجلس میں بھی مولوی صاحب نے نواب صاحب کی کسی بات پر قہقہہ مار دیا، نواب صاحب کی کسی بات پر اور قہقہہ! چوبدار نے پھر اپنا فرض ادا کیا:

''باادب باملاحظہ ہوشیار!''

مگر نواب کو خدا غریق رحمت کرے، انھوں نے اب کی بار چوبدار کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا:

''یہاں سے نکل جا، یہ دربار نہیں، یہ علماء کرام کی محفل ہے۔''

مولوی صاحب صورتِ حال کی نزاکت سے یک سر بے خبر، نواب کے اُگال دان میں

پھر پیک تھوک کر سرگرمِ گفتگو ہو گئے، اُنہیں کچھ پتہ نہیں کہ انھوں نے شاہی محل میں قہقہہ سر کیا تھا اور نواب کی بات پر کیا تھا۔ یہ تھے مولوی عبدالرحمان چشتی، معقولات میں تبحر، منقولات میں فرد، اپنے دور کے ایک باکمال اور بے مثال مدرس، تقریباً پینتالیس برس مسلسل پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ ایک مدرسے کی چار دیواری میں بوریے پر بیٹھ کر برعظیم کے گوشے گوشے اور بخارا، تاشقند، سمرقند، غزنی اور کابل سے آنے والے طالبانِ علوم دین کو درس دیتے رہے، بڑی خاموشی کے ساتھ عالم گری اور مدرس سازی کرتے رہے اور جب ستر سال تک کام کر کے تھک گئے تو خاموشی سے گوشۂ مرقد میں جا سوئے۔

نہ ان کی زندگی میں ان کی کوئی خبر کسی اخبار میں چھپی، نہ ان کا سفر زندگی طے ہو جانے کی خبر کو کسی اخبار میں جگہ ملی۔ نہ کسی نے ان کا انٹرویو لیا، نہ کبھی ان کے ساتھ کوئی شام منائی گئی۔ نہ کبھی ان کا یوم منایا گیا، نہ کوئی تعزیتی شذرہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، خاموش زندگی گزاری، خاموشی ہی کے ساتھ محفل زندگی سے اُٹھ کر چل دیے۔

مختصر سوانح یہ ہیں کہ بیدر (دکن) کے ایک گُم نام اور بے علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ (تقریباً ۱۸۸۵ء) حصول علم کی توفیق ارزانی ہوئی تھی، اس لیے کچھ منزلیں تو بیدر ہی میں طے کیں اور پھر بلدہ (حیدر آباد دکن) پہنچ گئے اور ایک دینی مدرسے میں داخل ہو کر درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگے۔ ایک آدھ سال ہی ہوا تھا کہ کسی طرح ان کے کانوں تک ٹونک کی درسگاہ کا آوازہ پہنچا اور وہ ٹونک جا پہنچے۔ (۱۹۰۰ء) اور ابا میاں (جدامجد مولانا حکیم برکات احمد) کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔

حصول علم سے فراغت کے بعد وہ مدرسہ فتح پوری (دہلی) میں صدر مدرس ہو گئے۔ چند سال کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تدریس کی اور پھر وہاں سے رنگون کے ایک دینی مدرسے میں صدر مدرس ہو کر گئے، جہاں انھیں پانچ سو روپے ماہانہ معاوضہ ملتا تھا۔ تقریباً پچیس سال کے عرصے میں جب کہ وہ دہلی، کلکتے اور رنگون میں مُدرس رہے، ان کا مرکز و مستقر ٹونک ہی رہا، تعطیلات میں وہ یہیں آ کر رہتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں ابا میاں کے وصال کے خبر سن کر تعزیت کے لیے وہ ٹونک آئے تو باوا جان

(مولانا حکیم سید محمد احمد) نے انھیں ٹونک ہی میں روک لیا کہ "ابا چلے گئے۔ اب تم کہیں نہ جاؤ، یہیں سب مل کر مدرسہ چلائیں گے۔" چنانچہ وہ مدرسہ رنگون سے مستعفی ہو گئے اور مدرسہ خلیلیہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ نہ یہ پوچھا کہ منصب کیا ہوگا؟ مدرس یا صدر مدرس؟ وہاں تو میں صدر مدرس تھا۔ نہ یہ پوچھا کہ مجھے رنگون میں پانچ سو ماہانہ ملتے تھے، یہاں کیا ملے گا؟ بس استاد زادے کا حکم تھا، استاد مرحوم کے مدرسے کی خدمت مقصود تھی، اس لیے بے تردد اور بے توقف بیٹھ گئے اور پڑھانا شروع کر دیا۔ مدرسے نے انھیں چالیس روپے ماہانہ پیش کیے جو بخوشی قبول کر لیے اور آپ یقین نہیں کریں گے، یہی چالیس روپے انھیں تقریباً بیس برس تک ملتے رہے۔

برکات منزل (ہمارے مکان) کے وسیع مردانے حصے میں ایک بالا خانہ تھا اس پر قیام تھا اور دونوں وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھاتے، گویا ہمارے ہی خاندان کے ایک فرد تھے۔ باوا جان انھیں مولوی چشتی چچا کہتے تھے اور ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے چچا ہیں۔ یہ تو بہت بعد کو معلوم ہوا کہ ان سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں، تلمذ کا رشتہ ہے مگر یہ رشتہ اتنا مستحکم تھا کہ باوا جان اس دنیا میں نہیں رہے، دادی اماں اللہ کو پیاری ہو گئیں مگر وہ ہمارے یہاں ہی رہے اور ۱۹۵۲ء میں جب ہم پاکستان کے لیے ہجرت پر آمادہ ہوئے تو وہ اس سفر میں بھی ہمارا ساتھ دینے کے لیے پر تولنے لگے مگر انحطاط قویٰ کی وجہ سے اس سفر کی ہمت نہ کر سکے۔ یوں تقریباً باون برس میں ہمارے خاندان کا اور ان کا ساتھ چھوٹا مگر ٹونک پھر بھی ان سے نہیں چھوٹا۔ وہ ہمارے بعد بھی ٹونک ہی میں رہے۔ اپنے حکیم صاحب قبلہ کے ٹونک کو چھوڑ کر وہ اور کہاں جاتے۔ اور ۱۹۵۶ء میں بیدر کا یہ مولود ٹونک کی خاک میں مدفون ہوا۔

۱۹۰۰ء کے لگ بھگ وہ ٹونک آئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے تقریباً چالیس برس بیدر کا رخ نہیں کیا، نہ مراسلت کا رابطہ رکھا۔ گھر والوں کے لیے وہ مفقود الخبر رہے، گھر کے بڑے تو ان کی راہ تکتے تکتے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ باقی اعزہ مایوس ہو کر رہ گئے مگر ان کی ایک چھوٹی بہن تھیں، ان کی محبت نے ہمت نہیں ہاری تھی اور وہ اپنے بھائی کی تلاش سے کبھی غافل نہیں رہیں، چنانچہ بالآخر ان کو اپنے یوسف گم گشتہ کا پتہ چل ہی گیا۔ ہوا یہ کہ مولوی

صاحب حیدرآباد میں تعلیم کے دوران میں حضرت امجد حیدرآبادی (شاعر بزرگ رباعی گو) کے رفیق درس رہے تھے اور ان سے مراسلت کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ بہن کو اس کا سراغ مل گیا تو وہ امجد صاحب کے پاس پہنچیں اور ان سے مولوی صاحب کا ٹونک کا پتہ حاصل کر کے اپنے لڑکے کو ٹونک بھیجا اور گھر آنے کی التجا کی اور کہلوایا کہ اور تو سب تمھارا رستہ تکتے تکتے چل بسے، میں باقی رہ گئی ہوں خدا کے لیے آ کر مل لو۔ مولوی صاحب نے دادی اماں سے بہن کو ملنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے بخوشی اجازت دی اور مولوی صاحب بیدر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم سب کا تاثر یہی تھا کی اب مولوی صاحب بیدر اور زیادہ سے زیادہ بلدے میں ہی رہیں گے، ٹونک واپس نہیں آئیں گے مگر وہ تو مہینے ڈیڑھ مہینے رہ کر لوٹ آئے کہ غیر علمی ماحول ہے، اس لیے دل نہیں لگا اور پھر ادھر کا رخ نہیں کیا، حالانکہ کئی بار کئی کئی ماہ حیدرآباد جا کر مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے یہاں مقیم رہتے تھے مگر نہ بیدر جاتے نہ بیدر والوں کو اپنے قیام کی اطلاع دیتے۔

مولوی صاحب فنا فی العلم تھے۔ ان کا شعار بھی علم تھا اور وثار بھی علم، انھیں پڑھنے کا شوق تھا، پڑھنے والوں سے محبت تھی، کتابوں سے محبت تھی۔ ان کا سامان آرائش کتابیں تھیں، سرمایہ کتابیں تھیں، عمر بھر مجرد رہے، اگر کوئی پوچھتا کہ مولوی صاحب آپ نے شادی نہیں کی تو مسکرا کر فرماتے: ''کی ہے'' اور کتابوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے: ''ان سے کی ہے'' ایک وسیع کمرے میں ان کا کتب خانہ تھا، چاروں طرف بڑی خوبصورت الماریاں نصب تھیں جن میں کئی ہزار کتابیں نہایت سلیقے سے سجی ہوئی تھیں، کتابوں کی جلدیں بڑے اہتمام اور گراں قیمت پر بنواتے تھے۔

بعض کتابوں کی جلدیں کلکتے سے بنوا کر منگوائی تھیں۔ بہت سی کتابوں کی جلدیں مقامی جلد سازوں سے عام نرخ سے زیادہ ادا کر بنواتے تھے، کتاب بڑی احتیاط سے پڑھتے اور بے احتیاطی سے پڑھنے والے پر بہت برہم ہوتے۔ کتابوں سے استفادے کی عام اجازت تھی بلکہ خوش ہوتے مگر شرط یہی تھی کہ یہیں بیٹھ کر پڑھو۔

ایک بار مولانا منتخب الحق نے ایک کتاب مطالعے کے لیے عاریتاً طلب کی تو فرمایا: ''جی

نہیں، کتاب کے قدر شناس کو میں کبھی کتاب لے جانے نہیں دیتا، کیونکہ وہ پھر واپس نہیں کرتا۔ تمھارے استاد معین الدین میری فلاں کتاب لے گئے تھے پھر آج تک نہیں لوٹائی۔ یہیں بیٹھ کر دیکھو۔"

کوئی سوال کرتا تو پہلے جواب دیتے پھر الماری میں سے کتاب نکال کر حوالہ سناتے۔ کوئی ان کے کتب خانے کی کسی کتاب کے مطالعے کے لیے جاتا تو بڑے خوش ہوتے، اُسے کتاب نکال کر دیتے اور کہتے "یہاں بیٹھ کر پڑھو۔" ایک شرط یہ بھی تھی کہ خاموشی سے مطالعہ کروتا کہ خود ان کے مطالعے میں خلل نہ پڑے۔ پھر آنے والے کو نفیس چائے بھی پلاتے۔

مولانا سید طلحہ حسنی مرحوم سے خصوصی مراسم تھے۔ وہ جب تک ٹونک میں رہے، مولانا صاحب کے کتب خانے سے استفادہ کرتے رہتے مگر ان کی کمزوری یہ تھی کہ کتاب نکلوا کر بولنا بھی شروع کر دیتے جو مولانا صاحب کو ناگوار گزرتا، کیونکہ ان کے مطالعے میں خلل پڑتا تھا۔ مثلاً مولانا طلحہ کتاب ہاتھ میں لے کر پوچھتے: "مولانا! مصنف کی فلاں مسئلے میں کیا رائے ہے؟" مولانا صاحب جواب دیتے: "پڑھ کر دیکھو۔" طلحہ میاں ہنسنے لگتے اور پڑھنے بیٹھ جاتے، پھر چائے چلتی اور گفتگو شروع ہو جاتی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کتاب سامنے رکھ کر باتیں کرنا کتاب کی تخفیف شان اور اہانت ہے، کتاب بند کر کے باتیں کرو تو حرج نہیں۔

چونکہ مجرد تھے، اس لیے آخر میں یہ فکر ہو گئی تھی کہ میرے بعد کتابوں کا کیا ہوگا؟ چاہتے تھے کسی ایسے ادارے کو دے جاؤں جہاں وہ کام میں آتی رہیں۔ مختلف ادارے ان کی نظر میں تھے مگر بالآخر انھوں نے فیصلہ جماعت اسلامی کو اپنا کتب خانہ وقف کر دینے کا کیا اور اس مقصد کے لیے جماعت کے ایک رکن رکین کے ساتھ وہ رام پور بھی گئے جہاں اس دور میں جماعت اسلامی ہند کا مرکز تھا اور چند روز مرکز میں رہ کر وہاں کے ماحول کا جائزہ لیا اور بہت متاثر ہوئے، خصوصاً مولانا ابواللیث اصلاحی کے ورع وتقویٰ اور سادہ مزاجی سے بہت متاثر تھے اور مرکز کے دینی ماحول کا بھی ان پر تاثر بہت گہرا ہوا۔ ویسے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے وہ حیدر آباد دکن سے واقف اور ان کے علم وفضل کے مداح تھے اور جب مولانا ۱۹۴۷ء کے سالانہ اجتماع جماعت پر ٹونک آئے تھے تو روزانہ صبح سے شام تک مولوی صاحب، مودودی صاحب

کے پاس بیٹھے گفتگو کرتے رہتے۔ بہر حال انھوں نے سفرِ رام پور کے بعد اپنا کتب خانہ جماعت کو دینے کا فیصلہ کرلیا اور مجھے بلا کر فرمایا:

''محمود میاں: اب کتب خانہ رام پور پہنچانا ہے مگر کتابیں صرف تم پیک کرو۔''

میں نے تعمیل حکم کے لیے جیسے ہی ایک الماری سے کتابیں نکالنا شروع کیں مولانا صاحب یک لخت نڈھال، اور ملول ہوگئے اور کچھ دیر بعد زارو قطار روتے ہوئے کہنے لگے:

''ارے کتابوں کے بغیر میری زندگی کیسے گزرے گی؟ کتابیں نہیں ہوں گی تو میں کیا کروں گا؟ میں تو کتابوں کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔''

مولوی صاحب کے اس غم واندوہ کو دیکھ کر میں تو لرز گیا۔ انھیں روتے ہوئے یا تو دادی اماں کے انتقال پر دیکھا تھا یا آج دیکھ رہا تھا، اس لیے میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں نیچے آ گیا۔ کچھ دیر بعد نیچے تشریف لائے اور فرمایا: ''محمود میاں! بھئی کتابوں کو بند کرو اور میری طرف سے آنکھیں بند کرلو، میں تو ان کی روانگی تک اسی طرح چیختا رہوں گا۔ ان کی جدائی مجھ سے آسانی سے برداشت نہیں ہو سکے گی، کتابیں ہی اہل وعیال ہیں، یہی میرا خاندان ہے، یہی میرا اثاث البیت ہے، یہی میری رفیق تنہائی ہیں، تم میری پروامت کرو اور انھیں بند کرنا شروع کرو۔''

مگر میں نے اس کو ملتوی کر کے مولانا ابواللیث کو خط لکھا کہ آپ مولوی صاحب کو رام پور منتقل ہو جانے کی دعوت دیں تاکہ کتب خانے سے ان کا رشتہ منقطع نہ ہو جو انھوں نے جماعت کو دینے کا عزم کرلیا ہے؟ چنانچہ مولانا نے مولوی صاحب کو بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ اس انداز میں دعوت دی: ''اگر کتب خانے کے ساتھ آپ بھی مرکز کو فخر وشرف بخشیں تو یہاں ہم سب رفقائے مرکز آپ کے علوم وکمالات سے مستفید ہوسکیں گے۔''

مولوی صاحب نے دعوت قبول کر لی اور اب میں نے کتابوں کی پیکنگ شروع کی اور مولوی صاحب اپنا کتب خانہ لے کر رام پور پہنچ گئے مگر چند دن بعد ہی انھیں ٹونک کی یاد نے بے چین کر دیا اور برکات منزل کے درودیوار کی یاد آ کر انھیں تڑپانے لگی اور وہ مولانا ابواللیث سے کہنے لگے: ''مجھے ٹونک یاد آرہا ہے۔'' کبھی کہتے مجھے حکیم صاحب قبلہ کا ٹونک یاد آرہا

ہے۔ کبھی کہتے مجھے بچے (ہم لوگ) یاد آ رہے ہیں۔ کبھی کہتے مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔ سنا ہے ایک بار مولانا ابواللیث نے پوچھا "گھر یعنی حیدرآباد دکن؟"

مولوی صاحب نے جھنجھلا کر جواب دیا: "نہیں صاحب! میں نے دکن سے ٹونک کی طرف ہجرت کر لی تھی۔ میرا گھر اب ٹونک ہے جہاں میرے استاد کا آستانہ ہے، اُن کے بچے ہیں۔ میں نصف صدی کے قریب اسی در پر گزار چکا ہوں۔ اب وہی میرا گھر ہے۔ رام پور میں میرا دل نہیں لگ رہا۔"

بالآخر چند ماہ بعد وہ ٹونک لوٹ آئے اور پھر وہی بالا خانہ ان کے قیام سے آباد ہو گیا مگر کتابوں کے بغیر ان کی گزراوقات ناممکن تھی: چنانچہ میرے کتب خانے سے انھوں نے کتابوں کی ایک تعداد منگوا کر اپنے پاس رکھ لی اور ان کے سہارے وہ اپنے اوقات بسر کرنے لگے اگر چہ میری کتابوں کا استعمال وہ طیب خاطر اور انبساط طبع کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ میں بے ذوق اور بے نصیب اپنی طرح اپنی کتابوں کی آرائش ظاہر سے غافل رہتا ہوں اور مولوی صاحب کے باطن کی طرح ان کا ظاہر بھی آراستہ رہتا تھا اور ان کے ظاہر کی طرح ان کی کتابیں بھی خوش منظر تھیں۔ ہر کتاب کی وہ بہت مضبوط اور خوبصورت جلد بنواتے تھے۔ ان کی پشت پر نقش و نگار بنواتے اور ہو سکتا تو ڈائی سے ان پر کتاب کا نام بھی لکھواتے۔ بہر حال ان کتابوں سے ان کا وقت کٹ جاتا تھا مگر پھر یہ کتابیں بھی میں ۱۹۵۳ء میں پاکستان ہجرت کرتے وقت اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے بعد وہ بعض علمائے شہر سے کتابیں مستعار لے کر ذوق مطالعہ کی تسکین کرتے رہے۔

مولوی صاحب حد درجہ صفائی پسند تھے۔ بلند معیار اور خوش ذوقی ان کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی نفاست مزاج کا اظہار ہوتا تھا، لباس ہمیشہ صاف ستھرا بلکہ بہت اعلیٰ استعمال کرتے تھے۔ شرعی پاجامہ، ململ کا کرتہ، اعلیٰ کپڑے کی بہت اچھی سلی ہوئی شیروانی، آنکھوں پر خوب صورت فریم کی عینک، سر پر جاڑے میں صافہ، گرمی میں کڑھی ہوئی دہلی کے شرفا کی سی ٹوپی، ہاتھ میں سبک اور قیمتی عصا، کار چوبی کام کے جوتے، خوشبودار تمباکو کا پان منہ میں، یہ تو تھی ان کی سج دھج۔ کمرے میں چاروں طرف الماریاں جن میں بڑے سلیقے

سے، ایک ترتیب کے ساتھ کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ بیچ میں بے داغ، صاف ستھرا فرش، وسط میں ایک مسند۔ اس پر جب دیکھیے مولوی صاحب بیٹھے ہیں، کوئی کتاب کھلی ہوئی ہے اور جھوم رہے ہیں۔ نظام اوقات، صبح وقت پر مدرسے جانا، پانچوں وقت نماز کے لیے مسجد کا پھیرا اور اس کے بعد تمام وقت مطالعہ۔

ہم لوگ ان کی شخصیت کی وجہ سے بے تکلف اور کسی قدر گستاخ بھی تھے۔ میں جب تک کثرت مطالعہ کے مرض اور عسیر العلاج مرض میں مبتلا نہیں ہوا تھا، ان کے ہر وقت کتاب میں مشغول رہنے پر حیرت کرتا تھا اور ایک بار پوچھ بیٹھا: ''چشتی چچا! یہ سب کتابیں تو آپ ایک ایک بار پڑھ چکے ہوں گے؟'' مطلب یہ تھا کہ اگر ایک ایک بار سب کتابیں پڑھ لی ہیں تو دوبارہ کیوں پڑھتے ہیں؟ فرمایا: ''کتاب کی ہر نئی تلاوت ایک نیا لطف دیتی ہے۔ غالباً نفاستِ ذوق ہی کی بنا پر مخطوطات کی طرف رجحان نہیں تھا اور ذخیرہ کتب میں بہت کم مخطوطات تھے جو اکثر سال خوردہ اور سن رسیدہ ہوتے ہیں۔ کرم خوردہ اور بوسیدہ اوراق کا پڑھنا اور رکھنا شاید ان کے مزاج کی نفاست پر گراں تھا۔

خورونوش میں یہی یہ رنگ تھا۔ خوش خوراک بھی تھے اور خوش ذوق بھی۔ کھانا ہمارے ساتھ کھاتے مگر ناشتہ خود تیار کرتے اور بڑا لذیذ۔ کھچڑی، قیمہ اور بریانی وغیرہ اپنے ہاتھ سے پکاتے اور خوب پکاتے، کھلا کر خوش ہوتے۔ اکثر خاص خاص احباب کی دعوتیں کرتے۔ ہم بھائیوں کو بھی اکثر مدعو کرتے مگر ہم خصوصاً مسعود میاں (مسعود احمد برکاتی) ان کے مزاج کے خلاف حرکتیں کر گزرتے، مثلاً بے وجہ ہنسنے لگتے یا کھانے میں کھانا دستر خوان پر گرا دیتے یا پانی کا گلاس الٹ دیتے جو ان کے مزاج پر بہت بار ہوتا مگر اپنی بے پایاں شفقت کے ہاتھوں وہ ہمیں چند روز بعد پھر بلا بیٹھتے اور مسعود میاں پھر گلاس الٹ کر ان کا فرش گیلا اور ان کا مزاج برہم کر دیتے مگر مولوی صاحب نے ہمیں معاف کر کے بلانا نہیں چھوڑا۔ آخر ہم ہی لوگ تنگ آ کر بڑے اور سمجھ دار ہو گئے۔

اسی قسم کی ایک دعوت ایک روز برپا تھی کہ ان کے ایک چہیتے درباری منشی حمید اللہ آ نکلے۔ مولوی صاحب نے انکو دیکھ کر فرمایا: ''بیٹھو ہم کھانا کھا کر آتے ہیں۔'' مگر منشی حمید اللہ خاں

قریب آ کر بیٹھ گئے۔ تیور یہ تھے کہ ہمیں بھی شرکت کی دعوت دو۔ مولوی صاحب ان کی غیر نفیس عادتوں کی بنا پر ان کو مدعو نہیں کرنا چاہتے تھے اور منشی حمید اللہ خاں زبان حال اور حرکات وسکنات کے اشاروں سے مصر کہ مجھے بھی اس میدان خور و نوش میں کودنے کی اجازت دو۔ آخر مایوس ہو کر کہہ گزرے: ''بہت بداخلاقی ہے کہ آپ کھانے کی صلا نہیں کرتے۔'' اس پر مسعود میاں کو ہنسی چھوٹی اور سالن کا پیالہ دستر خوان پر پھیل گیا۔

یہ منشی حمید اللہ مولوی صاحب کے خاص آدمی تھے۔ مولوی صاحب کو ان کے بغیر چین نہیں آتا تھا، ان کو بناتے تھے اور اس پر جب وہ بگڑتے تو مولوی صاحب لطف اندوز ہوتے اور قہقہے لگاتے اا اور چائے نوشی پر یہ محفل ختم ہوتی۔ منشی جی، بہت معصوم، بھولے بھالے سیدھے سادے آدمی تھے۔ آپ انھیں بیوقوف کہہ لیں۔ مولوی صاحب اپنی ثقاہت، شائستگی اور علم وفضل کے باوجود منشی جی کے لیے بے وقوف اور بے عقل کا ایک اردو بلکہ ہندی مترادف استعمال کیا کرتے تھے۔

ان کا مغرب سے عشا تک کا وقت خوش گپیوں کے لیے مختص تھا، اس وقت منشی حمید اللہ خاں کو بار ملتا تھا۔ چند اور مخلص بھی حاضر ہوتے تھے، لطیفے کہے اور سنے جاتے اور لطف طبع اور طبیعت کا حق ادا کیا جاتا۔ اس محفل کی جان منشی حمید اللہ خاں ہوتے۔ سب کے زور طبع کا ہدف وہی ہوتے۔ عشا کی اذان پر یہ محفل برہم کر دی جاتی۔

منشی جی کی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کا اندازہ یوں کیجیے کہ ایک دن مولوی صاحب نے ایک گھنٹہ منشی جی کو یہ کہہ کر دیا کہ ''اسے گھڑی ساز سے درست کرا لاؤ۔ اس میں خرابی یہ ہو گئی ہے کہ یہ بارہ بجے بعد سے مسلسل ہر آدھے گھنٹے بعد تین بار ایک ہی بجاتا ہے۔'' منشی جی گھنٹہ لے کر گھڑی ساز کی دکان پر پہنچے اور گھنٹہ دکھا کر اس کی یہ خرابی بیان کی۔ گھڑی ساز کے مسکرانے پر دوبارہ اُسے سمجھایا کہ میاں بارہ تو بجا دیتا ہے مگر پھر تین بار مسلسل ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک ایک بجا دیتا ہے یہ سمجھاتے سمجھاتے پھر خود منشی جی کی سمجھ میں بات آ گئی کہ پھر اور کیا بجائے، چنانچہ گھنٹہ وہیں چھوڑ کر چیختے پیٹتے واپس آئے کہ مجھے گھڑی ساز کے سامنے ذلیل کروا دیا آپ نے۔ ایک بار منشی صاحب جو مولوی صاحب کی جناب میں گستاخ بھی ہو گئے تھے، مولوی

صاحب کے اپنے ساتھ تمسخر پر بگڑ کر کہنے لگے: ''آپ ہر وقت ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں۔ جب دیکھو ہی ہی کھی کھی، سنجیدگی سے بات ہی نہیں کرتے۔''

مولوی صاحب نے جواب دیا:

''سن حمید اللہ! ہم ہر وقت ہنسی مذاق نہیں کرتے، صرف مغرب کے بعد کرتے ہیں۔ سب سے نہیں کرتے، صرف تجھ سے کرتے ہیں۔ دن بھر سنجیدہ باتیں کرتے ہیں، طلبہ اور علماء سے معقول گفتگو کرتے ہیں۔ ان سے غیر معقول بات کرنا اتنا ہی فضول ہے جتنا تجھ سے معقول بات کرنا۔ ہم تجھے صرف ایک بے وقوف (وہی ہندی مترادف استعمال کیا تھا) کے طور پر استعمال کرتے اور دن بھر کے خشک مشاغل کی تلافی کرتے ہیں۔ بے وقوف کو بے وقوف نہ سمجھنے والا خود بے وقوف ہے، تو ہم سے یہ توقع نہ رکھ کہ ہم تجھ سے ہنسی مذاق نہ کریں، یہ وضع الشئی فی غیر محلہ ہے۔''

منشی جی غصے ہو کر چلے گئے مگر دوسری رات مولوی صاحب ان کے گھر جا کر انھیں منالائے کہ ان کے بغیر محفل سونی تھی۔ ایک بار اجمیر سے غازی محی الدین صاحب تشریف لائے۔ وہ مولوی صاحب کے یار بے تکلف تھے۔ مولوی صاحب نے منشی جی کو ان سے متعارف کروایا۔ غازی صاحب منشی جی کے گرویدہ ہو گئے اور ان کے بغیر انھیں محفل سونی سونی لگتی تھی۔ ایک دن بہت سے احباب جمع تھے، منشی جی بھی تھے۔ غازی صاحب نے مولوی صاحب کو مخاطب کر کے بڑے گمبھیر انداز میں کہنا شروع کیا:

'' مولانا چشتی! آپ کو معلوم ہے میں دنیا بھر میں گھوما ہوں، طرح طرح کی محفلیں دیکھیں ہیں، طرح طرح کے بڑے بڑے عالی بیوقوف (وہی ہندی مترادف غازی صاحب بھی بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے) دیکھے ہیں۔ مگر آپ کی محفل کا جواب نہیں، آپ نے جو بیوقوف پایا ہے واقعی بیوقوف ہے اور دنیا میں اپنا مثیل ونظیر نہیں رکھتا۔ آپ پر بجا طور پر رشک کرسکتا ہوں کہ آپ نے منشی حمید اللہ جیسا بے وقوف دریافت کیا ہے۔''

غازی صاحب کے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک بار کئی حضرات بیٹھے تھے اور دیوان حافظ سامنے رکھا تھا۔ منشی جی تشریف لائے اور کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا: '' دیوان حافظ ہے؟''

پھراس کوالٹ پلٹ کر دیکھنے لگے اور ایک صفحے پر رک کر اس کا ایک شعر اس طرح پڑھ دیا جیسے اردو کا شعر ہے۔ کسی نے آوازہ کسا: ''دیوانِ حافظ میں اردو شعر!''

منشی جی برجستہ بولے: ''تو جناب کے خیال میں حافظ اتنا بڑا شاعر اردو نہیں جانتا تھا'' اور محفل لوٹ پوٹ ہوگئی۔

مولوی صاحب ایک معیاری خیر آبادی و برکاتی تھے۔ مسلمانوں کے فرقوں میں سے کسی فرقے، کسی گروہ سے نہ مفرط محبت تھی نہ شدید نفرت اور ان کی نظر میں کوئی بھی عالم تنقید سے بالا تر اور منزہ من الخطاء والنسیان نہیں تھا۔ وہ تمام علمائے سلف اور معاصرین کی عزت کرتے تھے۔ ان کی حقیقی خدمات کا کھلے دل سے اور صاف لفظوں میں اعتراف کرتے تھے۔ مگر کسی کا بھی ہر قول واجب التسلیم نہیں تھا۔ غلط بات کی، چاہے وہ کسی امام وقت نے کہی ہو، تردید وہ بے محابا اور بے تامل کرتے تھے اور صحیح بات کی چاہے وہ کسی بھی غیر مسلک کے عالم نے کہی یا لکھی ہو، تصویب و تائید کرتے تھے۔

وہ اپنے استاد گرامی (مولانا سید برکات احمد) کے رنگ میں رنگے تھے۔ وعظ و خطاب، نکاح خوانی اور امامت صلوۃ کی دعوت بڑی بے رخی بلکہ بے رحمی سے رد کرتے اور کہتے ہم لوگ یہ کام نہیں کرتے۔

ایک بار میں نے شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفا میں یہ واقعہ پڑھا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک فرزند پر زنا کی حد جاری کی یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو فرمانے لگے یہ واقعہ بالکل بے اصل ہے حضرت عمرؓ کے اس نام کے کوئی فرزند ہی نہیں تھے۔

میں نے گھبرا کر کہا: ''چشتی چچا! یہ بات شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے!'' مطلب یہ تھا کہ آپ کس کی تردید کر رہے ہیں؟ شاہ ولی اللہ بے اصل روایت لکھ سکتے ہیں!''

فرمانے لگے: ''بے اصل روایت، بہر حال بے اصل ہے، چاہے کسی نے لکھی ہو۔ شاہ صاحب کو اس کی تحقیق کا اتفاق نہیں ہوا ہوگا، بت پرستی ہمارا شعار نہیں، شاہ ولی اللہ بھی غلطی کر سکتے ہیں۔''

میری نوعمری اور ناپختہ کاری کا دور تھا، مجھے اس وقت یہ بات ناگوار گزری مگر حقیقت وہی

ہے جو مولوی صاحب نے بیان کی کہ یہ روایت بے اصل ہے۔

ایک بار...... یہ بھی آغاز جوانی کا قصہ ہے۔۔۔۔، مکتوبات مجدد الف ثانی دیکھ رہا تھا، اس میں شیخ مجدد نے لکھا تھا: ''حب الوطن من الایمان خبر صحیح است۔''

میں نے پڑھ اور سن رکھا تھا کہ یہ حدیث وضعی ہے۔ چشتی چچا کے پاس پہنچا اور اس حدیث کے متعلق دریافت کیا۔ مولوی صاحب نے متوقع جواب دیا کہ وضعی ہے۔ اب میں نے بغل سے مکتوبات نکال کر دکھانی چاہی کہ شیخ نے خبر صحیح لکھا ہے تو فرمایا:

''شیخ مجدد محدث نہیں تھے، اس لیے اس باب میں ان کا قول سند و حجت نہیں ہو سکتا۔ محققین و ناقدین کا قول اس باب میں حجت ہو گا۔''

چچا کی یہ بات بھی اس وقت میرے حلق سے نہیں اتر سکی کہ شیخ مجدد محدث نہیں تھے مگر بات یہی ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے۔

چشتی چچا! آپ کتنے عظیم انسان تھے، آپ کی عظمت مقام اسی کی متقاضی تھی کہ نہ آپ کا یوم منایا جاتا، نہ آپ کی یاد میں کسی مجلّے کا کوئی نمبر نکالا جاتا، نہ ریڈیو پر آپ کا نام آتا نہ ٹی وی پر۔ یہ سب باتیں نہ آپ کے شایانِ شان تھیں۔ نہ پسند خاطر۔ میں نے یہ مضمون بھی آپ کو زندہ کرنے، زندہ رکھنے اور لوگوں کو آپ سے متعارف کرنے کے لیے نہیں لکھا۔ میں نے تو یہ قلم درازی صرف اپنے ماضی قریب کے دھندلاتے ہوئے نقوش کو اجاگر کرنے کے لیے کی ہے کہ میرا واحد سرمایۂ حیات اور سہارا اسی ماضی قریب کی یادیں ہیں۔

در بیاباں مثلِ چوب نیم سوز
کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز

☆......☆......☆

مولانا حسین احمد مدنی

پھلت، ضلع مظفرنگر (یو۔پی) کا ایک موضع ہے جو قریہ اولیاء بھی کہلاتا ہے اور جسے حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہاں ہماری اراضی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں اس کی آمدنی وصول کرنے کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ دیوبند وہاں سے بہت قریب ہے۔ اس کے دارالعلوم کی زیارت اور اپنے دوست مولوی سراج احمد مرحوم (سابق استاد جامعہ کراچی) سے ملنے کے لیے دیوبند گیا۔ مولوی سراج احمد اور ان کے رفقاء جماعت نے ہمیں خوش آمدید کہنے کے ساتھ مبارک باد دی کہ آپ کی خوش قسمتی سے حضرت شیخ سفر پر جا رہے تھے مگر تاخیر سے اسٹیشن پہنچنے کی وجہ سے واپس آگئے ہیں اس لیے آپ ان کی زیارت کر سکیں گے۔ مجھے حضرت شیخ کی نیازمندی کا ذوق ہی نہیں تھا مگر مبارک باد وصول کر لی چنانچہ حکم ہوا کہ چلو سب سے پہلے حضرت کے آستانے پر۔ اچھا چلو، یہ بھی سہی، چلے چلتے ہیں، کیا حرج ہے؟ ہمارے دوست ہمیں مولانا کے آستانے پر لے گئے۔ مولانا نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ میں مصافحہ کر کے کھڑا ہو گیا اور نہیں سمجھ سکا کہ مولانا میرے لیے کھڑے ہوئے ہیں اس لیے میں کھڑا رہا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: ”آپ بیٹھ جائیے۔ مولانا آپ کی وجہ سے کھڑے ہیں۔“ میں یہ سنتے ہی بیٹھ گیا تو مولانا اور سب لوگ بھی بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد مولانا سراج نے تعارف کروایا کہ یہ مولوی حکیم سید برکات احمد کے پوتے ہیں۔ یہ سن کر خصوصی توجہ فرمائی اور اپنے یہاں قیام کی

دعوت دی۔ عرض کی کہ مولانا سراج کے یہاں قیام کیا ہے اور کل صبح واپسی ہے۔ فرمایا کہ چند روز اور قیام فرمائیں اور ہمیں خدمت اور میزبانی کا موقع دیں۔ عرض کیا کل ضرور جانا ہے۔ رخصت کے وقت مولانا پھر کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ دوسرے حضرات بھی۔

مولانا مدنی سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ویسے ہی کوئی تعلق خاطر نہیں تھا۔ پھر مولانا تحریک پاکستان کی جس شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس نے ان سے اور بھی دور کر دیا تھا اس لیے سفر دیوبند میں صرف احباب سے ملاقات مقصود تھی۔ مولانا مدنی کی زیارت کا خیال ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا مگر احباب میرے جذبات سے یکسر بے خبر اور اپنے جذبات عقیدت سے سرشار جب حضرت شیخ کی زیارت کے لیے لے چلے تو میں خوش دلی سے نہیں بلکہ بجبر مروت جا رہا تھا مگر وہاں پہنچ کر مولانا کے طرز تپاک نے تو جھنجوڑ ڈالا۔ میں مولانا سراج کے ساتھ گیا تھا جو دارالعلوم کے طالب علم اور مولانا کے صدہا طلبہ میں سے تھے۔ خود میں ایک سولہ سالہ نوعمر تھا۔ میرا سراپا آج بھی حقیر ہے، اس وقت اور بھی حقیر تھا۔ جد بزرگ سے نسبت کا تعارف بھی بعد میں ہوا۔ اس لیے میرے پہنچتے ہی استقبال کے لیے کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہر آنے والے کا استقبال اسی طرح فرمانے کے عادی اور قائل تھے۔ پھر اپنے یہاں قیام کی دعوت اور خدمت و میزبانی کا موقع دینے کی درخواست اور اس پر اصرار نے مولانا کے حسن خلق کا گہرا نقش دل پر چھوڑا۔

مولانا کا کمرہ متوسط طول و عرض کا تھا جس میں سیتل پاٹی کا فرش تھا اور چاروں طرف چار گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں کوئی مسند یا خصوصی نشست نہیں تھی۔ یہ سلیقہ اور یہ جدت پسند آئی۔ پھر تواضع کھجور سے کی گئی۔ دو بہت چھوٹی چھوٹی تشتریاں سامنے رکھی گئیں۔ ایک میں دو کھجوریں تھیں اور دوسری کھجور کھا کر گٹھلی رکھنے کے لیے۔ یہ تواضع بھی سادگی اور جدت پسندی اور سلیقے کا مظہر تھی۔ مغرب عشاء اور صبح کی نمازیں دارالعلوم کی مسجد میں مولانا ہی کی امامت میں پڑھیں۔ نماز کے بعد دعا اور بالخصوص غاصب فرنگی سے استخلاص وطن کے لیے مولانا کی دعا نے دل ہلا دیا اور یوں مولانا کی زیارت، جو سرے سے متصور و مقصود نہ تھی، حاصل سفر بن گئی۔

مولانا مدنی! اگرچہ فضل و کمال میں، علماء دیوبند میں ممتاز اور اکابر علماء مولانا محمود حسن، مولانا انور شاہ، مولانا رشید احمد، اور مولانا اشرف علی کے ہم پایہ نہیں تھے مگر سیرت و کردار کے

لحاظ سے ان کا مقام بہت بلند تھا۔ عجز و تذلل کی جو دولت ان کو ارزاں ہوئی تھی وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ ایک سیاسی قائد کی حیثیت سے مولانا کا کوئی مقام میری نظر میں نہیں ہے۔ ان کا انداز فکر بہت سادہ اور جذباتی تھا کہ فرنگی غاصب ہے، اس سے استخلاص وطن فرض ہے اور اس کے لیے اگر کلاب و خنازیر سے بھی اتحاد کرنا پڑے تو کرنا چاہیے چنانچہ وہ کانگریس سے تعاون کے قائل و مبلغ تھے۔ پھر متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کر کے انھوں نے علامہ اقبال سے وہ اشعار کہلوائے جو ان کے دامن پر چسپاں ہو کر رہ گئے۔

فکر و نظر کے اعتدال و توازن کی کیسی قابل رشک مثال ہے کہ مولانا نے تحریک پاکستان کی جم کر مخالفت کی، بڑھ چڑھ کر حملے کیے، رسائل لکھے مگر جب پاکستان بن گیا تو پھر مملکت پاکستان کی مخالفت گوارا نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تعمیر مسجد سے اختلاف کیا تھا (کہ مثلاً اس جگہ نہ بناؤ یا اس طرح نہ بناؤ) مگر جب مسجد تعمیر کر لی گئی تو اب وہ مسجد ہے، وہ ہمارے لیے مقدس ہے محترم ہے اور اس کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔

اسی متوازن فکر و نظر کا مظہر ان کا یہ فیصلہ تھا کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد بھارت میں مسلمانوں نے ہندو اکثریت اور متعصب انتظامیہ کے خوف سے عرس منانا اور تعزیہ نکالنا بعض جگہ چھوڑ دیے تھے۔ مولانا نے اس کا نوٹس لیا اور ان کاموں کا دوبارہ اجرا کروایا۔ مثلاً میرٹھ کے مسلمانوں نے ایک تعزیے نکالنے کا پروگرام ملتوی کرنا چاہا تو مولانا نے اس سے اختلاف کیا جمعیت کے کارکنوں کو مامور کیا کہ مسلمانوں کو سمجھائیں اور آمادہ کریں کہ وہ تعزیہ ضرور نکالیں اور جمعیت کے کارکن مقامی حکومت کے تعاون سے اس کا اہتمام کریں۔ دلی میں نظام الدین میں عرس کے مراسم اور قوالی کا اہتمام جمعیت کی نگرانی میں کروایا اور فرمایا کہ یہ کام ہمارے نزدیک ناجائز ہیں لیکن کفار کے نزدیک یہ مسلمانوں کا شعار ہیں اس لیے ان کا سلسلہ بند ہونے سے کفار کی جراءتیں بڑھیں گی اور مسلمانوں کی ہمتیں پست ہوں گی۔ پھر وہ اپنے حقوق سے جائز کام کرنے اور بہت سے فرائض ادا کرنے سے ہچکچائیں گے۔

حکومت ہند نے مولانا کی سیاسی خدمات کے صلے میں انھیں بھارت کا اعلیٰ ترین اعزاز پدم بھوشن پیش کرنا چاہا مگر مولانا نے انکار کر دیا۔

مولانا احمد سعید دہلوی

ابتدائی جماعتوں کی تعلیم کے دوران چند رفقاء جماعت نے ایک انجمن تشکیل دی۔ مجھے
انجمن آرائی کا نہ اس دور میں ذوق تھا نہ اب ہے مگر اس کا رکن بنالیا گیا۔ خاص مقصد یہ تھا کہ
تقریر و وعظ کی مشق کی جائے۔ مجھے تقریر کرنے اور تقریر سننے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ مگر سب
ساتھی اس راستے پر چل رہے تھے۔ اس لیے میں بھی مارے باندھے چلنے لگا۔ ایک استاد نے
ایک تقریر لکھ کر دی۔ وہ میں نے یاد کر لی اور تنہائی میں خوب مشق کی مگر جب جلسے میں تقریر
شروع کی تو دو چار جملوں کے بعد ہی بھول گیا اور تقریر جاری نہ رکھ سکا۔ اسی سے ملتے جلتے
''حادثے'' چند دوسرے ساتھیوں کو بھی پیش آئے۔ میں نے تو اپنے رجحان کی بنا پر مشورہ دیا
کہ یہ چکر ہی ختم کرو، تقریر کی بجائے تحریر کی مشق کرو۔ مگر رفقاء مقرر بننے پر تلے ہوئے تھے اس
لیے کہیں سے تقریر سکھانے والی کتابوں کا پتا لائے کہ ان کو پڑھ کر تقریر کرنا آجاتا ہے۔ چنانچہ
وہ کتابیں منگوائی گئیں۔ ان کتابوں کے نام جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا وغیرہ تھے اور مصنف
تھے مولانا احمد سعید دہلوی۔ یہ تقریریں یا وعظ تھے جنہیں کتابچوں کی شکل میں چھاپ دیا گیا
تھا۔ مجھے ان کتابچوں کے حسن ظاہر نے بہت متاثر کیا۔ سفید اعلیٰ کاغذ، معیاری کتابت
موزوں چھوٹا سائز، دیدہ زیب جاذب طباعت وغیرہ۔
اتنے خوبصورت دینی رسالے میری نظر سے پہلے کبھی نہیں گزرے تھے ورنہ اب تک

دینی رسالے اور کتابچے دیکھے تھے ان میں کاغذ بہت معمولی بلکہ کسی کسی کا تو پیلا ہوتا تھا۔ سائز پندرہ بیس صفحات کے رسالوں کا بھی وہی بڑا جو ضخیم کتابوں کا ہونا چاہیے۔ کتاب میں سطر بدلنے کا کوئی رواج نہیں۔ بات ختم ہوگئی بلکہ باب بھی ختم ہوگیا مگر سطر نہیں بدلے گی۔ اسی سطر سے دوسرا باب شروع کر دیا جائے گا۔ اس کے برعکس ادبی کتابوں اور کتابچوں میں آرائش ظاہر کا پورا پورا اہتمام ہوتا تھا۔ اس لیے مولانا احمد سعید کے یہ کتابچے نظروں کو بہت بھائے اور فہرست دیکھ کر ان کے متعدد رسائل منگوائے اور پڑھے۔ اگرچہ اب جائزہ لیتا ہوں اور یاد کرتا ہوں تو ان کے صرف ظاہری حسن نے متاثر کیا تھا۔ ان کے مواد میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی ورنہ اس دور میں جو چیزیں پڑھی تھیں اُن کی جو باتیں پسند آئیں یا جن باتوں نے چونکا دیا وہ اب تک یاد ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی کتابوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں، جو فقرے پسند آئے، مولانا حالی کی حیات سعدی، مولانا آزاد کے تذکرے، مولانا شبلی کی نظموں کے مجموعے کی پوری پوری نظمیں، مولانا سید سلیمان ندوی کے خطبات مدراس۔

چند دن کے بعد وہ کتابچے بھی فراموش ہوگئے اور مولانا احمد سعید بھی۔ ۱۹۴۰ء کے قریب جب اخبارات کا مطالعہ شروع کیا اور سیاسی قائدین اور سیاسی جماعتوں کے متعلق معلومات ہوئیں تو معلوم ہوا کہ جمعیت علماء ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ ہیں اور ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید اور یہ بھی کہ جمعیت علماء ہند کانگریس کی ہمنوا ہے۔ ادھر میرا رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا۔ اس لیے ذہنی قرب بھی نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ لیگ اور کانگریس کی اس سخت کشمکش اور جذبات کی تلخی و شدت کے اس دور میں بھی کانگریس سے وابستہ علماء کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شدید اختلافات کے باوجود مولانا آزاد کے زور قلم کا سحر نہیں ٹوٹا اور ان کی تحریروں کا حصول اور زور و شور سے ان کا مطالعہ برابر کرتا رہا اور کانگریسی علماء کے علم و فضل اور عظمت و کردار کے اعتراف میں ان کا سیاسی کردار اور نقطہ نظر کبھی حائل نہیں ہوا۔ چنانچہ جب ۴۴ء میں طبیہ کالج دہلی میں داخلہ ہوا تو وہ تحریک پاکستان کے شباب کا دور تھا اور سیاسی اختلافات کے بھی شباب کا دور تھا۔ کثرت سے سیاسی جلسے ہوتے اور میں لیگ کے جلسوں کے ساتھ ساتھ جمعیت علماء ہند کے جلسوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ چنانچہ کئی بار مولانا احمد سعید کی تقریریں سننے کا بھی

موقع ملا۔ مجھے ان تقریروں میں دہلی کی زبان کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ سن رسیدہ حضرات کہتے تھے کہ مولانا احمد سعید کی جوانی کی تقریریں سننے کی ہوتی تھیں۔ اب تو تقریروں میں وہ بات نہیں رہی مگر ہمیں تو اب بھی لطف آتا تھا۔

دو ایک بار ان کے یہاں حاضری بھی دی۔ ایک بار بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ بار دیگر مولانا کچھ حضرات سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں خالص تاجرانہ گفتگو فرماتے رہے اس لیے ناکام لوٹے۔ ایک بار پہنچے تو چائے کا دور چل رہا تھا۔ مولانا نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا ان کو نہیں، چائے صرف مستقل آنے والوں کو ملتی ہے۔ جب محفل برہم ہوئی تو میرا تاثر یہ تھا کہ یہ باقاعدگی ہے اور پسندیدہ چیز ہے مگر ایک صاحب کو یہ تفریق پسند نہیں آئی۔ وہ بزرگوں کی محافل میں بلا امتیاز تواضع اور صرف توجہ کو یاد کر رہے تھے۔

تقاریر وعظ کے چھوٹے چھوٹے رسالوں کے علاوہ مولانا کا ایک ترجمہ قرآن بھی علم میں آیا ہے مگر مطالعے کا موقع نہیں ملا۔

غالباً ۱۹۵۱ء میں مولانا کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ کسی کا عقد تھا، جس میں کسی طرح میں بھی شریک تھا۔ مولانا آزاد بھی تشریف لائے تھے اور دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ وقت کے اکابر علماء بھی تھے اور کئی ہندو حضرات بھی، ایک ہندو جو غالبا کانگریسی تھے مگر زعماء کانگریس سے ناخوش رہا کرتے تھے، مولانا آزاد سے سوالات کر رہے تھے۔ مولانا نے ایک سوال کے جواب میں کہا، میرے بھائی کانگریس تو اب ایک تن بے جان ہے۔ اس پر ان صاحب نے بے اختیار نعرہ لگایا۔ مولانا جزاک اللہ۔

☆......☆......☆

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

۱۹۴۴ء میں طبیہ کالج میں داخلے کے بعد جلد ہی مولانا حفظ الرحمٰن سے نیاز حاصل ہوگیا۔ کیونکہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی کا دفتر اور ندوۃ المصنفین کا ادارہ طبیہ کالج کے بہت ہی قریب تھا۔ دونوں میں اجمل پارک حائل تھا۔ اس قرب مکانی کے علاوہ مجھے علماء سے استفادہ اور تقرب کا ذوق تھا اور اس میں مسلک کا اختلاف، کہ تربیت کچھ ایسی ہوئی تھی اور مزاج بھی ایسا ہی پایا تھا، کبھی حائل نہیں رہا۔ ارباب برہان سے مسلک فقہی کا بھی اختلاف تھا کہ یہ حضرات مسلکاً دیوبندی تھے۔ اور مسلک سیاسی کا بھی اختلاف تھا کہ یہ حضرات نیشنلسٹ تھے۔ میں دیوبندی نہیں خیر آبادی تھا۔ اور کانگریسی نہیں مسلم لیگی تھا۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اپنے سیاسی مسلک میں متشدد تھے اور اکثر ہماری تحریک کے بغیر بولتے رہتے تھے۔ مولانا سعید احمد معتدل اور نرم تھے اور اس موضوع سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی ممبر تھے اور جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سیکریٹری بھی مگر ان کے یہاں یہ اہتمام تھا کہ چھیڑو تو بولتے تھے۔

مولانا ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے اور جو وقت انھیں سیاسی سرگرمیوں سے ملتا تھا وہ اسی ادارے میں بیٹھ کر لکھتے پڑھتے تھے۔ ان کا قیام قریب ہی قرول باغ کے ایک حصے شیدی پورہ کے ایک مکان میں تھا۔ وہاں سے شہر جاتے آتے وہ میل بھر پیدل چل کر باڑہ ہندو

راؤ جاتے تھے جہاں سے انھیں ٹرام ملتی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ چاندنی چوک اترتے اور آدھا میل پیدل چل کر جمعیت کے دفتر پہنچتے تھے۔ ٹرام کے انتظار میں، میں نے انھیں آدھا آدھا گھنٹہ کھڑے دیکھا ہے۔ اتنے بڑے عالم دین کی یہ عسرت دیکھ کر ہمیشہ دل بے حد متاثر ہوتا تھا۔

مولانا سیاسی تقاریر کے علاوہ دینی موضوعات پر بھی تقریر کیا کرتے تھے۔ خصوصاً سیرت پر ان کی تقاریر بڑی پرمغز ہوتی تھیں اور لیگی اور کانگریسی اختلافات کی اس شدت کے دور میں مولانا کے کانگریسی ہونے کے باوجود ہم انھیں بڑے چاؤ سے بلاتے تھے۔ ایک بار کالج میں سیرت کا جلسہ تھا، طلبہ کی خواہش تھی کہ مولانا ضرور آئیں۔ طلبہ کو مولانا سے میرے تعلق کا علم تھا اس لیے مجھ سے کہا گیا کہ میں مولانا کو مدعو کروں۔ میں نے مولانا کو دعوت دی تو انہوں نے معذرت کر دی۔ میں نے جا کر طلبہ سے کہہ دیا کہ مولانا نے معذرت کر لی ہے۔ طلبہ اپنے اشتیاق کی بنا پر خود مولانا کے پاس پہنچ گئے اور اصرار کیا تو مولانا نے منظور کر لیا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو مجھے بڑا املال بھی ہوا اور بڑی حیرت بھی۔ چنانچہ میں مفتی صاحب کے یہاں گیا اور ان سے شکایت کی۔ وہ مجھے لے کر مولانا کے پاس گئے کہ حکیم صاحب کو شکایت ہے کہ آپ نے ان سے انکار کر دیا اور دوسرے لڑکوں سے اقرار کر لیا۔ اس پر مولانا نے جو جواب دیا وہ میرے لیے موجب حیرت بھی تھا، غیر متوقع بھی اور رنج دہ بھی۔ فرمانے لگے ''بھئی آپ نے اصرار نہیں کیا تھا۔''

میں یہ جواب سن کر مشتعل ہو گیا اور یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا کہ ''مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک عالم دین سے تکلفات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔'' دو تین روز کے بعد مفتی صاحب ملے تو کہنے لگے ''مولانا اپنے طرز عمل پر نادم ہیں۔''

مولانا کا ایک اور غیر متوقع جواب میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ ۱۹۴۶ء میں میری شادی ہوئی تو اس کا دعوت نامہ اُن کو بھیجا گیا۔ جب میں شادی کے بعد دہلی پہنچا اور دفتر برہان گیا تو مفتی صاحب نے مبارک باد دی۔ وہ دعوت نامے کا جواب بھی دے چکے تھے۔ اتنے میں مولانا آ گئے تو مفتی صاحب نے کہا، حکیم صاحب شکایت کر رہے ہیں کہ آپ نے دعوت نامے کا جواب نہیں دیا۔ اس پر مولانا نے فرمایا: ''مطبوعہ دعوت نامہ تھا۔ خصوصی دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔''

میرے لیے مولانا کا یہ جواب بھی غیر متوقع تھا۔

مولانا بڑے پختہ نیشنلسٹ تھے اور میں اس دور میں پُر جوش مسلم لیگی اس لیے اس پہلو سے مولانا سے شدید اختلافات تھے مگر اس سے ہٹ کر علماء کے احترام کا جو جذبہ گھٹی میں تھا اس کی بنا پر، ساتھ ہی ان کے کردار کی بنا پر، دل میں ان کی ہمیشہ عزت رہی۔ لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء میں دلّی میں جو ہنگامہ قتل و غارت برپا ہوا اس میں مولانا نے جس بے جگری، ہمت، بے باکی کے ساتھ دلی کے مسلمانوں کی خدمات انجام دیں اور کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مسلمانوں کی مدد کی میں ان کا عینی شاہد ہوں اور اس پہلو سے میرے دل میں ان کی بڑی عقیدت ہے۔ ایک اور پہلو سے میرے دل میں مولانا کی قدر و عزت ہے۔ جماعت اسلامی کے خلاف علماء دیوبند کے رویے میں جب ۱۹۵۰ء کے بعد شدت آ گئی اور مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے مولانا مودودی کے خلاف ایک طویل و پر جوش مضمون شائع کیا گیا اور پھر ۱۹۵۱ء میں مولانا مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دھلوی وغیرہ کئی اکابر علماء دیوبند کا جو فتوی شائع ہوا اس پر مولانا حفظ الرحمٰن نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس خصوص میں مولانا حفظ الرحمان اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی، جماعت اسلامی کی تحریک سے اختلاف کے باوجود مولانا مودودی سے بغض نہیں رکھتے تھے۔ مولانا سعید احمد تو مولانا مودودی سے ملتے بھی رہے اور مولانا مودودی کے وصال کے بعد انہوں نے ایک مخلصانہ تعزیتی مضمون بھی لکھا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی کئی تالیفات سے استفادے کی سعادت ملی ہے مگر وہ میرے پسندیدہ مصنفین میں نہیں ہیں۔ ان کی قصص القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے بڑی محنت کی ہے اور تحقیق کی ہے مگر انھیں لکھنا نہیں آتا، نہ زبان سلیس ہے۔ زبان میں مولویت اور عربیت ہے۔



مولانا عبدالجلیل ٹونک مُلاّ

مولانا عبدالجلیل، مردان (سرحد) کے ایک قلندر مزاج عالم اور عقلیات کے فاضل جلیل تھے اپنے ٹونکی استاد کی ذات سے شیفتگی کی بناء پر سرحد کے علماء اور طلبہ میں ٹونک ملا کے لقب سے مشہور تھے۔

افسوس ہے کہ دوسرے بہت سے برکاتیوں کی طرح مولوی صاحب کے حالات بھی پاکستانی علماء کے متعدد تذکروں میں سے کسی ایک تذکرے میں نظر سے نہیں گزرے حالانکہ انھی تذکروں میں کئی علماء کے ان سے تلمذ کا ذکر ہے۔

مولوی صاحب ابتدائی تعلیم سرحد ہی میں حاصل کر کے ٹونک آئے اور پڑھنا شروع کیا تو پڑھتے ہی چلے گئے یعنی کسی حد پر ان کا تعلم ختم ہی نہیں ہونے پاتا تھا۔ جو کتابیں پڑھ چکے تھے دوبارہ سہ بارہ ان کے درس میں شریک ہوجاتے اور چونکہ اس دور میں اور خاص طور پر مدرسہ خلیلیہ میں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ جو کتاب طالب علم ایک بار پڑھ چکا ہے اس کو دوبارہ سہ بارہ نہیں پڑھ سکتا اس لیے بے تکلف اور بے تکان پڑھے چلے جارہے تھے۔ مولانا برکات احمد اگر کبھی فرماتے بھی کہ مولوی عبدالجلیل، تم یہ کتاب پڑھ چکے ہو تو جواب دیتے ''جناب صاحب! ابھی ہمارا تشفی نہیں ہوا''۔ ملک کے مختلف حصوں میں مدارس میں معلمین کی ضرورت ہوتی تو مولانا کے پاس درخواست آتی کہ کوئی معلم منتخب اور نشان زد فرما دیجیے اور

مولانا ان سے فرماتے کہ وہاں ضرورت ہے، تم چلے جاؤ تو جواب دیتے ''ابھی ہم متعلم ہے ابھی معلم نہیں بن سکتا'' مولانا خاموش ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مولانا نے فرمایا تو انھوں نے آخری جواب دیا ''ہم تم کو مار کر جائے گا'' مطلب یہ تھا کہ تمھاری زندگی میں یہ در نہیں چھوڑوں گا۔ آخر ایک بار مولانا کامیاب ہو ہی گئے۔ ہوا یہ کہ دہلی سے ایک مدرس کی طلب آئی۔ مولانا نے ان سے فرمایا ''میں اس جگہ کے لیے ایک ایسے استاد کو بھیجنا چاہتا ہوں جو وہاں میرا نام روشن کرے'' مولوی صاحب ٹس سے مس ہو گئے اور نعرہ لگایا ''ہم تمھارا نام روشن کرے گا'' اور اس طرح وہ ٹونک سے مدرس ہو کر دہلی پہنچ گئے اور وہاں ایک شان اعتماد کے ساتھ مسند درس آباد کی اور کئی معرکے سر کیے۔

ایک بار ترنگ میں آ کر طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ''کلیات قانون'' کا سبق شروع ہوا تو پہلے ہی سبق میں استاد کے پسینے چھوٹ گئے۔ بھلا اس خیر آبادی و برکاتی فاضل معقولات کے اعتراضات کا سامنا کون کر سکتا تھا۔ جب معلم کلیات کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا برکات احمد سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں تو انھوں نے بے تکلف اور برملا سپر ڈال دی اور صاف کہہ دیا کہ آپ کو مطمئن کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے اور پھر وہ درس کلیات سے مستثنیٰ قرار دے دیے گئے۔

میں نے ایسے ایسے کئی واقعات سن رکھے تھے اس لیے ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم معینیہ عثمانیہ (اجمیر) سے درس نظامی سے فراغت کے بعد طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لیا تو ان سے ملنے کے لیے نکلا۔ پوچھتا پوچھتا محلہ سبزی منڈی کی ایک مسجد میں پہنچا جہاں بتایا گیا کہ سامنے کمرے میں مصروف درس ہیں۔ میں کمرے میں پہنچا تو مولوی صاحب چند طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ میں طلبہ کی صف میں دو زانو بیٹھ گیا (کہ یہی درس گاہوں کے آداب تھے)۔ ''شرح تہذیب'' کا درس ہو رہا تھا اور مولوی صاحب ادائے خاص سے سرگرم تقریر تھے مگر چند لمحے بعد ہی دیکھا کہ تقریر کا زور ٹوٹ گیا اور مولوی صاحب الجھنے لگے، رک رک کر بولنے لگے، اٹکنے لگے۔ آخر گھبرا کر میری طرف دیکھا اور خود کلامی کے سے انداز میں کہنے لگے ''یہ ہم کو کیا ہو گیا ہے؟ سارا مضمون خبط ہو گیا۔۔۔۔ شاید استاد کا روح آ گیا'' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا ''تم کو

ہمارے استاد سے نسبت ہے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں، میں محمود میاں ہوں۔'' یہ سنتے ہی اپنی جگہ سے اچھلے اور میری گود میں سر رکھ کر چیخ چیخ کر رونے لگے۔ بڑی دیر میں اور بمشکل جذبات کا سیلاب کم ہوا تو پہلا سوال مجھ سے یہ کیا کہ ''خوانساری کہاں ہے؟'' (ایک نادر مخطوطہ جو ہمارے کتب خانے میں تھا)۔ میں نے جواب دیا ''حفاظت سے ہے۔'' اچانک انھیں طلبہ کے حرج کا خیال آیا۔ اس نازک جذباتی لمحے میں بھی انھوں نے طلبہ کو فراموش نہیں کیا اور طلبہ سے (جو اس منظر کو حیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے) کہا ''اس نے ہمارا تقریر خراب کیا اب یہ تم کو پڑھائے گا'' یہ کہہ کر مجھے مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بے تامل مسند پر جا بیٹھا اور طلبہ سے کہا عبارت پڑھو طلبہ نے عبارت پڑھی اور میں نے اگرچہ نہ مطالعہ کیا تھا نہ چند لمحے پہلے یہ سوچا کہ درس دینا ہوگا، نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کے کس مقام کا درس ہے مگر ایک رواں دواں تقریر کر دی۔ تقریر ختم ہوئی تو طلبہ سے پوچھا کوئی سوال؟ جواب نفی میں ملا۔ مولوی صاحب نے ایک شان افتخار کے ساتھ طلبہ کی طرف دیکھا اور فرمایا ''دیکھا! ہمارے استاد کا روح، بس اب جاؤ'' یوں طلبہ کو رخصت کر کے مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

میں آج پچاس سال بعد بھی اس واقعے کی جزئیات کی توجیہ پر قادر نہیں ہوں کہ مولوی عبدالجلیل جیسا منجھا ہوا مدرس اور فاضل معقولات اور شرح تہذیب جیسی ابتدائی کتاب کا، جسے نجانے کتنی بار پڑھ چکا ہوگا، درس دے رہا تھا تو اٹکنے کیوں لگا اور اس کو یہ کیسے خیال آیا کہ ان کے استاد کی روح آ گئی ہے۔ اور تقریر کی ژولیدگی اس کی وجہ سے ہے؟ پھر انھوں نے اگرچہ میرا نام سن رکھا تھا مگر مجھے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ انھیں یہ گمان کیسے ہوا کہ میں ان کے استاد سے نسبت رکھتا ہوں؟ میں نے شرح تہذیب کا سبق بغیر مطالعے اور اچانک نوٹس پر کیسے پڑھا دیا اور برجستہ تقریر کیسے کر دی اور طلبہ کو پوری طرح مطمئن کیسے کر دیا؟

میں جب تک کالج میں زیر تعلیم رہا مولوی صاحب میرے پاس تشریف لے آتے اور میں اپنے کمرے میں ہوتا یا باہر جیسے ہی سامنا ہوتا مولانا میرے قدموں میں سر رکھ دیتے۔ میں پانی پانی ہو جاتا اور دیکھنے والے حیران ہو کر یہ منظر دیکھتے۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کو اپنے پوتے (حکیم محمد نبی خان جمال سویدا) کے لیے

ایک استاد کی تلاش تھی، استاد کا جو معیار حکیم صاحب کے ذہن میں تھا اس پر مولوی صاحب ہی پورے اترے اور انھوں نے بعض شرائط کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کر لی اور کئی سال تک نبھاتے رہے۔

مولوی صاحب تقریباً تیس سال دہلی میں طالبان علوم کو مستفید کرتے رہے اور جب ۱۹۴۷ء کی پٹیل گردی میں دہلی کی پہنائیاں مسلمانوں پر تنگ ہو گئیں تو مولوی صاحب کو بھی دہلی چھوڑنا پڑی اور نہ جانے کس طرح اور کس حال میں پاکستان پہنچے۔ مولانا محمد اسرائیل (پشاور) کا بیان ہے کہ کھلابٹ (ہزارہ) میں اپنے رفیق درس رئیس المناظرین مولانا قاضی عبدالسجان کے پاس قیام کیا پھر مردان منتقل ہو گئے اور بقیہ زندگی عالمانہ سادگی اور قلندرانہ شان کے ساتھ گزار کر ۱۹۶۳ء میں وصال فرمایا۔

مولوی صاحب نے چالیس پینتالیس سال تسلسل اور ذوق وشوق کے ساتھ درس دیا۔ اس طویل عرصے میں کتنے طلبہ نے ان سے استفادہ کیا ہوگا اور ان میں کتنے طلبہ نے فارغ ہو کر تدریس کی مسندوں کی رونق بڑھائی ہوگی مگر افسوس ہے کہ ان میں سے بہت سے حضرات کے ناموں کا پتہ بھی نہیں چلا۔

ان کے ایک شاگرد سعید مولانا محمد اسرائیل تھے۔ جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں ان سے استفادہ کیا تھا اور پھر انھی کی اجازت سے اجمیر جا کر مولانا معین الدین اجمیری سے فنون کی تکمیل اور حدیث کی قرات وسماعت کی تھی۔ مولانا محمد اسرائیل مرحوم ہمیشہ اپنے خطوں میں اور جب پشاور سے کراچی آتے تو گفتگو میں، دوسرے اساتذہ کے ساتھ مولوی صاحب کا ذکر خیر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے انھوں نے اپنے ایک مقالے میں بھی مولوی صاحب کا بدیں الفاظ ذکر کیا ہے:

"میں مولوی عبدالجلیل ٹونکی کے حلقہ درس میں شامل ہوا اور منطق، فلسفہ، معانی، فقہ، اصول، تفسیر اور حدیث یہ تمام علوم میں نے ان سے پڑھ لیے۔ عام درس نظامی سے ہمارا درس کچھ مختلف تھا۔ لیکن مضامین تقریباً ایک ہی تھے۔ البتہ منطق اور فلسفے میں خیر آبادی خاندان کا بعض مسائل میں اپنا ایک مسلک ہے جو ان کے تفردات میں سے ہے۔ استاد گرامی جب مہاجر

کی حیثیت سے پاکستان آئے تو پہلے پہل ضلع ہزارہ کے کھلابٹ نامی گاؤں میں جواب تربیلا ڈیم کی جھیل میں آ گیا ہے، اپنے ایک رفیق درس قاضی عبدالسبحان صاحب کے پاس تشریف لائے۔ مجھے پیغام بھیجا کہ فصوص الحکم اور اس کی شرح کاشانی مجھے بھیج دیں۔ میں نے تعمیل حکم کرتے ہوئے وہ کتابیں ان کو بھیج دیں۔ کچھ مدت بعد وہ مردان تشریف لائے اور یہاں فقر واستغنا کے دن گزارے۔ بعض خاص لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ آخر ۱۹۶۳ء میں علم وعرفان کا یہ خزینہ مردان کے قریب سپرد خاک کیا گیا (ماہ نامہ پشتو، پشاور، اعتراف نمبر جلد ۱۰ شمارہ ۱۰/۱۱)۔

پاکستان میں ان سے استفادہ کرنے والے علماء میں سے دو حضرات کے نام معلوم ہوئے ہیں مولانا قاضی سیف الرحمٰن صاحب، مولانا غلام محمود صاحب (ص ۱۹ و ۳۸۲، تعارف علماء اہلسنت از مولانا محمد صدیق ہزاروی)



شفاء الملک حکیم نظام الدین اجمیری

گورا رنگ جس میں سرخی کی نمایاں جھلک، بلند قامت، قوی جثہ، تیکھے نقوش، سفید ڈاڑھی، سر پر عمامہ، بر میں شیروانی، شرعی پاجامہ، سلیم شاہی جوتا ــــ یہ تھے شفاء الملک حکیم حاجی نظام الدین اجمیری، علامہ معین الدین اجمیری کے چھوٹے بھائی۔ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳ء) میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید ناظرہ حافظ محمد اسحاق باغپتی سے پڑھا۔ فارسی کے مروجہ نصاب کی تکمیل (جس میں خالق باری، نصاب خسرو، کریما، گلستان، بوستان، سکندر نامہ وغیرہ شامل تھیں۔) کے بعد درس نظامی کے ابتدائی مراحل مفتی سید احمد مجتبیٰ، مولوی نصیر احمد پھلتی، مفتی خلیل الرحمٰن وغیرہ سے طے کیے۔ پھر مولانا حکیم سید برکات احمد کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ علوم درسیہ کی ایک مرحلہ تک تحصیل کے بعد طب کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں طب کے نصاب درسی کی تکمیل کر کے دو تین سال مولانا سید برکات احمد اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا حکیم سید ابرار احمد سے طب کی عملی تربیت حاصل کی۔ ۱۳۲۶ھ (۰۶-۱۹۰۵ء) میں اجمیر میں مطب کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی نظامی دواخانہ کے نام سے ایک معیاری مرکز دوا سازی بھی جاری کر دیا اور جلد ہی اپنی خداداد صلاحیتوں اور حسن توجہ سے مطب میں مریضوں کا رجوع ہونے لگا اور بہت جلد اجمیر اور اس کے اطراف کے امراء و روساء حکیم صاحب سے رجوع کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ راجپوتانے (اب راجستھان) کی متعدد

ریاستوں کے راجا حکیم صاحب کے حلقہ مرضاء ہیں شامل ہونے لگے اور وہ صوبے کے ایک سر برآوردہ اور ممتاز طبیب سمجھے جانے لگے۔ ان کا نظامی دواخانہ بھی دیانت داری اور قابل اعتماد دواسازی کا ضامن قرار پایا۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت نے ان کی خدمت میں شفاء الملک کا خطاب پیش کیا۔

مرجع خاص و عام مطب اور ایک نیک نام دواخانے کی نگرانی میں انہماک کے باوجود، حکیم صاحب طب کی تدریس کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ چنانچہ ان کے بعض تلامذہ، خلق اللہ کی طبی خدمت میں نام ور ہوئے ان میں سرفہرست ان کے فرزند گرامی مولوی حکیم نصیر الدین ندوی، فاضل الطب والجراحت ہیں۔ اسی طرح حکیم محمد سلیم سرہندی (ماتلی، سندھ) اور مولانا حکیم محمد ہاشم مجددی مرحوم جیسے فضلاء وقت ہیں۔ اس فہرست میں یہ بے مایہ بھی شامل ہے۔ میں نے طبیہ کالج دہلی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سات مہینے حکیم صاحب سے مطب کی عملی تربیت حاصل کی۔ میں نے حکیم صاحب سے بقدر استعداد جو تمتع حاصل کیا وہی میرا سرمایہ ہے۔ فن سے ان کا عشق ہر طبیب کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ ان کا مزاج کتنا ہی برہم ہو، کتنے ہی ماندہ وخستہ ہوں، جب کوئی فنی سوال کرلیا تو موج میں آجاتے اور ہمہ تن متوجہ ہوکر تفصیل سے جواب دیتے اور میری تشفی کے درپے ہوتے۔ طبی کتابوں کا مطالعہ آخری لمحات حیات تک جاری رہا۔ اپنے فنی اور منصبی فرائض کا احساس انھیں بدرجہ تام تھا۔ ایک مریض کو واپس کردیا کہ آج مرض کی تشخیص واضح نہیں ہوسکی، کل آنا، ایک مریض کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ مرض ہمارے قابو کا نہیں ہے، ڈاکٹروں سے رجوع کرو اور پھر مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا "بیٹا! ہماری تمھاری عزت کوئی چیز نہیں ہے انسان کی جان کے مقابلے میں۔"

اسی جذبے کے زیر اثر کسی خستہ حال و بے مایہ مریض پر اسی شان سے توجہ فرماتے جس شان سے امراء و وزراء پر کرتے تھے۔ نادار مریضوں سے دوائی کی قیمت میں رعایت کرنا بھی نہیں بھولتے تھے۔

ترکیب ادویہ میں صحت اوزان پر بہت زور دیتے تھے۔ سونف اور نمک جیسے مفردات بھی ماشوں اور رتیوں سے تول کر مرکب میں شامل کرتے تھے۔ نسخے کے اجزا کا صرف اصلی ہونے

کا نہیں بلکہ ان کے اعلیٰ اور معیاری ہونے کا بھی شدت سے اہتمام کرتے تھے۔

ایک نومسلم باپ کے بیٹے تھے۔ نومسلم بڑا قوی الایمان ہوتا ہے۔ خیر القرون کا عہد نو مسلموں کا ہی قرن تھا۔ موروثی مسلمان کے مقابلے میں نومسلم کے دل میں ایمان کی قدر اور اس کی حفاظت کا جذبہ زیادہ شدید ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی قوت ایمانی کے کئی ایمان پرور واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ حق بات کہنے سے وہ بڑے نازک موقع پر بھی نہیں چوکتے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی معزز اور مقتدر شناسا سے بھی سن کر پی جانے کا انھیں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ایسے موقع پر جلال میں آجاتے اور تڑاخ سے جواب دیتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں آزاد قبائل، بھارتی فوجوں سے برسر جہاد تھے۔ ایک ہندو رئیس جو حکیم صاحب کا معتقد مریض بھی تھا اور قدیم شناسا بھی، حکیم صاحب کے پاس آیا۔ حکیم صاحب نے حسب عادت اسے تعظیم دی۔ دورانِ گفتگو اس کی زبان سے یہ بات نکل گئی کہ کشمیر میں پٹھان بہت پٹ رہے ہیں۔ اب حکیم صاحب کی شان جلال دیدنی تھی اور ان کی گرمی گفتار شنیدنی۔ وہ رئیس بار بار معذرت کر رہا ہے، اپنی بات کی تاویلیں کر رہا ہے مگر حکیم صاحب مسلسل گرج رہے ہیں اور آگ بگولا بنے ہوئے ہیں۔ حسن اتفاق سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور حکیم صاحب آتش فشانی بند کر کے گوش بر آواز ہوگئے۔ اسی زمانے میں وہ نماز خصوصاً نماز فجر کے بعد بڑے الحاح و تضرع کے ساتھ عرض کرتے تھے: ''اے اللہ! مجاہدین کشمیر و فلسطین کو فتح و نصرت عطا فرما۔''

آج بھی بار بار یہ دعا میرے کانوں میں گونجتی ہے تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ وہ ہوتے تو عراق، افغانستان شیشان وغیرہ کئی علاقوں کے مجاہدین بھی ان کی اس فہرست میں شامل ہو جاتے۔

انھیں شکار کا شوق تھا اور یہ شوق ''لت'' بن گیا تھا اور کھیلتے کھیلتے ان کو بڑی مہارت ہوگئی تھی اور قادر انداز مانے جاتے تھے۔ شکار کے دوران بعض مواقع پر وہ بڑی پرخطر صورت حال سے دوچار ہو جاتے تھے۔ انھوں نے شیر کا شکار بار ہا کیا تھا۔ ایک بار ٹھیک اس لمحے جب شیر ان کے سامنے تھا، ایک بڑے سانپ پر ان کی نظر پڑی جو ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے

اپنے ہوش وحواس برقرار رکھے اور اور سانپ کے سر پر اپنا گھٹنا رکھ کر شیر پر گولی چلا دی۔

ایک اور واقعہ بھی سننے کا ہے۔ ایک بار مہارانا اودے پور کے ساتھ جن کے وہ معالج بھی تھے، شکار کی مہم پر تھے۔ شیر سامنے آیا۔ ریاستوں میں بڑی سخت روایت ہے کہ والیٔ ریاست کی موجودگی میں اس کا کوئی ہم راہی، شکار پر گولی نہیں چلا سکتا۔ خواہ کیسا ہی نازک موقع کیوں نہ ہو والی کے حکم یا اجازت کے بغیر گولی چلانا سخت جرم تصور کیا جاتا تھا۔ مہارانا اودے پور اس باب میں کچھ زیادہ ہی حساس تھے۔ حکیم صاحب نے شیر کو دیکھتے ہی اس پر فائر کر دیا۔ ان کے اس اقدام پر سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ ریاست کی تاریخ میں یہ اپنی نوع کا پہلا حادثہ تھا۔ مہارانا کو حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا۔ حکیم صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''آپ نے یہ کیا کیا؟'' حکیم صاحب نے بے تامل جواب دیا ''شکار زد پر آ گیا تھا۔'' مہارانا یہ بے ساختہ جواب سن کر کھل اٹھا۔ وہ حکیم صاحب کا احترام بھی کرتا تھا اور خود بھی اچھا شکاری ہونے کی وجہ سے شکاری کی اس کمزوری سے واقف تھا۔ کہنے لگا: ''بات تو سچی ہے'' اور یوں یہ نازک گھڑی بآسانی ٹل گئی۔

ایک اچھے شکاری کو اپنے آلات شکار سے محبت ہوتی ہے اور ان کی حفاظت کا جذبہ بھی بڑا شدید ہوتا ہے۔ اس معاملے میں بھی حکیم صاحب بڑے محتاط تھے۔ ایک بار ان کے ایک معزز دوست بیرون اجمیر سے اجمیر آئے ہوئے تھے۔ اچانک ان کا دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بن گیا۔ رائفل ساتھ نہیں تھی۔ اس لیے حکیم صاحب کے پاس آئے اس درخواست کے ساتھ کہ اپنی خاص رائفل ایک دن کے لیے مستعار دے دیں۔ حکیم صاحب نے یہ سن کر قریب بیٹھے ہوئے اپنے فرزند سے کہا کہ اندر سے اپنی والدہ کو بلا لاؤ۔ وہ یہ حکم سن کر حیرت سے دیکھنے لگے تو حکیم صاحب نے کہا: ''میاں میرے یہ دوست رائفل مانگ رہے ہیں مگر میں اپنی رائفل نہیں دے سکتا، اپنی بیوی دے سکتا ہوں'' وہ صاحب حکیم صاحب کا یہ جواب سن کر نادم ہوئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔

حکیم صاحب کے مزاج میں مزاح اور خوش طبعی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ایک بار ایک صاحب نے ان کے فرزند حکیم نصیر احمد صاحب کے متعلق دریافت کیا تو جواب ملا کہ ''یہ والد

مرحوم کے پوتے ہیں۔'' ان صاحب کو حقیقت تک رسائی میں چند لمحے صرف ہوئے۔

ایک رئیس نے ان کو ایک رائفل دکھا کر ان کی رائے طلب کی۔ ان کے خیال میں رائفل ناکارہ تھی اس لیے فرمایا ''آب حیات ہے۔''

مطلب یہ تھا کہ اس سے کوئی جانور مر نہیں سکتا۔ ان کے مذاق سے ان کے چھوٹے بڑے، مریض اور شاگرد کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا تھا۔

حکیم صاحب کی کتاب حیات کا ایک اہم باب ان کا تعلق باللہ تھا۔ وہ ایک صحیح العقیدہ اور متوازن مسلک کے بزرگ تھے اور اس پہلو سے پورے پورے برکاتی تھے۔ نہ دیوبندی نہ بریلوی، نہ ان کے مخالف نہ ان کے۔

خواجہ بزرگ سے عقیدت بدرجہ کمال تھی مگر غلو کے شائبے سے پاک، حدود کے اندر رہ کر۔ عملاً تمام ارکانِ اسلام کے پابند، مذہب کے شیدا، ملت پر فدا، دین کی حمیت میں بڑے داعیان قیادت سے فرسنگوں آگے۔ سیاسی و ملی رہ نماؤں میں سے مولانا محمد علی جوہر سے خصوصی محبت تھی۔ مولانا کئی بار ان کے یہاں مہمان بھی رہے تھے۔ ہزاروں کے حساب سے ''ہمدرد'' کی اعانت کرتے رہتے تھے۔ تقسیم کے بعد جمعیۃ العلمائے ہند نے مسلمانوں کی جو خدمت کی اور فسادات میں ان کا جس جرات سے ساتھ دیا اس کی قدر کرتے اور اس کے مقامی کارکنوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

وہ بہت سے محاسن اخلاق و سیرت کے حامل تھے۔ ان کی ذات سے بہت سے بندگان خدا کو گوناگوں فائدے پہنچے۔ ان کا غصہ اور کدورت چھپی نہیں تھی۔ وہ بڑے عالی حوصلہ اور کشادہ دل انسان تھے۔ انھوں نے مٹھیاں بھر بھر کر خلق اللہ کی خدمت کی تھی مگر منتظم بھی تھے۔ ایک پیسہ بھی بے ضرورت خرچ نہیں کرتے تھے۔ خاصان خدا سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جوانی میں حضرت خواجہ کی درگاہ معلی میں طبیب کی حیثیت سے ملازم رہے تھے۔ پھر اس خدمت سے وظیفہ (پنشن) یاب ہوئے تو چار آنے مہینہ اپنا وظیفہ مقرر کروایا۔ اور یہ وظیفہ وصول کرنے کے لیے ہر مہینے پابندی سے درگاہ کے دفتر تشریف لے جاتے۔ اور وہاں سے چونی لے کر آتے تھے۔ مگر مزار پرستی کی ہر بدعت سے ان کا دامان اعمال بالکل پاک تھا۔

ان کا دستر خواں بہت وسیع تھا اور ان کا حکمت کدہ ہمیشہ مہمانوں سے آباد دیکھا گیا۔ان کے فرزند حکیم نصیر الدین ندوی کا حیطہ احباب بھی بکثرت اہل علم وقلم پر مشتمل تھا اور مشاہیر سیاست اور اکابر علم وفن ان کے یہاں آتے رہتے تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالسلام نیازی، جگر مرادآبادی، قاضی عبدالغفار، ماہرالقادری، مولانا مناظر احسن گیلانی، حکیم کبیرالدین وغیرہ قائدین سیاست اور ارباب ادب نظامی دواخانے میں قیام فرماتے تھے۔

طبیب کی حیثیت سے ان کے ساتھ حسن اعتقاد کا یہ عالم تھا کہ اجمیر کے ایک معزز عہدہ دار سے ایک دور میں ان کے خوش گوار تعلقات تھے بعد میں کسی وجہ سے باہم تلخی ہوگئی تھی اور آپس میں علیک سلیک تک نہیں رہی تھی۔ ایک بار وہ بیمار ہوئے اور چونکہ ہمیشہ علاج حکیم صاحب کا ہی کرتے تھے اس لیے انھوں نے حکیم صاحب کو پیغام بھیجا کہ سید احمد مریض کی حیثیت سے آنا چاہتا ہے۔ جواب ملا: ''اجازت ہے۔'' سید صاحب کمرہ مطب میں پہنچے۔ طرفین سے سلام کا تبادلہ نہیں ہوا۔ اور مریض نے بیٹھتے ہی اپنا حال کہا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی، نسخہ لکھوایا اور ہدایات دیں اور سید صاحب اٹھ کر آگئے۔ اس واقعے میں طبیب پر مریض کا عقیدہ قابل لحاظ ہے کہ ''جنگ'' کے باوجود رجوع انھیں سے ہوئے اور حکیم صاحب کی فرض شناسی بھی قابل داد ہے کہ ''دشمنی'' کے باوجود ان کے لیے اپنا دروازہ بند نہیں کیا۔

ان کے تیار کردہ مرکبات پر لوگوں کے اعتماد کا یہ واقعہ بھی عجیب ہے کہ ایک صاحب کو خمیرہ مروارید کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے حکیم صاحب کے یہاں ان کی آمدورفت بھی بند تھی۔ ملازم کو ہدایت کی کہ ''خمیرہ صرف نظامی دواخانے سے لانا، اس۔۔ (گالی)۔۔۔ سے بہتر دوا کہیں نہیں ملے گی۔''

اساتذہ کا احترام امت کی تابناک روایات میں شامل ہے۔ اور ہم نے اساتذہ کے احترام کے بہت سے نمونے دیکھے ہیں لیکن استاد کے ساتھ عقیدت اور شیفتگی میں کم سے کم میری نظر میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ مریدوں کو اپنے شیوخ کا اس طرح ادب کرتے ہوئے نہیں پایا جس طرح وہ اپنے استاد کا ادب کرتے تھے۔ ان کی حیات ہی میں نہیں، ان کے وصال کے بعد بھی اور ان کا ہی نہیں، ان کے متوسلین کا بھی، اس درجے کا کہ دیکھنے والے

متعجب ہوتے تھے۔ میں سات مہینے ان کے ساتھ ہی ایک کمرے میں رہا مگر وہ خود زمین پر سوتے رہے اور مجھے بہ جبر و اصرار پلنگ پر سلاتے رہے۔ میرا الحاح و انکار بے نتیجہ رہا اور وہ کمرے میں دوسرا پلنگ بچھوانے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

میں ایک بار مطب میں حاضر ہوا تو سروقد تعظیم دی اور ایک ہندو رئیس سے، جو ان کے پاس بیٹھے تھے یوں تعارف کروایا کہ "یہ ہمارے استاد زادے ہیں (حال آں کہ میں ان کے استاد کا پوتا ہوں) اور یہ سب کچھ انھی کا دیا ہوا ہے۔" سننے والے نے کہہ دیا کہ "یہ بھی آپ کا بڑا پن ہے۔" اس پر حکیم صاحب نے حیرت کے ساتھ پوچھا کہ "اس میں میرا بڑا پن کیا ہوا؟ یہی حقیقت ہے۔" میری شادی ہوئی تو اس لیے ان کو تعظیم دیتے تھے کہ یہ میری اہلیہ ہیں لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ حافظ محمد اسحاق بالغتی کی پوتی ہیں تو ان کے احترام میں شدت ہوگئی اور وہ براہ راست استاد زادی ہوگئیں اور بذات خود احترام کی سزاوار ٹھہریں۔

حکیم صاحب کے بڑے بھائی مولانا معین الدین اجمیری نے ایک نشست میں ایک عالم کے سوال کے جواب میں تقریر کی۔ مولانا کا جواب سن کر ان عالم نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور جب وہ عالم چلے گئے تو حکیم صاحب، جو سوال جواب سن رہے تھے، مولانا سے کہنے لگے: "اللہ غریق رحمت کرے حکیم صاحب قبلہ (مولانا برکات احمد) دو منٹ میں سمجھا دیتے تھے۔ یہاں گھنٹوں لگے جب تفہیم کا حق ادا ہوا۔"

مولانا معین الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کے اس، کسی قدر شوخ مگر صحیح تبصرے کو سن کر فرمایا: "سچ کہتے ہو۔ مولوی مدن کی سی بات کہاں سے لاؤں۔"

حکیم صاحب اٹھاسی برس کی پاک اور بے داغ بھرپور زندگی گزار کر ۱۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو اولیٰ سے اخریٰ کی طرف چلے گئے۔



ذاکر صاحب

۱۹۳۶ء کی بات ہے، ہم دونوں بھائیوں مجھے اور اختر میاں مرحوم کو جو مجھ سے دو سال چھوٹے تھے، جامعہ ملیہ میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولوی شرف الدین یاس سے ہمارے خاندانی روابط تھے۔ وہ ہمارے ہم محلّہ بھی تھے۔ وہ جامعہ کی تاسیس کے وقت سے ہی اس سے وابستہ تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین ؒ کے اٹاوہ میں استاد بھی رہے تھے، تو مولوی شرف الدین یاس کو پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم پہلے ان کے پاس لے جائے گئے پھر وہ ہمیں لے کر جامعہ کے دفتر گئے۔ پہلے وہ جامعہ کے رجسٹرار کے پاس لے گئے جو ''مسجّل'' کہلاتے تھے اور غالباً ان کا نام فیاض حسین تھا۔ دفتر میں میز کرسی کے بجائے فرشی نشست تھی۔ سادہ سا فرش اور میز کے بجائے ڈیسک۔ یہ ماحول میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔ مشرقیت، سادگی اور صفائی۔ داخلے میں کوئی مشکل نہیں تھی اس لیے دو چار منٹ میں کاغذی کاروائی ہوگئی۔ اس کے بعد بھیا (مولوی شرف الدین کو خاندان بھر میں بھیا کہا جاتا تھا) ہمیں ڈاکٹر ذاکر حسین کے کمرے میں لے گئے۔ اس کمرے کا بھی یہی رنگ تھا۔ وہی فرشی نشست، وہی سادگی اور صفائی۔ ڈاکٹر صاحب بھیا کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے جو ان کے استاد رہے تھے۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ داخلہ ہو چکا تھا مگر بھیا کا دل کب مطمئن ہوتا۔ اس لیے انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ہمارا تعارف کروایا (یہ مولانا سید برکات

احمد کے پوتے ہیں) جامعہ کے لیے یہ قابل فخر بات ہے کہ یہ یہاں آئے ہیں۔ ذاکر صاحب یہ باتیں بڑے ادب سے سنتے رہے اور جی جی فرماتے رہے۔ استاد کا ادب تھا ورنہ..........

گورا چٹا رنگ، گداز بدن، بھرا بھرا چہرہ، اس پر کالی خوش نما ڈاڑھی جو درحقیقت بہت چھوٹی مگر بھرے بھرے چہرے کی وجہ سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کھدر کا بند کرتا، پاجامہ، سر پر کھدر کی وہی ٹوپی جو گاندھی کیپ کہلاتی ہے مگر جو گاندھی جی نے کبھی نہیں اوڑھی اور حکیم اجمل خاں صاحب کی اختراع ہے۔

جامعہ کا مرکز، ثانوی مدارس اور ذاکر صاحب اور دوسرے اساتذہ کے مکانات اس دور میں قرول باغ ہی میں تھے مگر ابتدائی مدرسہ دہلی سے چند میل دور اوکھلے میں منتقل ہو گیا تھا، جہاں بعد میں جامعہ نگر آباد ہوا اور جامعہ کے تمام شعبے وہیں منتقل ہو گئے۔ جامعہ نگر کے قریب ذاکر صاحب اور دوسرے اساتذہ ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب وغیرہ نے بھی اپنے مکانات تعمیر کر لیے۔ ہمارا داخلہ ابتدائی دوم میں ہوا تھا اس لیے ہم بھی اوکھلے پہنچا دیے گئے اس وقت تک وہاں صرف ایک عمارت تعمیر ہوئی تھی جو جو ہر منزل کہلاتی تھی اور جس کے نگران چودھری اکبر علی مرحوم تھے۔

ذاکر صاحب اکثر جامعہ نگر آجایا کرتے تھے اور غالباً اکثر بے اطلاع آتے تھے۔ ایک روز علی الصباح دیکھا تو ذاکر صاحب ایک کھیت میں جو جامعہ نگر ہی کا ایک حصہ تھا، ٹہل رہے ہیں۔ اکبر علی صاحب کی نظر پڑی تو کہنے لگے اچھا ذاکر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ ذاکر صاحب جب بھی جامعہ نگر آتے کھانا وہیں کھاتے تھے۔ وہاں تمام طلبہ اساتذہ ایک ہی وقت میں ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ کھانا دسترخواں کے بجائے چوکیوں پر کھایا جاتا تھا۔ اساتذہ کی صف الگ ہوتی تھی، ذاکر صاحب جب بھی آتے تو کھانا اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔

جامعہ کی جن چیزوں نے دل پر اثر کیا اور وہ تاثر اب تک باقی ہے وہ ہے جامعہ میں مشرقیت، سادگی، سلیقہ، صفائی، اردو کا رواج۔

ایک اور چیز جو پہلے پہل جامعہ میں دیکھی تھی بلکہ بعد میں بھی کہیں اور نہیں دیکھی صرف جماعت اسلامی میں دیکھی، وہ یہ کہ کوئی شخص خود کو ووٹ نہیں دے سکتا تھا۔ ایک بار ہماری

جماعت میں کسب نمائندگی کے لیے انتخاب ہوا تو میرے مقابل کو صرف ایک ووٹ ملا تھا (جو میں نے دیا تھا) باقی تمام ووٹ مجھے ملے تھے۔

ایک اور جدت اور بڑی قابل تقلید جدت یہ تھی کہ جامعہ نگر کی تعمیر کا افتتاح پہلی جماعت کے ایک بچے نے کیا تھا۔ پہلی اینٹ اس نے رکھی تھی۔ کسی سرکاری افسر، کسی نام ور سیاسی رہنما کے بجائے ایک معصوم بچے نے۔

مشہور تھا کہ ذاکر صاحب کانگریسی ہیں۔ عملاً وہ کسی طرف بھی نہیں تھے۔ انھوں نے خود کو تعلیمی شعبے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مگر واقعتاً ان کا رجحان کانگریس کی طرف تھا۔ کانگریسی ہندو مسلم اکابر سے ان کے مراسم نسبتاً زیادہ تھے۔ خود وہ کھدر استعمال کرتے تھے، اساتذہ کی اکثریت قوم پرستانہ نقطہ نظر کی حامی تھی۔ ذاکر صاحب نے جو تعلیمی رپورٹ مرتب کی تھی (غالباً واردھا اسکیم) وہ بھی قوم پرستانہ رجحان کی حامل و ترجمان تھی اس پر مسلم لیگی حضرات کو اعتراض تھا۔ بیانات بھی دیے گئے۔ مضمون بھی لکھے گئے۔

ذاکر صاحب کی زندگی کا قابل تقلید باب اُن کا ایثار ہے۔ وہ بیسویں صدی کے ربع اول میں جرمنی سے سند لے کر آئے تھے اور ان کے لیے سرکاری ملازمت اور گراں قدر مشاہرے کے وسیع امکانات تھے مگر انھوں نے ملت کی خدمت کو ترجیح دی اور خود کو جامعہ کے لیے وقف کر دیا۔ جن چند رفقا (ڈاکٹر عابد، پروفیسر مجیب) کے ساتھ اس سفر کا آغاز کیا تھا انھوں نے طے کیا تھا کہ ہم ۷۰ روپے ماہانہ سے زیادہ مشاہرہ نہیں لیں گے۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ کے جشن سیمین کے موقع پر ذاکر صاحب نے جب یہ اعلان کیا کہ ہم میں سے کسی نے بھی آج تک پچیس سال میں پورے ستر روپے ماہانہ بھی نہیں لیے تو پورے مجمعے پر تاثر کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ان کے بعض رفقا اپنے گھر اور بعض اپنے سسرال کی اعانت سے اپنی اس قلت معاش کا مداوا کرتے تھے مگر ذاکر صاحب کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی اس لیے آپ تنگدست رہتے تھے۔ درون خانہ کے رازداروں نے کہا ہے کہ عسرت کی زندگی تھی۔ اس دور میں قرول باغ کے جس بنیے کے کئی کئی مہینے مقروض رہتے تھے اس نے صدر مملکت بننے کے بعد ذاکر صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا اور انھوں نے یہ دعوت منظور کرنا چاہی تو ایوان صدر کے عملے نے بتایا کہ آپ یہ دعوت قبول

نہیں کر سکتے۔ پروٹوکول کے قوانین حائل ہیں مگر ذاکر صاحب نے کہا کہ مجھے اس نے قرض دیا ہے۔ میں اس کا زیر بار احسان ہوں، یہ دعوت مسترد کر ہی نہیں سکتا۔ آگے کی بات یاد نہیں معلوم نہیں کیا ہوا۔

۱۹۴۶ء میں جامعہ کا جشن سیمین ہوا تھا۔ جشن کے افتتاحی جلسے میں برعظیم کے سیاسی اکابر کا ایسا اجتماع شاید پہلے کبھی ہوا نہ بعد میں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے بہت سے بڑے رہنما شریک ہوئے تھے۔ مثلاً کانگریس کے جواہر لال، راج گوپال اچاریہ جو اس وقت وزیر تعلیم تھے اور جنھوں نے تقریر بھی کی اور سالانہ اعانت کا بھی اعلان کیا، آصف علی، مولانا آزاد۔ مسلم لیگ کے قائد اعظم، فاطمہ جناح، سردار نشتر مسلم اکابر میں نواب بھوپال (صدر جلسہ)، حفیظ جالندھری (جنھوں نے نظم پڑھی)، ڈاکٹر اشرف، سید حسین۔ اس وقت تک اتنا بڑا اسٹیج بھی کوئی نہیں بنا تھا۔ (بعد میں اس سے بڑے بنے ہوں گے) مولانا آزاد اور قائد اعظم تو شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار کسی جلسے میں یک جا ہوئے ہوں۔ جواہر لال تمام قائدین سے تقریباً آدھے گھنٹے پہلے آگئے تھے۔ مولانا آزاد آئے تو اس سیاسی ہیجان کے عہد میں بھی بہت سے حاضرین نے کھڑے ہو کر استقبال کیا مگر چند ہی منٹ بعد جب قائد اعظم آئے تو ذاکر صاحب وغیرہ کے بار بار منع کرنے کے باوجود پورے مجمع نے کھڑے ہو کر والہانہ اور پر جوش نعرے لگا کر استقبال کیا۔ جلسے میں جب ذاکر صاحب نے جامعہ کے اساتذہ کی عسرت و تنگ دستی کی زندگی اور روکھی سوکھی کھا کر نونہالان ملت کی خدمت کا ذکر کیا تو نواب بھوپال جو صدر جلسہ تھے آنسو ضبط نہ کر سکے بلکہ حاضرین کی بڑی تعداد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس جشن کا ایک حصہ مشاعرہ تھا جس میں جوش، فراق، فیض وغیرہ اکابر شعراء کے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور بھی تھے (جن کو میں نے پہلی اور آخری بار کسی مشاعرے میں شریک اور پڑھتے دیکھا)۔

جشن کے دوسرے کئی اجتماع ہوئے تھے۔ مثلاً طلبائے قدیم کا جلسہ، مجلسِ مقالات وغیرہ۔ مجلس مقالات میں ڈاکٹر سید حسین (وجے لکشمی)، مولانا حفظ الرحمٰن کے نام یاد ہیں۔ مولانا عرشی نے غالباً اردو اور پشتو کے الفاظ پر مقالہ پڑھا تھا جس میں مسلسل ایسے الفاظ تھے

جن میں غ، پ، ش، ٹ تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور دوسرے کئی اہل علم جو ہمارے ساتھ سامعین کی صف میں بیٹھے تھے، کا تاثر یہ تھا کہ یہ سنانے کی چیز نہیں، چھپا ہوا پڑھنے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر سید حسین اس جشن کے ہر جلسے میں کئی روز تک نظر آتے رہے۔ وہ اس عمر میں بھی مردانہ وجاہت اور جامہ زیبی کا بھرپور نمونہ تھے۔ ایک دو بار ان کے ساتھ چند بچیاں بھی نظر آئیں۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ یہ وجے لکشمی کی بچیاں ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو پاپا کہتی ہیں (واللہ اعلم)۔ ڈاکٹر سید حسین نے اپنی انگریزی تقریر میں یہ واقعہ بیان کیا کہ میں نے قدیم مدرسہ کے ایک طالب علم سے پوچھا کہ چین کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔ تو اس نے سوال کیا کہ شہر چین در کدام ملک است، تو میں نے مایوس ہو کر یہ شعر پڑھا:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا

کار طفلاں تمام خواہد شد

میں پاک و ہند کے جن اکابر ماضی سے ابتداء عمر میں متاثر ہو گیا تھا اور یہ تاثر اب تک باقی ہے ان میں پہلا نام ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کا ہے۔ جناب ذاکر صاحب کی شخصیت میں میرے لیے جاذبیت تھی۔ گورا چٹا رنگ، بھرا بھرا بدن، دل کش خال و خد، خوشنما متوازن ڈاڑھی، علی گڑھ کاٹ پاجامہ، شیروانی جس کا کوئی بٹن کبھی کھلا نہیں دیکھا گیا۔ سر پر شیروانی کے کپڑے کی ٹوپی۔ آواز نہ پست نہ ناگواری کی حد تک بلند۔ انداز گفتگو دل نشین، لباس ہمیشہ کھدر کا مگر ہمیشہ صاف ستھرا۔ ذاکر صاحب ہی کے اثر سے جامعہ کے ماحول میں بھی کئی ایسی چیزیں تھیں جو دوسرے اداروں اور درس گاہوں میں مفقود اور کہیں کہیں تو معیوب تھیں۔ میں انھی بعض چیزوں سے متاثر ہوا ہوں۔ وہاں اُردو کا رواج تھا۔ ہر چیز کا نام اردو، ہر اصطلاح کا اردو ترجمہ، ہر شعبے میں اردو بولنے کا اہتمام اور پابندی۔ چانسلر، وائس چانسلر، پروفیسرز، رجسٹرار اسکول، کالج، ٹریننگ کالج، لائبریری کے بجائے صدر الجامعہ، شیخ الجامعہ، استاد، مسجل، ابتدائی مدرسہ، ثانوی مدرسہ، استادوں کا مدرسہ، کتب خانہ، اسی طرح ہر چیز میں انداز نشست و برخاست، طرز بود و ماند، خورد و نوش، رہن سہن میں مشرقیت کا چوکھا رنگ۔ میز کرسی کے بجائے فرشی نشست، لباس، سامان، ہر بات میں نمائش اور تصنع کے بجائے سادگی، صفائی اور سلیقہ۔

وقت کی پابندی، کھانے پینے، سونے جاگنے اور لکھنے پڑھنے ہر بات میں وقت کی پابندی، منٹ کے حساب سے۔ کئی بار دیکھا کہ کوئی جلسہ ہے، ڈاکٹر صاحب چند منٹ پہلے پہنچے مگر ہال میں داخل ہونے کی بجائے باہر کھڑے رہے۔ ٹھیک وقت پر داخل ہوئے اور جلسے کا آغاز کر دیا۔

یہ باتیں ۱۹۴۶ء تک کی جامعہ کی تھیں پھر سننے میں آتا رہا اور دو ایک بار خود بھی جامعہ کی سیر سے اندازہ کیا کہ ذاکر صاحب کا عہد لد گیا اور جامعہ اتنی تبدیل ہو چکی ہے کہ خود مجھ سے اس کی تصویر پہچانی نہیں جاتی۔

ہاں ذاکر صاحب آخر تک ذاکر صاحب ہی رہے۔ بنیے کا واقعہ آپ سن ہی چکے کہ اس کی دعوت قبول کرنے پر مصر تھے۔ بہار کی گورنری کے زمانے میں ان کے انکسار اور خلوص کا وہی عالم رہا۔ پٹنے میں چند اہل علم مسلمانوں کو عید کے دن بیٹھے بیٹھے سوجھی کہ چلو ذاکر صاحب سے عید ملیں۔ گورنر چاہیں تو مل لیں گے۔ ورنہ صدا لگا کر لوٹ آئیں گے۔ وقت مناسب نہیں رہا تھا مگر بلا لیا، ملے اور خوب ملے، دیر تک بٹھایا، باتیں کرتے رہے۔ مولانا شاہ اسماعیل مرحوم خدابخش لائبریری کے اسکالر نے مجھے یہ واقعہ سنایا، وہ اس جماعت میں شریک تھے۔



مولانا محی الدین غازی اجمیریؒ

مولانا معین الدین اجمیری کے چھوٹے بھائی، جنگ آزادی کے نام ور سپاہی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے رفیق طریق، آل انڈیا خلافت کمیٹی کے جنرل سیکرٹری، ایک شعلہ بیان مقرر، قدیم علوم کے ذہین و فطین فاضل، مصطلحات علوم وفنون جیسی معتبر و مفید کتاب کے مصنف۔ غازی صاحب ۱۸۹۶ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مولوی عبدالرحمان، والیٔ ریاست کے سکتر (سیکرٹری) تھے۔ فارسی کا ابتدائی نصاب مدرسہ خلیلیہ کے مدرسین سے مکمل کیا پھر وہ مولانا سیّد برکات احمد کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ جہاں مولانا کے فرزند (میرے والد) مولانا حکیم سیّد محمد احمد، مولانا مناظر احسن گیلانی مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی وغیرہ ان کے رفیق درس تھے، متوسطات تک کتب یہاں پڑھ سکے تھے کہ ان کا خاندان ٹونک سے اجمیر منتقل ہو گیا اس لیے ان کو بھی اجمیر جانا پڑا اور وہ اپنے بڑے بھائی مولانا معین الدین سے درسیات کی تکمیل کرنے لگے اور اکیس سال کی عمر میں ۱۹۱۷ء میں سند فراغ حاصل کی۔ مولانا معین الدین نے انہیں تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد تدریس کی ذمہ داری سونپ دی اور انھوں نے کچھ مدت مدرسہ معینیہ عثمانیہ (اجمیر) میں درس دیا۔

اتفاق سے یہ ٹھیک وہی دور تھا جب برعظیم کے عوام کی جنگ آزادی شباب پر آئی ہوئی تھی اور انگریزی حکومت کی ملازمت ترک کرنے اور عدم تعاون کی تحریکیں ملک کے گوشے

گوشے میں شروع ہوگئی تھیں۔ مولانا معین الدین، قائدین جنگ آزادی کی صف اوّل میں تھے ان کا فتویٰ حرمت ملازمت برطانیہ شائع ہو چکا تھا ان حالات میں اس گرم خون نوجوان سے درسگاہ کے گوشے میں معتکف رہنا ممکن نہ رہا اور وہ میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ مسلسل دورے، باغیانہ تقریریں اور سیاسی اجلاسوں میں شرکت، غرض مولوی غازی محی الدین اب مدرس سے ایک سیاسی راہ نما بن گئے اور اس میدان میں آگے بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان کی تنظیمی صلاحیت، سیاسی بصیرت، جرأت و بلند ہمتی اور طلاقت لسانی کو دیکھ کر مولانا شوکت علی انھیں اپنے ساتھ بمبئی لے گئے اور رفتہ رفتہ خلافت ہاؤس (خلافت کمیٹی کے مرکزی دفتر) پر انھیں کلی اقتدار حاصل ہوگیا، پھر کچھ دن بعد وہ کل ہند مجلس خلافت کے جنرل سیکرٹری بھی ہو گئے اور سن سینتالیس تک وہ اس منصب پر فائز اور اس کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے۔ ملی و ملکی سیاسیات میں اس انہماک کے نتیجے میں وہ تدریس اور علمی مشاغل سے یک سر بے تعلق و غافل ہو گئے اور ان کے تمام احباب اور نیاز مند درس گاہ اور علمی ماحول میں ان کی واپسی سے کلیۃً مایوس ہو کر یہ گمان کر بیٹھے کہ وہ تعلیم و تعلم کے ماحول سے پوری طرح بے گانہ ہو چکے اور حاصل کردہ علوم و معارف ان کی لوح حفظ سے یک سر محو ہو چکے ہیں اور یوں ان کی اور ان کے اساتذہ کی جدو جہد رائگاں گئی اور مدرسے کی دنیا ایک ممتاز مدرس سے محروم ہوگئی اور مکتبہ خیرآباد ایک ذکی و ذہین و فطین عالم اور معلم کو کھو بیٹھا مگر انقلاب چرخ گرداں کی ایک موج ایسی آئی کہ غازی صاحب کو سیاسی مشاغل میں انہماک نہیں رہا اور رفتہ رفتہ وہ میدانی سرگرمیوں سے کنارہ گیر اور بیزار ہو کر خانہ نشین اور عزلت گزیں ہو گئے مگر نچلا بیٹھنا ان کی افتاد مزاج کے خلاف تھا۔ سیاست کی وادی سے جو نکلے تو سیدھے مدرسے کا رخ کیا یہ ان کا جانا پہچانا ماحول تھا وہ مدرسے سے مانوس نکلے اور مدرسہ ان سے:

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

ان کا سابقہ پہلے ہی دن جس عقیدت پسند اور نیاز مند سے پڑا اس نے ان کے ہاتھ میں معقولات کی ایک کتاب تھما دی "الہدیۃ السعیدیہ فلسفہ" یہ نام انہیں آشنا سے لگے پھر انھیں خیال آیا کہ اس چمن زار کی گل گشت کا کسی زمانے میں، نصف صدی پہلے انھیں اتفاق ہوا تھا

پھر ان عقلی مباحث کے کچھ نقوش ان کی لوح حفظ پر اُبھرے، پھر دورانِ تعلیم کے بعض علمی معرکے یاد آئے، پھر اساتذہ کی تقاریر درس بے ساختہ ان کی زبان پر جاری ہوگئیں اور اب یہ حال ہوگیا کہ وہ مجھ سے ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کتاب لے لے کر مطالعہ کرتے چلے گئے اور انھیں معلومات منسیہ کا استحضار ہوتا گیا اور عقلیات اور کلام کی کتابوں کے مطالعے کا ذوق اور ولولہ بڑی تیز رفتاری سے بڑھتا گیا اور رفتہ رفتہ ان کی تمام دلچسپیاں ائمہ و قدمائے فلاسفہ و مناطقہ کے صحائف پر مرکوز ہوگئیں۔ حکمت کی تمام انواع طبیعی، مابعد الطبیعی، کلام، تصوف وغیرہ کی اکثر نصابی کتابوں پر ایک ایک نگاہ ڈال کر انھوں نے اپنی معلومات کو تازہ اور اساتذہ کی تقاریر درس کو دوبارہ یاد کرلیا۔ اس عمل میں چند ہفتے تو کٹھن گزرے مگر وہ اقویائے حفظ کے ایک خاندان کے فرد تھے۔ ان کے دونوں نام ور اور فاضل بھائی ان کے برادر زادۂ عزیز مولوی حکیم نصیر الدین ندوی حفظ و تذکر کی قوتوں میں امثال و اقران سے ممتاز ہیں۔ انھیں بھی قدرت نے بے انتہا قوی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ اس حافظے نے سیاست سے علم کی طرف مراجعت میں ان کی اعانت و ہمت افزائی کی اور وہ بہت جلد اس پر آمادہ کرلیے گئے کہ فضلاء خیر آباد کی بعض کتابوں کے اُردو تراجم کی ذمہ داری قبول کرلیں اس دور میں اقبال اکادمی کراچی ہی میں تھی۔ اور اس کے ڈائریکٹر بشیر احمد ڈار مرحوم تھے جو خود بھی فلسفے کے فاضل تھے اور اہل قلم کے قدر شناس اور مرتبہ داں تھے۔ ساتھ ہی انھیں اس نازک مزاج طبقے سے معاملہ کرنے کا سلیقہ خوب آتا تھا، چنانچہ غازی صاحب کو ہدیۃ السعیدیہ کے اُردو ترجمے کی ذمہ داری قبول کرلینے پر راضی کر ہی لیا گیا اور انھوں نے کسی قدر تامل اور تذبذب کے ساتھ اقرار کرلیا لیکن بہت جلد چند صفحات کے ترجمے کے بعد ان میں خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا ہوگئی بلکہ اس سفر کی چند منزلیں طے کرلینے کے بعد تو ادعائے تفرد تک نوبت پہنچ گئی۔ بہر حال انھوں نے اقبال اکادمی کے لیے پہلے ہدیہ سعیدیہ کا مکمل اُردو ترجمہ بڑی حد تک صحت کے ساتھ اور رواں سہل زبان میں کر ڈالا اور اس کے بعد اپنے استاد مولانا برکات احمد کی کتاب ''المعارف الالھیۃ'' کے ترجمے کا آغاز کردیا پانچ سو صفحات کی یہ کتاب مولانا کی آخری تصنیف ہے جس پر وجود کے موضوع پر عارفانہ اور مجتہدانہ گفتگو کی گئی ہے اور فلاسفہ کے ہر گروہ مشائیہ اور اشراقیہ کے

مسالک کورد کر کے صوفیائے کرام کے مسلک کی توفیق وتائید وتصویب کی گئی ہے۔ غازی اس مرحلے سے بھی بخیر وخوبی گزر گئے۔ یہ ترجمہ بھی انھوں نے اقبال اکادمی کی فرمائش پر کیا تھا جس کا انھیں معاوضہ بھی ملا تھا۔ اسی دوران انھوں نے اقبال ریویو (اب اقبالیات) میں بعض فلسفیانہ مباحث و مسائل پر مقالات بھی لکھے جن میں مسئلہ زمان پر ان کا مقالہ ایک مستقل رسالے کی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ اقبال ریویو کے علاوہ فاران (کراچی) الجامعہ (جھنگ) ہمدرصحت (کراچی) وغیرہ میں بھی ان کے وقیع وفاضلانہ مقالات شائع ہوتے رہے۔

آخر میں انھوں نے مختلف علوم وفنون خصوصاً عقلیات کی اصطلاحات کی معتبر ومستند اور قابل فہم اور سلیس زبان میں تشریح وتوضیح کا منصوبہ بنایا اور تقریباً پچاس فنون کی تقریباً چار ہزار اصطلاحات کی تشریح وتوضیح پر ایک منفرد اور ہر پہلو سے قابل اعتماد کتاب مرتب فرمائی جو انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی نے شائع کی ہے اور اب اہل علم کے ایک اہم ماخذ کے طور پر مستعمل اور متداول ہے۔

مولانا غازی محی الدین اجمیری چوہتر سالہ ہنگامہ آرا سیاسی اور علمی زندگی گزار کر ۱۵۔ اپریل ۱۹۷۰ء کو تھک کر لیٹ گئے اور ٹونک کے اس مولود کو کراچی کی زمین کے سپرد کر دیا گیا۔



مولانا حکیم علاء الدین صدیقی پھلتی

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نسل کے کچھ حضرات حجاز سے آ کر سدھور (ضلع بارہ بنکی، یوپی) میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے اخلاف میں سے ایک بزرگ شیخ احمد بن یوسف تھے جن سے تلمذ کی سعادت سلطان سکندر لودھی (ف ۱۵۱۶ء) کو حاصل ہوئی اور بارہہ کے علاقے میں انھیں جاگیر پیش کی گئی۔ اس طرح یہ خاندان پورب سے نواح دہلی منتقل ہو گیا۔ پھلت (ضلع مظفر نگر، یوپی) دھلی سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ قریہ ان اخیار کا مرکز قرار پایا۔ شیخ احمد بن یوسف کے اخلاف میں سے ایک بزرگ شیخ محمد تھے، (ف ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء) جو شاہ عبدالرحیم دھلوی کے مرید و شاگرد بھی تھے اور خسر بھی، انھی کی صاحب زادی فخر النساء کے بطن سے شاہ ولی اللہ محدث دھلوی پیدا ہوئے تھے۔ شیخ محمد کے صاحب زادے شاہ عبید اللہ (ف ۱۱۵۰ھ/ ۷-۱۷۳۸ء) جو شاہ ولی اللہ کے ماموں بھی تھے اور خسر بھی، انھی عبید اللہ کی ساتویں پشت میں مولانا علاء الدین صدیقی تھے۔

مولانا ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں پھلت میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پھلت میں پائی، پھر بھوپال بھیجے گئے، جہاں ان ایک قریبی عزیز اور ولی اللہی مکتب فکر کے ایک موقر علم بردار قاضی محمد یحییٰ پھلتی قاضی القضاۃ تھے۔ قاضی صاحب سے کچھ عرصے استفادے کے بعد مولانا ٹونک پہنچا دیے گئے، جہاں انھوں نے مولانا حکیم سید برکات احمد سے علوم عقلیہ ودینیہ کی

تکمیل کی اور طب کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا علاء الدین نے مفتی نور الحق (شاگرد شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی) سے سند حدیث حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں مولانا کا عقد ہو گیا اور ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں مولانا نے پہلی بار حج وزیارت کا فریضہ ادا کیا۔ وطن واپسی کے بعد آپ نے پھلت کی مسجد میں امامت اور اسی مسجد کے مدرسے میں تدریس کی ذمہ داری قبول کی جو پچاس سال سے زیادہ مدت تک بے مزد انجام دیتے رہے۔ سنہ ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۸ء) میں آپ ہجرت فرما کر لاہور تشریف لے آئے جہاں آپ کے فرزند گرامی پہلے ہی منتقل ہو چکے تھے۔ ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں وصال فرمایا:۔

مولانا علاء الدین کی زیارت کی سعادت تو خاک سار کو اگرچہ صرف دو بار ۱۹۴۲ء اور ۱۹۵۱ء میں حاصل ہوئی تھی لیکن ان کے حسن اخلاق و معاملت کے متعلق بکثرت ثقہ و متعدد احباب اور اعزہ کی روایات کے علاوہ خود مجھے ذاتی تجربہ بھی حاصل ہوتا رہا کیوں کہ پھلت اور اس کے اطراف (ننگلی، من پھوڑا) میں ہماری جو خاندانی زمینداری تھی، والد مرحوم کے وصال (۱۹۴۲ء) کے بعد اس کا انتظام و انصرام مولانا مرحوم نے خالصتاً لوجہ اللہ قبول فرما لیا تھا۔ جسے ۱۹۵۲ھ تک مسلسل بیس سال بطیب خاطر نباہتے رہے۔ تا آں کہ زمینداریاں منسوخ ہو گئیں۔

مولانا علاء الدین کے متعلق میں بے شائبہ مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ وہ اپنے تدین، تقویٰ، خشیت الٰہی اور حسن اخلاق و معاملت کی بناء پر عہد رفتہ کے اخیار و ابرار کا نمونہ تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف دو حضرات ایسے دیکھے ہیں۔ ان دو میں سے ایک مولانا علاء الدین تھے، جن کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ ہم میں سے نہیں، ہمارے دور کے نہیں ہیں بلکہ کسی تذکرۃ الاولیا کے اوراق سے باہر نکل آئے ہیں۔ ہم جن اتقیا و اصفیا کے تراجم و سوانح تذکروں میں پڑھتے رہے ہیں ان کو اس جہاں آب وگل میں چلتا پھرتا دیکھ لیا اگر مولانا علاء الدین کو دیکھ لیا۔ میں نے مولانا کو دیکھ کر، پرکھ کر، برت کے یہ رائے قائم کی ہے۔ زندگی کے ہر ہر شعبے میں، ہر ہر موقعہ پر، ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کے سلسلے میں بھی سنت نبوی کے اتباع کا اہتمام بڑے ذوق وشوق سے فرماتے تھے اور بڑے سے بڑے نقصان اور آزار کا اندیشہ اور اپنے اور اپنی

اولاد کو ہزاروں لاکھوں کے نفع کا لالچ بھی انھیں غلط اور خلاف واقعہ بات کہنے پر آمادہ نہ کر سکا اور عبادات ہی نہیں معاملات میں بھی قرآن وسنت کے احکام کی پیروی کرتے تھے اور خودان کے ہم قریہ، اعزہ اور اہل معاملہ اس پر متفق اللسان ہیں کہ ہمیں بہت سے اوامر ونواہی کا علم ہی مولانا کے عمل اور اجتناب سے ہوتا تھا۔



مولانا حکیم سید احمد حسین برکاتی

ابن مولانا سید خلیل الرحمٰن، ولادت ۱۹۰۷ء، مولد ادکھدی ضلع مونگیر (بہار)۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں پائی۔ پھر مدرسہ حمیدیہ در بھنگہ میں مولانا مقبول احمد خان مرحوم سے کچھ روز تحصیل کی۔ وہاں سے ٹونک پہنچے اور مولانا برکات احمد اور ان کے فرزند مولانا حکیم سید محمد احمد سے علوم دینیہ اور طب کی تحصیل کی۔ ۱۹۲۵ء میں فراغت کے بعد ٹونک ہی میں برکاتی دواخانہ کے نام سے مطب اور دواخانہ جاری کر دیا۔ استاد محترم کی وفات (۱۹۲۹ء) تک ٹونک ہی میں رہے۔ ۱۹۲۹ء میں لکھنوء پہنچے جہاں تکمیل الطب کالج میں استاد کلیات کی ضرورت تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ انھیں مولانا برکات احمد سے نسبت تلمذ ہے، حکیم عبدالحکیم صاحب نے ان کا تقرر کر دیا۔ اور حکیم احمد حسین صاحب نے بھی اس نسبت کا بھرم رکھا اور بڑی شان سے تدریس کر کے اپنے خاندان علمی کا پرچم بلند کیا۔ تکمیل الطب کالج کے اس عہد شباب میں وہاں فن داں اور فاضل اطباء کا اجتماع تھا۔ حکیم صاحب نے اپنی محنت وریاضت اور ذہانت وذکاوت سے نوعمری کے باوجود اپنا مقام پیدا کیا اور متعدد علمی معرکے سر کیے۔ ۸،۷ سال کے بعد گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے استاد ہو کر اپنے صوبے میں پہنچ گئے اور وہاں، ۱۲/۱۱ بارہ سال مصروف افادہ رہے۔ تقسیم وطن کے بعد ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) منتقل ہو گئے، جہاں تدریس کا سلسلہ تو جاری نہ رہا، صرف مطب پر توجہ رہی اور ان کا

مطب مرجع خواص ہو گیا۔ اکابر سیاست اور مقتدر حضرات ان کے زیرِ علاج رہتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں حکومت پاکستان نے جو طبی بورڈ بنایا تھا اس میں مشرق کی طرف سے حکیم صاحب بھی نامزد ہوئے تھے، کئی سال اس بورڈ کے رکن رہے اور اس کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لاتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں مشرق میں مقیم بہاری مسلمانوں پر بنگالی بھائیوں نے جو مشق مظالم کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے نتیجے میں ان کے اہل وعیال مشرق چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کوئی خلیجی ممالک کی طرف نکل گیا، کوئی مغرب میں پناہ لینے چلا آیا۔ مگر حکیم صاحب ڈھاکہ کے تانتی بازار کے جس مکان میں مقیم تھے اس سے نہیں نکلے۔ مقامی حضرات ان کے معتقد تھے۔ ایک مرحلے پر انھوں نے بھی مشورہ دیا کہ شرپسندوں پر ہمارا اقتدار نہیں ہے اس لیے آپ کہیں چلے جائیں مگر حکیم صاحب نے موت کے خوف سے ترک سکونت گوارا نہیں کیا اور اسی مکان میں ۱۹۷۳ء میں وصال فرمایا۔

حکیم صاحب کی شخصیت بڑی باوقار تھی، پاکستان میں اکابر اطباء میں ان کا ایک ممتاز مقام تھا، خیر آبادی خاندان کا تیکھا پن انؑ میں تھا۔ ظاہر کے اہتمام کا بھی شوق تھا، صاف ستھرا اور اعلیٰ لباس پہنتے تھے۔ معیار زندگی بلند تھا اور وہ آن بان سے رہتے اور وزراء امراء سے بھی تمکنت کے ساتھ معاملہ کرتے تھے۔ ہمیشہ سے دین داری اور اوراد و وظائف کا التزام تھا مگر آخر میں کلام اللہ کی تلاوت میں دن کا بیش تر حصہ صرف کرتے تھے۔

قلم رانی کی طرف زیادہ رجحان نہ تھا، ان کی قلمی یادگاریں چند ہی ہیں۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں تسہیل المعالجہ کے نام سے اصول علاج پر ایک کتاب، امراض صدر و ریہ پر ایک کتاب، مطب برکاتی کے نام سے معمولات مطب، یہ تین کتابیں طب کے موضوع پر لکھی تھیں، طبی میگزین کراچی میں ان کے چند طبی مقالات بھی شائع ہوئے تھے۔ علاج الاشتراکیہ بالحکمۃ الاسلامیہ کے نام سے دینی سیاسیات پر ایک مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔

ٹونک سے جانے کے بعد مرکز سے ہمیشہ رابطہ استوار رکھا، والد مرحوم سے اور ان کے بعد مجھ سے مراسلت رکھتے تھے، اپنی ہر تالیف پہلے مرکز (برکات منزل) میں پیش کرتے تھے،

مجھے انھوں نے گود میں کھلایا تھا۔ وہ مجھے میرے بچپن اور اپنے قیام ٹونک کے واقعات بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ایک قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ فرمانے لگے ٹونک میں طالبعلمی کا زمانہ تھا، ہاتھ تنگ تھا، عید آ گئی۔ میں نے اور میرے ایک رفیق درس (مولانا حکیم ابو سہیل برکاتی مرحوم) نے طے کیا کہ عید منانے کا تو سرو سامان ہے نہیں چلو عید کے دن پہننے کے لیے کپڑے تو دھولائیں، چنانچہ ہم دونوں ایک تالاب پر گئے، ہم لوگ کپڑے دھو کر خشک کر رہے تھے کہ کنارے پر ایک سکہ پڑا نظر آیا جس کو ہم نے پیسہ سمجھا اور اسی کو غنیمت جانا لیکن جب اسے ہاتھ میں لیکر گرد و غبار سے صاف کیا تو وہ ٹونک کا مقامی روپیہ نکلا جو ایک تولا خالص چاندی کا ہوتا تھا، میں نے فرط مسرت سے چیخ کر اپنے ساتھی سے جو تالاب میں نہا رہا تھا کہا کہ ابو سہیل! جلد آ جاؤ عید ہو گئی اور جب اسے تفصیل بتائی تو وہ بھی خوشی سے رقص کرنے لگا۔ نادار اور بالکل تہی کیسہ انسان کے لیے ایک روپیہ کی بھی بڑی قیمت واہمیت تھی چنانچہ ہم دونوں نے اس روپے سے بڑے ٹھاٹھ سے عید منائی۔ فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رزق میں فراخی عطا فرمائی اور میں نے کار خریدی اور اس میں پہلی بار بیٹھا تو مجھے اپنی بے مایگی اور بے سرو سامانی کی وہ ایک روپے والی عید بہت یاد آئی۔

اپنے فن (طب) سے انھیں جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ جنرل اعظم خان جو ایوب خانی مارشل لاء کے دور میں مشرقی پاکستان کے گورنر اور مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر تھے، ایک بار حکیم صاحب کے زیر علاج رہے اور ان کے عوارض کا ازالہ حکیم صاحب کے علاج سے ہو گیا۔ جنرل نے جب حکیم صاحب سے دواؤں کا بل طلب کیا تو حکیم صاحب نے یہ شرط عائد کی کہ دواؤں کی قیمت، اپنی جیب سے نہیں بلکہ سرکاری خزانے سے دلوائی جائے، جنرل نے حکم دے دیا کہ حکیم صاحب کو رقم سرکاری خزانے سے ادا کی جائے، لیکن اے جی پی آر (اکاؤنٹ کے محکمے) نے یہ بل قبول کرنے اور رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارے یہاں تو طب اور اطبا کی کوئی مد ہی نہیں ہے، چنانچہ جنرل نے حکیم صاحب سے

درخواست کی کہ آپ اپنا نذرانہ میری جیب سے ہی قبول فرمالیں مگر حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں دواؤں کی قیمت وصول کروں گا تو صرف سرکاری خزانے سے وصول کروں گا۔ جب یہ حقیقت ہے کہ طب اس ملک میں رائج ہے اور یہاں کے عوام اور حکام طبی علاج سے استفادہ کرتے ہیں تو پاکستان کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے یہاں ایسی کوئی مد کیوں نہیں ہے؟ آپ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں، حکماً اس کی گنجائش نکالیے۔ مہینوں یہ کشمکش جاری رہی تھی، انجام یاد نہیں رہا کہ کیا ہوا تھا؟

☆......☆......☆

محمد یوسف صدیقی

سید احمد رائے بریلویؒ نے جب ۱۸۱۸ء میں جہاد کے لیے بیعت لینے کا آغاز کیا تو ان کے ہاتھ پر ابتدائی دنوں میں جن حضرات نے بیعت کی ان میں حافظ وجیہہ الدین بھی تھے۔ پھر سید صاحب ۱۸۲۴ء میں سرحد پہنچ گئے۔ پھر جب ۱۸۳۱ء میں سید صاحب اور کئی اکابر رفقاء بالاکوٹ کے ایک معرکے میں سکھوں کے ہاتھوں مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے تو جماعت مجاہدین کے بقیۃ السیف مجاہدین اگرچہ پست حوصلہ ہو گئے تھے مگر کسی پیمانے پر جہاد کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۳۵ء میں جب شیخ ولی محمد پھلتی، بی بی صاحبہ (اہلیہ سید احمد شہید) کو لے کر سندھ گئے تو حافظ وجیہہ الدین بھی سندھ منتقل ہو گئے۔ ۱۸۳۶ء میں ٹونک کے نواب وزیر الدولہ نے سندھ میں مقیم مجاہدین اور سید صاحب کے اہل خانہ کو ٹونک آنے کی دعوت دی۔ اس دعوت نامہ کے مخاطبین میں شیخ ولی محمد پھلتی کے علاوہ حافظ وجیہہ الدین اور مولوی خیر الدین شیر کوٹی شامل تھے۔ چنانچہ یہ پوری جماعت سندھ سے نقل مکانی کر کے ٹونک پہنچ گئی۔

حافظ وجیہہ الدین باغ پت (ضلع میرٹھ) کے ایک صاحب ثروت اور دینی گھرانے کی رکن تھے۔ ان کے ایک بزرگ قاضی عبد الصمد اکبر کے عہد میں بغداد سے برعظیم آئے۔ ان کے اخلاف سے قاضی عبد الحی اورنگزیب عالم گیر کے زمانے میں قضا کے منصب پر فائز تھے اور انھیں میرٹھ کے قصبات باغ پت، رٹول اور کوتانہ میں جاگیریں دی گئی تھیں۔ حافظ صاحب

نے جب سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو نوعمر تھے اور ایک خاتون سے ان کی نسبت بھی طے ہوگئی تھی۔ مگر وہ سب سے دامن جھاڑ کر جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور کئی سال سرحد اور کشمیر کے میدانوں اور پہاڑوں میں سربکف اور تیغ بدست، سکھوں سے نبرد آزما رہے۔ ایک محاذ پر دشمن کی گولی سے مجروح گر پڑے تھے اور رفقا سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ایک بھٹیارن نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان کا صافہ اتار کر اس کا ایک حصہ جلایا اور پہلو کے بہتے ہوئے زخم میں بھر کر باقی حصے کی پٹی باندھ دی۔ یہ زخم تو مندمل ہوگیا تھا تاہم آخر تک اس کا نشان باقی تھا۔

ٹونک میں نواب مرحوم نے اس قافلے کا بڑا اکرام کیا۔ سید صاحب کے اہل خاندان کو ان کی اہلیت اور استحقاق کے مطابق مناصب دیے گئے۔ حافظ صاحب کو سرکاری توشہ خانے کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ پھر نواب وزیرالدولہ کے وصال کے بعد نواب محمد علی خان تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اس منصب کے ساتھ انھیں اپنے ولی عہد ابراہیم علی خان کا اتالیق بھی منتخب کیا۔

حافظ صاحب نے قیام سرحد کے دوران میں عقد کرلیا تھا۔ ان خاتون کے بطن سے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہوئے۔ ان میں ایک لڑکے کا نام محمد اسحاق تھا جو حافظ قرآن کریم بھی تھے اور عربی فارسی کے تعلیم یافتہ بھی۔ جوان ہونے پر انھیں سرکاری اسلحہ خانے کا افسر بنا دیا گیا تھا۔ حافظ اسحاق کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر تھیں۔ فرزند کا نام حافظ محمد یحییٰ تھا۔ ان کی اولاد میں صرف ایک دختر امتہ الحبیب ہیں جو خاکسار محمود احمد کی رفیقہ حیات ہیں۔

حافظ صاحب کا دوسرا عقد ٹونک میں ہوا۔ یہ عقد ان کی سابقہ منسوبہ کی بیٹی سے ہوا تھا۔ جب حافظ صاحب کے سرحد سے آنے کی خبر باغ پت پہنچی تو ان خاتون نے، جن سے سرحد جانے سے پہلے ان کی نسبت طے ہوئی تھی، حافظ صاحب کو خط لکھا کہ آپ کے جہاد کے لیے چلے جانے کے بعد والدین نے یہ نسبت فسخ کر کے میرا عقد دوسری جگہ کر دیا تھا مگر میرے دل کو اس کا ملال تھا کہ آپ جیسے غازیوں اور مجاہدوں سے رشتہ میرے نصیب میں نہیں تھا۔ اب میں نے آپ کی واپسی کی خبر سنی تو یہ خلش تازہ ہوگئی ہے۔ اس خلش کا علاج میری سمجھ میں آتا ہے کہ آپ سے درخواست کروں کہ آپ میری لڑکی سے، جو ماشاء اللہ جوان ہے، عقد قبول فرما لیں۔ حافظ صاحب نے ایک نیک دل خاتون کی یہ پیش کش بخوشی منظور کر لی اور اس طرح

حافظ صاحب کا ان کی سابقہ منسوبہ کی دختر سے عقد ہو گیا۔ ان اہلیہ سے حافظ صاحب کے ایک فرزند کا نام محمد یعقوب تھا۔ انھوں نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم اور عربی کی متوسطات تک تعلیم حاصل کی تھی اور ابتدا میں یہ مولانا حکیم برکات احمد کے ہم درس بھی رہے تھے۔ پھر یہ ریاست کے ایک اہم عہدے پر متعین ہوئے جس کو ٹونک میں داروغہ کہا جاتا تھا۔ محمد یعقوب صاحب ایک نیک نام اور متدین شخص اور بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے اکلوتے فرزند محمد یوسف صدیقی صاحب تھے۔

محمد یوسف صدیقی ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ ان کے صاحب ثروت والد نے ان کی تعلیم کے لیے مشہور عالم اور مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی کو اپنے ہی گھر پر ٹھہرا لیا تھا۔ مولانا گیلانی اسی سال مولانا حکیم برکات احمد کی درس گاہ سے فارغ ہوئے تھے اور دارالعلوم خلیلیہ میں مدرس رکھ لیے گئے تھے۔ پھر یوسف صاحب کو جدید تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا گیا اور ۱۹۱۸ء میں انھوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سائنس کے شعبے میں داخلہ لیا مگر ملک میں ترک موالات کا ہنگامہ گرم ہوا اور مولانا محمد علی جوہر نے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو بھی ترک موالات کی دعوت دی کہ یہ بھی سرکاری ادارہ تھا۔ اس دعوت پر یونیورسٹی کے جن ۱۲۶ طلبہ نے ذاکر حسین (بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور صدر جمہوریہ ہند) کی قیادت میں یونیورسٹی کا مقاطعہ کیا، ان میں یوسف صاحب بھی شامل تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے مقابلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنا رکھی گئی اور کرائے کے خیموں میں ان ۱۲۶ طلبہ کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا مگر ان سیاسی سرگرمیوں میں یوسف صاحب کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہ نواب صاحب ٹونک کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور اپنی خداداد دماغی اور عملی صلاحیتوں کے سہارے رئیس وقت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرتے چلے گئے اور معتمد الملک اور سعید جنگ کے خطابات بھی حاصل کیے مگر ۱۹۳۶ء میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور انھوں نے تجارت اور زراعت پر توجہ مبذول کر دی اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اس کام میں بڑی ترقی کی۔ ۱۹۴۲ء میں وہ جماعت اسلامی کی رکنیت حاصل کر کے اقامت دین کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ جماعت کی کئی اہم ذمہ داریاں انھیں دی گئیں۔ تقسیم کے بعد انھیں جماعت کے مرکز نے دلی

میں مستقبل قیام کی دعوت دی اور وہ اپنے وسیع کاروبار کو اپنے کم عمر اور زیر تعلیم بچوں پر چھوڑ کر دلی منتقل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے لیے، پہلے ایک انگریزی اخبار جاری کیا۔ اس کا نام ریڈینس (Radiance) تھا۔ اس میں ان کے مدبرانہ اور بے باکانہ اداریوں سے وہ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کو درپیش مسائل اور مشکلات کی طرف مسلم رہنماؤں اور حکومت کو متوجہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک اور قدم اٹھایا اور بھارت کی مسلم جماعتوں کے متحدہ محاذ کی تجویز پیش کی۔ اس کے نتیجے میں ایک کل ہند مجلس مشاورت تشکیل دی گئی اور یوسف صاحب کو بالاتفاق آراء اس مجلس کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ پھر انھوں نے بھارت کے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ انھیں مشرق وسطی کے مسلمانوں کے مسائل اور مصائب سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے چنانچہ کل جماعتی سطح پر ایک کل ہند فلسطین کانفرنس کا قیام عمل میں آیا اور شیخ عبداللہ (کشمیر) اور ڈاکٹر سید محمد (بہار) کی تجویز سے یوسف صاحب کا انتخاب اس کانفرنس کے جنرل سیکرٹری کے لیے ہوا اور اسی حیثیت میں وہ ۱۹۷۴ء کے رابطہ عالم اسلامی کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ اور پھر ۱۹۷۶ء کے اجلاس میں بھی انھیں مدعو کیا گیا مگر بھارت کی حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

بھارت کی مسلم اقلیت کے قومی و دینی مفادات کی مستقبل قلمی اور عملی جدوجہد کے نتیجے میں وہ حکومت کی نظر میں ملک کی ایک خطرناک شخصیت قرار پائے اور کئی بار قید و بند کی ابتلا سے بھی گزرتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں مصر کے جنرل ناصر بھارت آ رہے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے یوسف صاحب کو حصار زنداں میں داخل کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ وہ جنرل ناصر کے خلاف احتجاج منظم کرنا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں بھی ان کو غیر جمہوری قانون ڈی۔ آئی۔ آر کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اور ان کے جرائم کی حسب ذیل فہرست پیش کی گئی۔

(۱) وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بھارت میں اردو، مسلم پرسنل لاء، فوج اور پولیس کی ملازمتوں میں مسلمانوں کے مناسب حصے جیسے موضوعات پر مسلمانوں کے جذبات و مطالبات کی ترجمانی اور وکالت کرتے رہے ہیں۔

(۲) انھوں نے بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی ذات پر نکتہ چینی کی ہے نیز انھوں نے

اپنے اخبار میں یونی فارم سول کوڈ، بنیادی حقوق، دستور کے رہنما اصول اور ۱۹۷۰ء کے فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق وزارت داخلہ کی رپورٹ اور بنگلہ دیش کی تحریک کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ گمراہ کن پروپیگنڈا ہے۔

سنہ ۱۹۷۶ء میں جب بھارت میں ایمرجنسی نافذ کی گئی تو جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ کے رکن اور ایک صحافی کی حیثیت سے وہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔

۱۹۷۶ء ہی میں یہ جواں ہمت بوڑھا، ضعف و نقاہت کے باوجود عالم آخرت کے طویل سفر پر روانہ ہو گیا:

خدا رحمت کرے اس عاشق بے باک فطرت پر

☆......☆......☆

یادگارِ رونقِ محفل

مولانا ظفرالحق خیرآبادی ستتر سال اس کاروان سرائے میں قیام فرما کر ''وطن'' واپس تشریف لے گئے۔

علامہ فضل حق کے پڑپوتے، علامہ عبدالحق کے پوتے، اپنے دودمان گرامی کی وجاہت کا دل آویز نمونہ، سچ مچ یادگار محفل، یہ یادگار رونق محفل بھی آج مٹ گئی، اور

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

حکیم صاحب نے علوم میں سے صرف طب میں اختصاص حاصل کیا تھا، طب کی تدریس کی طرف توجہ نہیں فرمائی تھی۔ صرف مطب کرتے تھے، مگر پھر بھی اب محسوس ہوتا ہے جیسے خیرآباد کے اجڑے دیار میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اب برسوں سے خیرآباد میں صدرا، شمس بازغہ، شفاء شیخ، قاضی مبارک اور الافق المبین کا درس نہیں دیا جاتا تھا۔ اب وہاں فارابی، ابن سینا، طوسی، میر باقر داماد کے نظریات پر ردوقدح کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا اور خیرآباد جس خصوصیت کی بنا پر ''یونانِ ثانی'' اور ہمارا مرکزِ عقیدت تھا وہ خصوصیت ختم ہوگئی تھی اور اب خیرآباد صرف نام کا خیرآباد رہ گیا تھا، مگر اس نام کے خیرآباد میں بھی ہم جیسے نیازمندوں کے لیے ایک کشش تھی، کہ حکیم ظفرالحق صاحب زندہ اور مے کدے کے آثار باقی ہیں۔ ساقی نے مدت ہوئی کہ یہ کاروبار بڑھا دیا تھا مگر مے کدے کا در بند نہ ہوا تھا۔ آج وہ در بھی بند ہوگیا:

تاسحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

مولانا عبدالحق کے صرف ایک فرزند تھے، مولانا اسدالحق، جو اگرچہ وراثت میں فطانت و ذکاوت اور معقولات سے خصوصی مناسبت لے کر پیدا ہوئے تھے مگر مہلت حیات بہت ہی کم لکھوا کر لائے تھے۔ چنانچہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق کم عمری میں فراغت حاصل کی اور تدریس بھی شروع کر دی تھی اور مدرسہ عالیہ (رام پور) میں صدر المدرسین بھی ہو گئے تھے۔ ''ہدیہ حامدیہ'' کے نام سے علوم عقلیہ میں اردو میں ایک رسالہ بھی تالیف فرمایا تھا اور ان کے نام کا سکہ ابھی ٹکسال میں ڈھالا جا رہا تھا کہ والد علامہ کے وصال کے صرف ایک سال چار ماہ بعد رحلت فرما گئے۔

انھی مولانا اسدالحق کے فرزندِ وحید مولانا حکیم ظفر الحق تھے۔ حکیم صاحب ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں جد امجد کے ہاتھوں رسم بسم اللہ ادا ہوئی اور اسی حکمت کدے میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ تقریباً دس سال کی عمر میں دادا کے سائے سے محروم ہو گئے (۱۸۹۹ء) اور تقریباً ۱۲ سال کی عمر میں والد نے بھی سفر آخرت اختیار فرمایا (۴۔ اگست ۱۹۰۰ء)۔ والیِ رام پور (نواب حامد علی خان) نے علامہ عبدالحق کے ایک نام ور شاگرد مولانا عبدالعزیز انبیٹھوی کو ان کی تعلیم پر مامور کیا، مگر مولانا انبیٹھوی سے سال ڈیڑھ سال ہی تعلیم حاصل کر سکے کہ مولانا سید برکات احمد رام پور تشریف لے جا کر انھیں اپنے ساتھ ٹونک لے آئے۔ مولانا نے درس نظامی کا نصاب حمد اللہ وغیرہ تک ہی پڑھا اور طب کی طرف ہی زیادہ متوجہ رہے۔ فراغت کے بعد چند سال رام پور میں مطب کیا پھر خیرآباد میں مستقل قیام فرمالیا اور یہیں آخر تک مطب کے ذریعے خدمت خلق اللہ میں مصروف رہے۔

پہلے رام پور سے وظیفہ ملتا رہا پھر حیدرآباد دکن سے وظیفہ جاری ہو گیا۔ تقسیم کے بعد حکومتِ ہند نے مجاہدین آزادی کے ورثاء کے لیے وظائف جاری کیے تھے چنانچہ حکیم صاحب کو بھی مولانا فضل حق کے وارث ہونے کی بنا پر ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ملنے لگے تھے۔

۱۶ رمضان ۱۳۹۷ھ / ۱۱ ستمبر ۱۹۷۷ء کو حکیم صاحب اپنے نام ور اسلاف سے جا ملے۔

حکیم صاحب اپنی افتادِ مزاج کی بنا پر کوئی علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے اور انھوں نے اعلیٰ مقام اسلاف کی طرح نام اور مقام حاصل نہیں کیا۔

مولانا اسدالحق خیر آبادی کی وفات (۱۹۰۰ء) کے بعد والیِ رام پور نے انکے فرزند ظفرالحق کو مولانا عبدالعزیز انبیٹھوی کے سپرد کیا مگر مولانا برکات احمد رام پور خود تشریف لے جا کر انھیں اپنے ساتھ ٹونک لے آئے تا کہ خود ان کی تعلیم و تربیت کی سعادت حاصل کر سکیں۔ ظفرالحق کے آتے ہی سب کو متنبہ کر دیا گیا کہ یہ ہمارے مخدوم زادے ہیں شاہ زادے ہیں۔ سب ان کا ادب کریں اور ان کے مزاج کی نزاکت کو ہر بات میں، ہر قدم پر ملحوظ رکھیں۔ ظفرالحق نے واقعی مزاج شہزادوں کا سا پایا تھا۔ ان کے درس کی شان یہ ہوتی تھی کہ میاں ظفر الحق پلنگ پر تشریف فرما ہوتے اور استاد (مولانا) اور دوسرے رفقاء درس (مولانا معین الدین وغیرہ) پلنگ کے نیچے فرش پر بیٹھ کر درس دیتے تھے۔ میاں ظفرالحق ناز و نعمت میں پلے ہوئے تھے اور فطرتاً شاہ دماغ اور نازک طبع واقع ہوئے تھے اس لیے اپنی ہر خواہش اور ضرورت کی تکمیل اور اپنے ہر حکم کی تعمیل فوراً چاہتے تھے۔ معیار بلند اور مذاق بہت نفیس تھا۔ اس لیے آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرتے رہتے تھے۔ مولانا دونوں وقت کھانے کا خوان ان کے کمرے میں خود لے جاتے تھے۔ مگر کسی معمولی سی فروگزاشت یا غلط فہمی پر کھانا اُٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ روزانہ عصر کو کورے مٹکے لٹکنوں پر رکھے جاتے۔ ان میں پانی بھرا جاتا پھر ان مٹکوں کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور ان پر ملازم بار بار پانی چھڑکتے تھے۔ ان سب باتوں میں سے کسی ایک بات میں بھی کوتاہی یا تاخیر ہو جاتی یا کوئی شخص اس اہتمام کو دیکھ کر ان مٹکوں میں سے پانی پی لیتا تو میاں ظفرالحق لات مار کر ان مٹکوں کو توڑ دیتے پھر نئے مٹکے بھرے جاتے ان کی گل پوشی کی جاتی ان پر پانی چھڑکا جاتا، غرض اس شان سے میاں ظفرالحق ٹونک میں زیرِ تعلیم رہے۔

یہ تمام ادائیں اور شاہ مزاجیاں ان کی طفلی اور ناسمجھی کے عہد کی تھیں۔ بڑے ہو کر وہ ان باتوں کو، اپنی ان نازک مزاجیوں کو اور استادِ محترم اور ان کے اہل خانہ کی ناز برداریوں کو یاد کر کے متاسف ہوتے اور روتے تھے۔ مولانا کے وصال کے بعد میرے والدِ ماجد کی زندگی میں

اوران کے بھی وصال کے بعد ٹونک تشریف لاتے رہتے تھے۔ ہمیں یہ قصے خود انھوں نے بڑے تاثر کے ساتھ سنائے تھے۔ غالباً ۵۴۔۵۵ میں کراچی تشریف لائے تھے۔ غریب خانے کو عزت بخشی تھی۔ میں نے حسب دستور قدم بوسی کی اور اپنے بڑے لڑکے سہیل (اب ڈاکٹر سہیل برکاتی) کا جو اس وقت ۷/۸ سال کا تھا سر ان کے قدموں میں جھکایا اور نذر پیش کی تو رونے لگے اور فرمایا، ''ہمارے بزرگوں کے ہزاروں شاگرد ہیں اور تھے مگر استاد اور استاد کے گھرانے سے یہ شیفتگی اور یہ عقیدت کہیں اور نظر نہیں آتی۔ پھر سہیل کو مخاطب کر کے بہت دیر تک اپنے قیام ٹونک کے یہی قصے اسے سناتے رہے۔

مولانا معین الدین اجمیری، ان کے ہم جماعت تھے اور ان کے ''معید'' بھی مقرر کیے گئے تھے، انھیں ''تکرار'' کرایا کرتے تھے۔ قدیم نظام درس میں ''اعادہ'' اور ''تکرار'' کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ جماعت طلبہ کا جو فرد محنت وشوق اور ذہانت میں نمایاں ہوتا وہ استاد سے سبق لینے کے بعد اپنے باقی رفقاء کو دوبارہ وہی سبق پڑھاتا اور اسی کا نام اعادہ اور تکرار تھا اور اس نمایاں طالب علم کو ''معید'' کہا جاتا تھا۔ تو مولانا معین الدین میاں ظفر الحق کو تکرار کروایا کرتے تھے۔ دونوں کم سن تھے۔ ذہین تھے۔ ایک بار تکرار کے دوران دونوں میں تکرار ہی ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کا ادب ملحوظ نہ رکھ سکے اور گفتگو اعتدال کے دائرے سے متجاوز ہوگئی۔ چند تیکھے جملوں کا طرفین نے تبادلہ کیا۔ اس موقع پر مولانا معین الدین کی زبان سے جو جملہ سرزد ہوا وہ مولانا معین الدین کی خود شناسی اور نو عمری میں پختہ کاری کا مظہر تھا، مولانا نے میاں ظفر الحق سے کہا:

''میاں! میرا تمھارا کیا مقابلہ، تم ننگِ خاندان ہو کہ تمھارے خاندان والا تبار میں تم جیسا کم سواد پیدا نہیں ہوا، اور میں فخر خاندان ہوں کہ میرے خاندان میں مجھ جیسا صاحب علم پیدا نہیں ہوا۔''

ٹونک میں رہ کر میاں ظفر الحق نے ایک منزل تک علوم رسمیہ کی تکمیل کی اور ساتھ ہی فنِ طب کی تعلیم وتربیت حاصل کی اور بعد میں صرف طب ہی پر توجہ کی اور اس میں اختصاص حاصل کیا اور خیر آباد اور سیتا پور ہی نہیں بلکہ اطراف کے اِطبا میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ طب کی بھی

تدریس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ صرف مطب ہی کے ذریعے خدمتِ خلق فرماتے رہے۔

مولانا حکیم ظفر الحق مردانہ وجاہت کا ایک ہر دل عزیز نمونہ تھے۔ کشیدہ قامت، گورے چٹے، تیکھے نقوش، طلاقتِ لسانی سے بہرہ ور، جس محفل میں بیٹھتے نمایاں اور ممتاز نظر آتے۔ جب سرگرم گفتار ہوتے تو اہل بزم سراپا گوش بن جاتے، جی چاہتا کہ یہ گل افشانی گفتار یوں ہی جاری رہے۔ مختصر یہ کہ ایک دل آویز اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

مولانا معین الدین اجمیری کی مولانا حکیم ظفر الحق سے طفلانہ تکرار کا قصہّ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ مگر وہ دونوں کا لڑکپن تھا، ناسمجھی تھی اور پھر وہ ایک دن کی بات تھی، ایک ہنگامی اشتعال تھا۔ ورنہ مولانا اس دور میں بھی میاں کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے اور بڑے ہوکر تو دونوں باہم اخلاص وموست اور ادب وعقیدت کا مثالی کردار نظر آتے تھے۔ مولانا حکیم ظفر الحق اکثر اجمیر تشریف لاتے تھے۔ خواجہ بزرگ کے مزار پر حاضری بھی مقصود ہوتی تھی اور اپنے احبائے قدیم سے ملاقات بھی، قیام نظامی دواخانے (شفاء الملک مولوی حکیم نظام الدین اجمیری کے دولت کدے) پر ہوتا تھا۔ شفاء الملک اساتذہ اور ان کے متعلقین کے ادب و احترام میں شاید اپنی مثال آپ تھے اور یہی صفت ان کے فرزندِ سعید و رشید مولانا حکیم نصیر الدین ندوی نے ورثے میں پائی ہے۔ وہ بھی اپنے سلسلے کے بزرگوں سے شیفتگی اور والہانہ عقیدت میں اپنا جواب آپ ہیں۔ اور کم سے کم میں نے ان دونوں باپ بیٹوں جیسا استاد پرستانہ جذبہ کسی اور میں نہیں پایا۔ تو مولانا حکیم ظفر الحق اجمیر آ کر نظامی دواخانہ میں قیام فرماتے اور شفاء الملک حکیم نظام الدین اور مولوی نصیر الدین ندوی ان کی ہر نوع کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ ادھر جوں ہی مولانا معین الدین کو خبر ہوئی وہ رواں دواں تشریف لاتے اور آداب احترام بجالاتے۔

ایک بار مولانا حکیم ظفر الحق صاحب کی آمد کی خبر ایسے وقت ملی جب انھیں مدرسے سے ماہانہ معاوضہ ملا تھا۔ مولانا تشریف لائے اور پوری جیب حکیم ظفر الحق کے قدموں میں اُلٹ دی،

مولوی حکیم نصیر الدین ندوی، مولانا حکیم ظفر الحق کی میزبانی کے فرائض وواجبات ہی

نہیں نوافل و مستحبات بھی بڑی کشادہ دلی اور فراخیِ حوصلہ کے ساتھ ادا فرماتے اور مراجعت کے وقت زادِ راہ نذر کرتے۔ حکیم نصیرالدین ندوی صاحب کے پاس مولانا فضل حق کی جو بیاض خاص ہے وہ انھوں نے مولانا حکیم ظفرالحق ہی سے دو سو روپے کے ہدیے کے عوض حاصل کی تھی۔

مولانا حکیم ظفرالحق تقریباً ۱۹۰۲ء میں ٹونک تشریف لائے تھے۔ مولانا سید برکات احمد نے ۱۹۱۷ء میں جو سند طب عطا فرمائی تھی اس میں تحریر فرمایا تھا:

قد تعلم منی الکتب اعنی موجز القانون و شرحه للعلامة السدیدی و شرحه للعلامة النفیسی وشرح الاسباب والعلامات و خمیات القانون و کلیاته و معالجاته للشیخ العلامة رئیس الفلاسفة والاطباء ابن سینا و جلس فی المطب مدة طویلة واکتسب قوانین المعالجة وبذل جهدة فیها لیلاً و نهاراً واجمع لنفسهٖ ذخیرة کثیرة و نال خطا وافر آو فازا فوزاً عظیما وحذف فی المعالجة حذقآ جمّعاً...... ولمّا لمل فی الفنون الطبیة وفرغ من اکتساب قوانین العلاج لا ...... لا مراض الصعبة طلب منی الاجازة فاجزته حسبةً للّٰه.

(۱۹۱۷/۱۳۳۵)

مولانا سید نجم الحسن خیر آبادی مرحوم کا بیان ہے کہ حکیم صاحب شعر بھی کہتے تھے۔ (خیر آباد کی ایک جھلک، ص ۱۰۳) انھوں نے دو شعر بھی نقل کیے ہیں:

ایک میں ہوں کہ کہیں میرا ٹھکانہ ہی نہیں
ایک تو ہے کہ مرے دل میں جگہ پائی ہے

میرے قاتل نے پسِ مرگ مری لاش ظفر
خود ہی نہلائی ہے، کفنائی ہے، دفنائی ہے

☆......☆......☆

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

(چند مہکتی یادوں کے ساتھ)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی فقہی، کلامی اور سیاسی آرا سے تدریج کے ساتھ متاثر اور متفق ہونے کے بعد ان کی ذات گرامی سے آہستہ آہستہ دل چسپی، تعلق اور گرویدگی پیدا ہوتی گئی۔ اس کے نتیجے میں ان کی سیرت و کردار سے واقفیت کا داعیہ فطری طور پر پیدا ہوا، اور بہت سے منفی پہلو بھی بارِ سماعت ہوئے، مگر ان میں سے بیشتر معاصرت، حسد، مسلکی اختلاف کے اثر سے بے اصل و نامعتبر نکلے۔

محاسن سیرت کے سلسلے میں مجھے پہلی اطلاع یہ ملی کہ جامعہ عثمانیہ میں [اپنے] تقرر کی پیشکش مولانا نے اپنے اصول کی خاطر مسترد کر دی [1]، حالانکہ مولانا اس دور میں معاشی خستہ حالی کا شکار تھے۔ اس خبر نے مجھے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے قلبی طور پر قریب تر کر دیا۔ حصول مقصد کے لیے قربانی اور تحمل شدائد کا حوصلہ صرف عظیم انسانوں کی صفت ہے۔ اس کے بعد جب بھی مجھے ایسے حضرات ملے جن کو مولانا مودودیؒ سے کوئی معاملہ کرنے، ملاقات کرنے

[1] یہ اطلاع مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے دی کہ "جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن میں تقرر کی کوشش میں نے کی تھی، اور پھر میں ہی یہ پیش کش لے کر مولانا مودودیؒ سے ملا تھا۔" مولانا گیلانی نے یہ واقعہ رسالہ صدق جدید، لکھنؤ میں مولانا مودودی پر ایک تنقیدی مضمون میں قلم بند کیا تھا۔

کا اتفاق ہوا تھا، ان سے ذکر یا رسن کر کبھی لکھ لیتا اور کبھی حافظے کے خزانے میں جمع کر لیتا۔ ایسی ہی چند ملاقاتوں اور تاثرات کے جمع شدہ نوٹس قارئین ترجمان القرآن کے لیے پیش خدمت ہیں۔

جوش ملیح آبادی (م:۱۹۸۲ء): جوش صاحب سے مولانا مودودیؒ کے روابط حیدر آباد، دکن میں قیام کے زمانے سے تھے۔ مولانا کے برادر بزرگ مولانا سید ابوالخیر مودودی (م: اگست ۱۹۷۹ء) اور جوش صاحب ایک ہی مکان میں کچھ عرصے تک رہے تھے۔ لکڑی کے پل (محلہ) میں مکان کے اوپر کے حصے میں جوش صاحب اور نیچے ابوالخیر صاحب رہتے تھے۔ جوش صاحب کا جب ریاست حیدر آباد سے اخراج ہوا، تو ان ریاستوں میں جو ماحول ہوتا تھا اس کے پیش نظر ان کے احباب تو ایک طرف، قریب ترین اعزہ بھی ان سے ملنے اور تعلق ظاہر کرنے سے کتراتے تھے۔ مگر جیسا کہ خود جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں لکھا ہے کہ انھیں اسٹیشن پر رخصت کرنے صرف مودودی برادران آئے تھے۔ اس کے بعد برسوں دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی۔

مولانا مودودی پاکستان میں تھے اور جوش صاحب بھارت میں۔ پھر جب جوش اپنے دوست جواہر لال نہرو اور نئے بھارت سے مایوس ہو کر پاکستان آ گئے اور کراچی میں طرح اقامت ڈالی تو ایک دن مولانا مودودی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مولانا کراچی تشریف لائے ہوئے تھے اور پیر الٰہی بخش کالونی میں شیخ سلطان احمد صاحب لکھنؤ والے کے ہاں مقیم تھے۔ جوش صاحب پتا حاصل کر کے ایک دوپہر وہاں پہنچ گئے۔ پروفیسر حبیب اللہ رشدی (م:۱۹۶۹ء) جوش صاحب کے ساتھ تھے۔ رشدی صاحب کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا، وہ وہاں پر صف اول کے صحافی تھے روزنامہ نظام گزٹ انھی نے جاری کیا تھا اور تقسیم کے بعد کراچی میں مقیم تھے۔ حبیب اللہ رشدی صاحب اور جوش صاحب، سلطان صاحب کے ہاں پہنچے۔ جب جوش صاحب کو بتایا گیا کہ مولانا مودودی کھانے اور نماز ظہر سے فراغت کے بعد آرام کر رہے ہیں، تو جوش نے اصرار کر کے معلوم کیا کہ مولانا کس کمرے میں سو رہے ہیں اور پھر بے تکلفی سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا تو ہانک لگائی "عوام کو جگا کر علما سو گئے"

مولانا نے خوش دلی سے جوش صاحب کا استقبال کیا اور دیر تک یہ مجلس گرم رہی۔ بہت سے دل چسپ فقروں کا تبادلہ ہوا، مثلاً جب مولانا نے ذکر فرمایا'' اپنی قیام گاہ تبدیل کر رہا ہوں'' تو جوش صاحب نے پیشکش کی: ''مولانا میرے ہاں آ جائیے۔'' مولانا نے برجستہ فرمایا: ''اس میں میری بھی رسوائی ہے اور آپ کی بھی۔'' گفتگو میں جوش صاحب نے مسئلہ جبر و قدر سے اپنی دل چسپی کا ذکر کیا تو مولانا نے فرمایا: ''بگڑا ہو شاعر ضرور جبر و قدر پر طبع آزمائی فرماتا ہے۔''

اس محفل کی روداد رشدی صاحب نے اسی روز مجھے سنائی تھی اور میں نے قلم بند کر لی تھی۔ مولانا دوسرے ہی روز علی الصباح بازدید کے لیے جوش صاحب کے ہاں تنہا تشریف لے گئے۔

حکیم نصیر الدین ندوی (م: ۱۹۹۸ء) صاحب اجمیر کے مقبول معالج تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ ان کا مطب، نظامی دواخانہ، دواخانے سے زیادہ ایک علمی اور تہذیبی مرکز کے طور پر متعارف تھا۔ اکابر دین، مشاہیر سیاست، خاصانِ علم و ادب کی ان کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی اور علمی و ادبی مجالس گرم رہتی تھیں۔ حکیم صاحب کو اپنے فن میں مہارت کے علاوہ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق تھا۔ انھیں اردو کے علاوہ عربی و فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ سردار عبدالرب نشتر ابتدا میں ان کے زیر علاج مریض تھے، مگر بعد میں دوست ہو گئے تھے اور بیدل کے اشعار سمجھنے ان کے ہاں آ جایا کرتے تھے۔

حکیم صاحب، مولانا مودودیؒ کے نام اور کام سے واقف تھے مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار مولانا مریض کی حیثیت سے ان کے ہاں تشریف لائے۔ حکیم صاحب سے ادویہ تجویز کروانے کے بعد چودھری غلام محمد صاحب مرحوم کو نسخہ دیا کہ ''چالیس دن کی دوا بنوالیں۔'' مگر جب چودھری صاحب کو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب نے ادویہ کی قیمت نہ لینے کی ہدایت کی ہے، تو مولانا سے آ کر یہ بات کہی۔ مولانا نے فرمایا: ''کوئی بات نہیں، دوائیں لے لیجیے'' (اس کے جواب میں مولانا نے لاہور پہنچتے ہی چینی گلاب کی ایک بڑی مقدار حکیم صاحب کو بھجوا دی۔ چینی گلاب کا کراچی میں نایابی کا ذکر آیا تھا۔

پہلی ملاقات میں دونوں میں قرب و اتحاد کے کئی پہلو نکل آئے۔ حکیم صاحب نے جب مولانا کو دعوت طعام دی تو مولانا نے بے تامل قبول کر لی۔ اس ملاقات میں راقم بھی شریک

تھا۔ مولانا اس بزم طعام میں بے تکلف اور شگفتہ انداز میں شریک ہوئے۔ موسم سرما تھا۔ حکیم صاحب نے مولانا سے پوچھا: ''مولانا، آپ کی روٹی گرم کر دوں؟'' مولانا نے فرمایا: ''گرم روٹی اور ٹھنڈا پانی تو بڑی نعمت ہے۔'' چنانچہ حکیم صاحب نے انگیٹھی پر روٹی گرم کر کے مولانا کو پیش کی، مگر پانی کے درجہ برودت کو ناکافی بتایا تو گلاس میں برف کی ڈلیاں ڈال دی گئیں۔ حکیم صاحب نے کہا: ''مولانا، آپ کے ہاں معقولی اور منطقی انداز فکر ہم خیر آبادیوں جیسا ہے۔'' اس پر مولانا نے فرمایا: ''جی ہاں، میں بھی خیر آبادی مکتب فکر سے منسلک ہوں۔ میں نے معقولات کی تحصیل مولانا عبدالسلام سے کی ہے۔'' اس پر حکیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ مولانا عبدالسلام نیازی [1] سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ جب بھی وہ اجمیر آتے تو حکیم صاحب کے ہاں ہی قیام فرمایا کرتے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا: ''مولانا وائٹ جیسمین کا ذوق ہے؟'' مولانا نے شگفتگی سے فرمایا: ''جی، جیسمین بہت پی ہے مگر جب سے غبار خاطر شائع ہوئی ہے، چھوڑ دی۔'' مولانا کا جواب سن کر کئی حضرات مسکرا دیے۔ ایک صاحب نے زیر لب فرمایا: ''اعاظم کی انا کی بھی ایک اپنی ہی شان ہوتی ہے۔''

مولانا نے چند دن بعد ماہر القادری مرحوم کے نام اپنے ایک گرامی نامے میں اصل مقصد کے بعد تحریر فرمایا تھا: حکیم نصیر الدین ندوی صاحب کو میری طرف سے عرض کریں کہ آپ نے مجھے جو دوا دی تھی اس نے برسوں کی غلاظتیں دور کر دیں۔ اگر آپ مجھے اس کا نسخہ عنایت فرمادیں تو کرم ہو (ایسے ہی کچھ الفاظ تھے)۔۔ ماہر صاحب نے مولانا کا یہ خط فاران میں شائع فرماتے ہوئے مولانا اور حکیم صاحب کے مراسم پر ایک نوٹ بھی لکھا تھا جس پر یہ مصرع بھی تھا:

میانِ پختہ کاراں بود بحث خویشتن داری

حکیم یوسف صدیقی (م:۱۹۷۶ء): محمد یوسف صدیقی صاحب جماعت کے ابتدائی دور کے رفقا میں سے تھے اور وطن ٹونک تھا۔ غالباً تقسیم سے پہلے جماعت کی شوریٰ میں بھی تھے،

---

[1] مولانا عبدالسلام کے متعلق مولانا مودودی کے دو خطوط میری نظر سے گزرے جو بہت عقیدت مندانہ جذبات پر مشتمل ہیں۔ ایک مجلہ ''خاتون پاکستان'' کے مدیر شفیق بریلوی کے نام تھا۔

تقسیم کے بعد اپنا کاروبار ختم کر کے مرکز کی دعوت پر دہلی جا بسے۔ جماعت اسلامی ہند کے انگریزی اخبار Radiance، دہلی کے چیف ایڈیٹر بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انھی کی تحریک پر جماعت اسلامی کا سالانہ اجتماع ٹونک میں ہوا تھا، جس میں مولانا مودودیؒ بھی تشریف لے گئے تھے۔صدیقی صاحب کئی کئی دن دارالسلام میں جا کر مقیم رہتے تھے اور مولانا کو ان سے خصوصی تعلق تھا۔

محمد یوسف صدیقی صاحب کے بتائے ہوئے واقعات درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا مودودیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''حیدرآباد میں ہاتھ تنگ رہتا تھا اور آمدنی قلیل تھی۔اسی لیے فاقہ کشی سے بچنے کے لیے میں چند سیر [بھنے ہوئے] چنے خرید کر رکھ لیتا تھا، تاکہ کچھ نہ ملنے کی صورت میں چنے کھا کر پانی پی لیا جائے۔''

۲۔ اسی طرح ایک مرتبہ مولانا مودودیؒ نے فرمایا: ''میں دکن سے دارالسلام [پنجاب] نیا نیا آیا تھا۔ آتے ہی ترجمان القرآن کا تازہ شمارہ شائع کر دیا اور پھر دارالسلام کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ کمر کمر تک گھاس کھڑی تھی، وہ کٹوا رہا تھا۔ اسی دوران ایک صاحب آئے، پختہ عمر، سادہ دیہاتی لباس، ہاتھ میں لکڑی اور تھیلا، وہ مجھ سے ہی ملنے آئے تھے۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو انھوں نے تھیلے سے ترجمان القرآن کا تازہ شمارہ نکال کر، میرے مضمون کی ایک عبارت دکھائی جس پہ انھیں اعتراض تھا۔ میرے جواب سے مطمئن ہو کر انھوں نے رسالہ تھیلے میں رکھا اور رخصت ہونے لگے۔ میں نے تعارف چاہا تو معلوم ہوا کہ صوبہ سرحد کے ایک قصبے سے ان کا تعلق ہے۔ رسالے میں ایک قابل اعتراض عبارت دیکھتے ہی وہ اس پر احتجاج کے لیے لکڑی اور تھیلا ہاتھ میں لے کر چل پڑے لیکن جب اعتراض رفع ہو گیا تو مطمئن ہو کر اسی وقت واپسی کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے انھیں پیش کش کی کہ کچھ دیر قیام کریں، ستالیں، ماحضر تناول فرمالیں پھر واپسی ہو۔ مگر انھوں نے عذر کیا: ''جزاک اللہ، مجھے کئی ضروری کام درپیش ہیں، بس یہ مضمون پڑھتے ہی میں بے چین ہوا، اور سب کام چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب چونکہ اطمینان ہو گیا ہے اس لیے ایک لحہ ٹھیرنا بھی دوبھر ہو گا۔'' مولانا مودودیؒ فرماتے تھے: ''میں

نے ان صاحب کی آمد سے بڑا اطمینان محسوس کیا کہ میں زندوں کی بستی میں آ گیا ہوں۔ ورنہ برسوں دکن میں رہا اور بہت متنازعہ فیہ مضامین لکھے، لیکن وہاں پر مجھے کوئی گریبان پکڑنے والا نہیں ملا تھا۔"

محمد یوسف صدیقی مرحوم ہی کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی جی چاہتا ہے کہ ذکر کروں۔ اجتماع ٹونک کے موقع پر یوسف صاحب نے اپنے ہاں مولانا کی دعوتِ طعام کا اہتمام کیا، اور اس میں خاصان شہر کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ انھی حضرات میں ایک وکیل صاحب بھی تھے۔ اللہ بخشے بحث و مناظرہ کا انھیں خاص ذوق تھا۔ بہت بولتے تھے اور دوسرے کی ہر بات کی تردید کی کوشش میں ہر لمحے مستعد دکھائی دیتے تھے۔ کئی دن سے وہ مولانا کی نشست میں شریک ہو رہے تھے اور اپنے "فن" کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خیر، یہ وکیل صاحب بھی اس دعوت میں بلائے گئے تھے۔ کھانے کی ڈشوں میں بکرے کا بھیجا بھی تھا۔ میزبان نے مولانا کو متوجہ کیا: "مولانا، بھیجے کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔" مولانا نے فرمایا: "ہمارے وکیل صاحب کو دیجیے۔ انھیں بھیجا کھانے کا بہت شوق ہے۔" اب شرکاء طعام وکیل صاحب کے اس ذوق و شوق سے واقف تھے۔ اس لیے وکیل صاحب سمیت سبھی نے خوب لطف لیا۔

حکیم شمس الحسن (م: ۱۹۷۹ء): حکیم صاحب سہارن پور کے گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے ایک بزرگ داروغہ محمد ارحم انصاری میرٹھ میں ۱۸۱۸ء میں سید احمد شہیدؒ سے بیعت ہوئے۔

حکیم شمس الحسن صاحب، عالم اور فاضل طب تھے۔ تاسیسِ جماعت اگست ۱۹۴۱ء سے پہلے بھی ان کا مولانا مودودیؒ سے تعلق تھا۔ پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت کے بنیادی رکن بنے۔ بعد میں بعض وجوہ سے رکنیت سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن ۱۹۷۱ء میں جب دیکھا کہ اشرار کے ساتھ اخیار بھی، اور اسلام دشمنوں کے ساتھ علمائے کرام بھی جماعت کی مخالفت میں ہم قدم ہیں تو انھوں نے میدان جہاد میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا اور جماعت کی رکنیت دوبارہ اختیار کر لی۔ پھر اخباری بیانات کے علاوہ خطبوں کے ذریعے مولانا امین احسن اصلاحی (م: دسمبر ۱۹۹۷ء) وغیرہ کو جماعت کا ساتھ دینے کی تلقین کی۔ سکھر میں جہاں وہ عرصے سے مقیم تھے ۱۵/۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کو وصال فرمایا۔

حکیم شمس الحسن صاحب سے راقم کا تعارف ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس وقت وہ جماعت میں شامل نہیں تھے۔ ان کی علیحدگی میں بنیادی طور پر رفقائے جماعت سے اختلافات کو دخل تھا، مولانا کے افکار و نظریات سے اس وقت بھی انھیں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مولانا کے ذاتی اوصاف و کمالات کے تو وہ بے حد مداح و معترف تھے اور اکثر اس قسم کے واقعات بڑی عقیدت سے سنایا کرتے تھے جن سے مولانا کی عظمت کردار، وسعت ظرف، علو ہمت، درویش مزاجی، اتقا، توکل، تحمل، صداقت شعاری، ایثار، تدبر، دردمندی، ذہانت، فراست اور شگفتہ مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعد میں حکیم شمس الحسن صاحب کراچی سے سکھر منتقل ہو گئے۔ تاہم جب بھی وہ کراچی تشریف لاتے تو لازماً غریب خانے پر آنے کی زحمت فرماتے اور ہماری طویل نشست رہتی۔ ہماری گفتگو کا موضوع بیش تر مولانا مودودیؒ کی شخصیت ہی ہوتی تھی۔ اخیار و صلحا کی داستانوں سے مجھے لڑکپن سے ہی دل چسپی رہی ہے، اور اس کے فوائد و ثمرات کا بھی مسلسل تجربہ ہوا ہے۔ ایک بار خیال ہوا کہ حکیم شمس الحسن صاحب کی ان قیمتی روایات کو قلم بند کر لیا جائے۔ اس حوالے سے میں نے خود حکیم صاحب سے عرض کی: ''آپ کے حافظے میں تاریخ جماعت اور سیرت مودودیؒ کا بڑا قیمتی سرمایہ محفوظ ہے اسے ضائع نہ ہونے دیں بلکہ اسے قلم بند کر لیں۔ مجھے بحیثیت معالج معلوم ہے کہ پایان عمر میں بہت سا ذخیرہ لوحِ حافظہ سے محو ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے واقعات اور سنین مختلط ہو جاتے ہیں۔'' جواب میں حکیم صاحب قلم رانی سے اپنی عدم مناسبت کا عذر کرتے رہے، مگر میرے مسلسل اصرار کے بعد انھوں نے وعدہ کر لیا۔ جس پر یہ طے ہوا کہ حکیم صاحب سکھر سے مجھے اقساط بھیجتے رہیں گے اور میں انھیں جمع کرتا رہوں گا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ ایک ایروگرام لے کر لکھنا شروع کر دیتے اور جب اس کی وسعت تنگ ہو جاتی تو مجھے روانہ کر دیتے۔ افسوس ہے کہ حکیم صاحب کے تین ہی خط آئے تھے کہ پھر داستان سنانے والا خود ہی داستان بن گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان خطوں میں بات اس انداز سے شروع کی گئی تھی کہ جیسے کوئی مبسوط کتاب لکھنی پیش نظر ہو۔ اس ضمن میں سیرت مودودیؒ کے سلسلے میں، حکیم صاحب کی باتیں آپ کو سناتا ہوں:

حکیم شمس الحسن صاحب نے فرمایا: ''میں ایک زمانے میں بہاول پور میں مقیم تھا۔ وہاں

مولانا مودودیؒ کے خالہ زاد بھائی مشتاق احمد زاہدی سے جو بہاول پور کے ایک کالج میں پرنسپل تھے، مولانا کا تذکرہ، ان کے علم وفضل اور ذہانت وذکاوت کی باتیں سنی تھیں، اور مولانا کی کچھ تحریریں خصوصاً مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش وغیرہ دیکھی تھیں۔ چنانچہ، میں بہاول پور سے سہارن پور جاتے ہوئے لاہور اتر گیا اور مولانا کے گھر پہنچا۔ مولانا اس زمانے میں پٹھان کوٹ سے لاہور منتقل ہو گئے تھے، اور اسلامیہ کالج لاہور میں اعزازی پروفیسر بھی ہو گئے تھے، اسلامیہ پارک میں کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ میری اطلاع پر مولانا آئے، بیٹھک کھول کر بیٹھ گئے۔ یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے، جب مولانا سے میری مختصر سی بات ہوئی۔

میں نے دریافت کیا: ''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' مولانا نے فرمایا: ''تجدید واحیائے دین۔'' میں نے کہا: ''یہ کام تنہا نہیں ہو سکتا اور ایک جماعت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔'' مولانا نے فرمایا: ''صحیح ہے جماعت بنانی ہو گی۔'' میں نے کہا: ''جب بھی آپ جماعت بنائیں تو میرا پتہ یہ ہے، آپ مجھے اس کی اطلاع ضرور دیں اور مجھے اس میں آج ہی شامل سمجھیں۔'' مولانا نے فرمایا: ''سوچ سمجھ لیجیے۔'' بس اتنی سی بات کر کے میں چلا آیا۔ چند روز کے بعد قمر الدین صاحب کا خط آیا جو اس زمانے میں مولانا کے سیکرٹری تھے: ''مولانا پوچھتے ہیں کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' میں نے جواب لکھ دیا: ''میں تو اپنا فیصلہ اسی وقت مولانا کو بتا آیا تھا۔ وہی میرا آخری فیصلہ ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت کی تاسیس کے سلسلے میں دعوت نامہ آیا اور میں اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور پہنچ گیا۔''

حکیم شمس الحسن صاحب کے بقول: ''تاسیس جماعت کے اجتماع میں شرکت سے پہلے میری مولانا سے ایک اور ملاقات بھی ہوئی تھی۔ جب میں پہلی بار مولانا مودودیؒ سے مل کر سہارن پور پہنچا تو مدرسہ مظاہر العلوم کے ایک عالم مولوی جمیل احمد نے مجھ سے اپنے ایک منصوبے کا ذکر کیا، جو بم بنانے کا کارخانہ بنانے سے متعلق تھا۔ جمیل صاحب نے سہارن پور کی اہمیت بتائی کہ: ''یہ شہر کئی انگریزی چھاؤنیوں کے عین وسط میں ہے اور یہاں کا ہنگامہ بہت جلد پھیل سکتا ہے۔'' میں نے ان کی تائید کی اور اپنی اعانت کا وعدہ بھی کیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ایک صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں اور پہلے ان سے اجازت لینا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے

مولانا مودودیؒ کو خط لکھا: ایک اہم مسئلے پر آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اس خط کے جواب میں مولانا محترم نے مجھے چار روپے کا منی آرڈر کیا (اس دور میں سہارن پور سے لاہور تک ریل کا کرایہ چار روپے ہوتا تھا) اور کوپن پر مولانا نے لکھا: ''یہ کرایہ ہے، آپ فوراً چلے آئیں۔'' چنانچہ میں لاہور پہنچا اور مولانا سے اس منصوبے کا ذکر کیا۔ میری بات سننے کے بعد مولانا مودودیؒ نے ایک مفصل گفتگو فرمائی اور یہ ثابت کر دیا کہ: ''یہ کرنے کا کام نہیں ہے۔ کرنے کا کام اقامت دین، اسلام کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت جدوجہد ہے، جس کے نتیجے میں صرف اس ملک سے انگریز ہی نہیں، بلکہ ہر طاغوت کو سیادت و قیادت عالم سے ہٹا دیا جائے گا۔''

چنانچہ میں نے واپس سہارن پور جا کر مولوی جمیل صاحب سے معذرت کر دی۔

حکیم صاحب نے بتایا: ''اگست ۱۹۴۱ء میں تاسیس جماعت کا جلسہ ہوا۔ اس میں ۷۵ افراد نے رکنیت کا حلف اٹھایا تھا۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے اس وقت جو تقریر کی تھی، اس میں وہ خود بھی اس قدر روئے تھے کہ داڑھی تر ہو گئی تھی اور دوسرے شرکا پر بھی رقت طاری تھی۔''

تاسیسِ جماعت کے کچھ عرصے بعد مولانا مودودیؒ پھر دارالسلام، پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب بتاتے ہیں: ''میں ۴۳-۱۹۴۲ء میں تقریباً ایک سال تک مقیم رہا۔ وہاں میرے ذمے مہمان خانہ اور اسٹور وغیرہ کا انتظام تھا، ساتھ ہی میں مولانا کے دو بچوں عمر فاروق اور احمد فاروق کو پڑھایا بھی کرتا تھا۔ اسی لیے میں مولانا کے گھرانے میں، ماسٹر صاحب کہلاتا تھا۔ اس تقریباً ایک سال کے عرصے میں وہاں جو واقعات پیش آئے یا مولانا سے جو واقعات سنے ان میں سے چند سناتا ہوں۔''

حکیم شمس الدین مرحوم نے فرمایا: ''مولانا مودودیؒ دکن سے علامہ اقبال کی دعوت پر پنجاب جاتے ہوئے ابھی دہلی میں ٹھیرے ہوئے تھے کہ عبدالعزیز شرقی، علامہ کا کوئی پیغام لے کر دہلی پہنچے اور مولانا سے ملے۔ پھر مولانا دہلی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو چودھری نیاز علی، مولانا کے استقبال کے لیے بھٹنڈہ تک آئے تھے اور ساتھ ہی لاہور گئے تھے۔''

''پٹھان کوٹ میں مولانا مودودیؒ کی والدہ بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، مگر مولانا سے چھپ کر قرب وجوار کی قبروں کی زیارت کے لیے ضرور جایا کرتی تھیں۔

مولانا، اپنی والدہ کے اس طرح اخفا کی کوشش کے ساتھ جانے پر بس مسکرا دیا کرتے تھے۔"

"مولانا دکن سے پٹھان کوٹ تو آ گئے مگر چودھری نیاز علی صاحب سے چند اصولی باتوں پر اختلاف کی وجہ سے وہاں نبھی نہیں، اس لیے لاہور منتقل ہو گئے۔ تاسیس جماعت سے پہلے منتقل ہونے کا یہ واقعہ مولانا مودودیؒ نے مجھے بتایا تھا۔ فرمایا: "میں نے اچانک ایک دن پٹھان کوٹ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور ٹرک لے کر اہل و عیال اور سامان کو اس پر لاد کر لاہور پہنچ گیا ور مکان کی تلاش شروع کر دی۔ شام کو چوبرجی کے علاقے میں مکان مل گیا، تو ٹرک سے سامان اور اہل و اعیال کو اتارا۔"

"تاسیس جماعت کے کچھ ہی دن بعد قمر الدین خان، مولانا جعفر شاہ پھلواروی، مولانا محمد منظور نعمانی، وغیرہ نے مولانا مودودیؒ پر اچانک تنقید شروع کر دی اور ایک تیرہ نکاتی تحریر مولانا کے خلاف لکھی۔ ان تیرہ میں سے ایک نکتہ یہ بھی تھا: "مولانا مودودی کے ہاں صوفہ سیٹ ہے" (وہ صوفہ بانس کا بنا ہوا تھا)۔ اور یہ کہ: "آپ کا پان دان اور پانوں کی ڈبیا چاندی کی ہے" (یہ دونوں چیزیں چاندی کی نہیں نکل کی تھیں اور دکن کی مشہور فیکوی کی بنی ہوئی تھیں)۔ مزید یہ کہ: "آپکی وضع قطع علما کی سی نہیں ہے"۔ چنانچہ دہلی میں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا، جس میں یہ احباب جماعت سے الگ ہو گئے۔"

"اسی زمانے میں جماعت کے مکتبے کے ناظم محمد شاہ تھے، جنھوں نے ترجمان القرآن کا ۴۰ رم کاغذ غائب کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ عظیم دوم کی وجہ سے کاغذ نایاب تھا۔ ہم نے بہت اصرار کیا کہ: "مولانا پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں۔" مولانا مودودیؒ برطانوی سامراج کی حکومت سے استفادے کی ان شکلوں کو جائز نہیں سمجھتے تھے،۔ اس لیے انھوں نے یہ تجویز مسترد کر دی۔"

"اپنی اولاد کے سلسلے میں مولانا نے فرمایا: میں نے لڑکوں کے نام کے لیے حضرت عمر فاروق کے نام کا انتخاب کیا ہے (یعنی عمر فاروق اور احمد فاروق وغیرہ) اور لڑکیوں کے نام کے لیے صدیق اکبرؓ کے گھرانے کی خواتین کے نام منتخب کیے ہیں، یعنی حمیرا اسماء وغیرہ۔"

"پٹھان کوٹ میں مولانا مودودیؒ درس قرآن دیا کرتے تھے۔ جس میں میرے علاوہ نعیم

صدیقی، مولانا امین احسن اصلاحی، یحییٰ صاحب، ملک غلام علی وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ مولانا کا درس قرآن پورا ہونے کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی نے درس دینا شروع کیا۔ اب مولانا مودودی ہمارے ساتھ سامعین کے حلقے میں بیٹھ کر مولانا امین احسن اصلاحی کا درس سنتے تھے۔

حکیم شمس الحسن نے یہ بھی فرمایا: مرکز جماعت کے قیام کے زمانے میں، میں مولانا کے بیٹوں کو پڑھاتا تھا۔ اسی دوران مولانا کی اہلیہ سے میری تلخ کلامی ہوگئی۔ اس کے بعد الہ آباد کے اجتماع میں جہاں بیگم مودودیؒ اور مولانا کی والدہ صاحبہ بھی گئی تھیں، وہاں پر والدہ صاحبہ نے میری تلخی ختم کروادی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اپنی بیگم سے سخت تلخی سے پیش آنے اور سچی بات یہ ہے کہ گستاخی تک کر گزرنے کے باوجود، مولانا مودودی نے مجھ سے نہ صرف یہ کہ کچھ نہیں کہا، نہ طرز عمل میں کوئی تبدیلی آنے دی بلکہ انھوں نے باوقار خاموشی اور باخبری پر مبنی لا تعلقی سے اس قسم کا تاثر دیا کہ دو بہن بھائیوں کی جنگ ہے، ہم کیوں دخل دیں۔ البتہ ایک روز کسی نے ذکر کیا تو بس یہ جملہ کہا: دو جلالی آپس میں متصادم ہوگئے ہیں۔

حکیم شمس الحسن صاحب نے ایک عجیب تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا: مولانا مودودی کے صبر وضبط کا ہم نے بار بار امتحان لیا، جس میں ہر بار وہ کامیاب نکلے۔ ایک بار نعیم صدیقی صاحب نے مولانا کے پاس سے آ کر ہم رفقاء سے کہا: ''مولانا نے فرمایا ہے کہ میں ایک ضروری تحریر لکھ رہا ہوں، اس لیے کوئی صاحب ملنے نہ آئیں۔'' میرے مزاج میں جو بغاوت کا مادہ ہے، وہ اس دور میں ویسے بھی شباب پر تھا۔ مولانا کی ہدایت اور نعیم صدیقی صاحب کی اطلاع سنتے ہی اس جذبہ بغاوت نے مجھے اکسایا، اور مولانا کی اس ہدایت کو چیلنج کرنے کے لیے اگلے ہی لمحے مولانا مودودی کے کمرے میں جا پہنچا اور کرسی کھینچ کر اس انداز سے مولانا کے سامنے جا بیٹھا کہ جیسے گپ شپ کرنے آیا ہوں۔ اب آپ مولانا مودودی کے ظرف کو دیکھیے، کہ وہ قلم رکھ کر میری طرف متوجہ ہوگئے۔ اور میری باتوں کا جواب دینے لگے۔ جواب بھی کوئی ہاں ناں، میں نہیں، تفصیلی دیے اور گفتگو میں ایسی دل چسپی لی کہ جیسے خود اس وقت ایسی بے مقصد و بے موضوع گفتگو کے موڈ میں تھے۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ان پر رحم آ گیا اور میں یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا: مولانا آپ اپنا کام کریں، میں تو نعیم صاحب کی زبان سے آپ کی

ہدایت سن کر کہ مجھ تک کوئی نہ پہنچے بھڑک اٹھا تھا۔ بس اب بہت امتحان لے لیا۔ میں نے باہر نکلنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا۔ کہ مولانا نے حسب معمول شگفتگی سے جواب دیا: ''اور پاس بھی کر دیا''، پھر ایک خاص انداز میں فرمایا: ''بھئی ایک کمزور آدمی کو کب تک آزماؤ گے۔''

حکیم شمس الحسن صاحب نے بتایا: ایسے ہی ایک بار ہم چند رفقا بھاری لکڑی اٹھا کر لا رہے تھے، کہ میری نظر مولانا مودودی پر پڑی، جو اپنے چبوترے پر سفید بے داغ اور براق کپڑے پہنے بیٹھے لکھ رہے تھے۔ میرے ذہن میں پھر بغاوت کا کیڑا کلبلایا اور قدرے بلند آواز میں رفقاء سے کہا: ''یہ بار تو وہ اٹھائے جس نے امارت کا بار اٹھایا ہے۔'' مولانا نے میری یہ بات سن لی اور کوئی تاثر دیے بغیر فوراً قلم رکھ کر چبوترے سے اتر آئے اور ہماری مدد سے وہ لکڑی کاندھے پر رکھوالی اور چلنے لگے۔ انھوں نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ہم نے الحاح وزاری کے ساتھ مولانا سے درخواست کی: ''بس کیجیے'' اور بمشکل وہ لکڑی مولانا کے کندھے سے اتروائی۔''

''ایک بار ایک ہندو کانگریسی رہنما، جو غالباً پنڈت جواہر لال نہرو کا پرائیوٹ سیکرٹری تھا اور بڑا ذہین اور صاحب نظر تھا، بیمار ہو کر ہمارے قریب میں اپنے گاؤں چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس کو جب دارالسلام کی بستی اور جماعت کے کام کی سن گن لگی، تو اس نے مولانا مودودی سے ملنے کے لیے وقت مانگا۔ وہ جب آیا تو ہم لوگ بھی شریک محفل ہو گئے۔ چائے سے تواضع کی گئی۔ وہ مولانا مودودی کی شخصیت اور دارالسلام کے ماحول کی شائستگی اور صفائی کے اعلیٰ معیار سے خاص طور پر متاثر ہوا۔''

حکیم شمس الحسن صاحب نے روایت کیا: ''بعد میں کئی بار میری اس سے ملاقات ہوتی رہی۔ اس نے کئی بار کہا: مولانا مودودی میں تو مولاناؤں جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ باقاعدگی، صفائی، ستھرائی، منطقی انداز فکر، باخبر رہنے کا اہتمام، پُر زور استدلال، یہ باتیں مذہبی رہنماؤں میں نایاب ہیں، سوائے مولانا ابوالکلام آزاد کے۔''

مولانا مودودی سے گفتگو میں اس نے بڑے اہم سوالات کیے اور مولانا کے جوابات پر اس کے اطمینان ہی نہیں حیرت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ جیسے سوچتا ہو: ایسا جواب، اور اس گاؤں میں ایک مولوی کی زبان سے؟۔۔ مولانا دوران گفتگو متعدد بار اعداد و شمار پیش کرتے تو وہ چونک سا

جاتا تھا۔ ایک باراس نے مولانا کے بتائے ہوئے اعداد شمار پرشک کا اظہار کیا تو مولانا نے حوالہ پیش کر دیا، غالباً کانگریس کمیٹی کی رپورٹ کا۔ آخر میں اس نے مولانا مودودی سے پوچھا: ''آپ کو کب تک اپنے مقصد میں کامیابی کی توقع ہے؟ مولانا نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر فرمایا: کم سے کم دونسلوں کے بعد۔'' وہ اس جواب سے بہت ہی متاثر اور مرعوب ہوا۔

پھراس کے بعد بھی میری کئی بار ملاقاتیں ہوئیں، کیوں کہ مجھے اس کے گاؤں سے گزرنا ہوتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اندازہ یہ ہوا کہ ہندو کی حیثیت سے وہ خائف بھی ہوتا تھا۔ کہتا تھا: جب اسلام کے لیے اتنے سائنٹی فک طریقے پر کام کیا جائے گا، انداز فکر اتنا غیر جذباتی اور منطقی ہوگا، اور حالات حاضرہ اور سیاسیات عالم پر اس گہری نظر کے ساتھ اور صحیح خطوط پر تحریک چلائی جائے گی تو اس کی کامیابی کا قوی اندیشہ ہے۔''

حکیم شمس الحسن صاحب نے کہا: '' جماعت اسلامی کی تاسیس کے بعد بڑے بڑے زلزلے آئے، باہر بھی مخالفت کا طوفان اٹھتا رہا اور اندر بھی کئی ارکان معترضانہ، ناقدانہ بلکہ معاندانہ سرگرمیوں میں منہمک رہے، کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ اب جماعت منتشر ہونے سے نہ بچ سکے گی۔ مگر اس سارے ماحول میں مولانا کے حوصلے اور ہمت کی شاید کوئی حد نہیں تھی۔ ان کو ہم نے کبھی مایوس، دل گرفتہ اور پریشان نہیں دیکھا، بلکہ ہماری پریشانی اور نراس مولانا کے پاس جا کر دور ہو جاتی تھی۔ مولانا کی شگفتگی کی بہار ہر موسم میں پھول کھلاتی رہتی تھی، وہی فقرے، چٹکلے، لطف طبع، تبسم، خندہ جبینی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مولانا کے کمرے میں نہ کسی آندھی کا گزر ہوتا تھا، نہ ژالہ باری ہوتی تھی اور نہ کوئی آگ برستی تھی۔ بس ہر وقت باد بہار کے جھونکے اٹھلائے پھرتے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص نے بار بار اس تاثر کا اظہار کیا ہے کہ مولانا کی گفتگو کوئی الگ چیز ہے ان کے پاس جاتے ہی ایک نوع کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور ہم رفقاء کے درمیان تو یہ جملہ کئی بار دہرایا گیا کہ مولانا کے کمرے کا درجہ حرارت ہمارے کمروں سے مختلف ہوتا تھا۔''

ایک روز حکیم شمس الحسن صاحب نے فرمایا: ''مولانا ہم لوگوں کے ساتھ اپنائیت، سادگی اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے مگر ہم میں سے بیشتر رفقا بلکہ باہر سے آنے والے مشاہیر اہل

علم و اہل قلم بھی ایک حد تک مرعوبانہ انداز سے ملتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ کوئی شخص مولانا سے گفتگو میں حد سے تجاوز کر سکا ہو۔ ایسا بے تکلف ہو سکا ہو کہ اس کی آواز بلند ہو گئی ہو۔ میری نظر میں اس چیز میں مولانا کی روحانیت کو دخل تھا۔"

لفظ "روحانیت" پر میں چونکا تو شمس الحسن صاحب کہنے لگے: "حکیم صاحب، ہم تو علما کے مرکز سہارن پور میں پلے بڑھے۔ بڑے بڑے علما کو قریب سے دیکھا ہے اوراد و وظائف اور ظاہر کے اہتمام کا نام اگر روحانیت ہے تو ایسی روحانیت بہر حال مولانا میں نہیں تھی، لیکن اگر دین کی خدمت کے پر زور ولولے، اصلاح باطن کی مسلسل فکر و تدبیر، تزکیہ نفس کے لیے پیہم جدوجہد، انسان سے ہمدردی، عاجزی، ظلم سہنے اور سہے جانے کا ذوق، سخت سے سخت تنقید کا تحمل سے جواب بلکہ ہمت افزائی، اللہ تعالیٰ پر بھرپور بھروسا، رازوں کا ہر حال میں اخفا، جذبہ عفو، در مدح خود گفتن سے کامل احتراز، اپنی ستایش بہ کراہت سننے پر راضی ہونے سے اجتناب، عبادت میں خشوع و خضوع۔۔۔۔ ان باتوں کا نام بھی اگر "روحانیت" ہے تو یہ روحانیت مولانا مودودی میں بدرجہ تام پائی جاتی تھی، اور اسی لیے وہ مستجاب الدعوات تھے۔ ان کے بہت سے خواب سچے نکلے، ان کی زبان سے کسی کی غیبت نہیں سنی گئی، بلکہ ان کی محفل میں کوئی غیبت نہیں کر سکتا تھا۔"

"نماز ایسے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے کہ میں نے کسی کو اس طرح نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ کسی کی اعانت (اور بکثرت کرتے تھے) اخفا کے بڑے کامیاب اہتمام کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنی مدح و ستایش سننا ان پر بڑا شاق گزرتا تھا۔ کیونکہ اس سے زیادہ تحمل انھیں کسی اور چیز کے لیے نہیں کرنا پڑتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی مدح سن کر پسینے سے تر ہو جاتے اور شرما جاتے تھے۔ میں ان کی یہ ادا دیکھنے کے لیے ان کے سامنے اکثر ان کی تعریف کر گزرتا تھا۔ اللہ معاف فرمائے۔"

"جب دیکھتے کہ کوئی بحث پر اتر آیا ہے، تو چپ ہو جاتے۔ بات کرنے والے کی بات کبھی کاٹتے نہیں تھے۔ خواہ وہ کیسی ہی غلط بات کیوں نہ کہ رہا ہو۔ جب بولنے والا چپ ہو جاتا تو بولنا شروع کرتے۔ ان کی گفتگو کے دوران جونہی کوئی بول پڑتا تو فوراً چپ ہو جاتے، اسے بولنے دیتے۔ میں نے انھیں کبھی برہم اور خشم ناک نہیں دیکھا۔ ان کی کسی گفتگو میں جھنجلاہٹ

نہیں دیکھی۔ مختصر یہ کہ ان کے ساتھ ہمیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ ان کی صحبت میں رہ کر دنیا سے دل سرد ہو جاتا تھا۔''

''وہ صاف ستھرے رہتے تھے، جامہ زیب تھے، مزاج میں نفاست و لطافت تھی، اس لیے انھیں دور سے دیکھنے والے ان کو خوش حال اور امیر مزاج سمجھتے تھے، حالانکہ وہ بہت کم معاش تھے۔ ان کے ذرائع آمدنی بہت محدود تھے اور اکثر تنگ دست رہتے تھے، مگر انھوں نے اخراجات بہت کم کر رکھے تھے۔ ضروریات بہت محدود کر لی تھیں اور ضرورت کی چیزوں کو بہت سلیقے سے استعمال کرتے تھے۔ ان کے بعض کرتے کئی کئی سال سے ان کے پاس تھے۔ ایک بار پوچھنے پر بتایا یہ شیروانی ۲۵ سال پہلے سلوائی تھی۔ اپنے کپڑے خود دھو لیتے تھے، گھر کے بہت سے کام خود کرتے تھے۔ ہم نے ان کو ایندھن کے لیے لکڑی کاٹتے دیکھا ہے۔ بجلی کی وائرنگ، گھڑی گھنٹے کی صفائی اور درستی اور دروازے کھڑکیوں کی مرمت بھی خود کر لیتے تھے۔ اس طرح ان کے بہت سے اخراجات کم ہو جاتے تھے۔ اللہ اکبر، مگر سوء اتفاق سے یہی چیز بہت سے علمائے کرام کے نزدیک قابلِ اعتراض اور علما کی ''شان'' کے خلاف تھی اور مولانا کی دنیا داری کا ثبوت بھی قرار دی گئی۔''

حکیم شمس الحسن صاحب ہی نے بتایا: ''ایک بار رمضان میں مولانا مودودی کے اہل و عیال دہلی گئے ہوئے تھے، جو ملازم کھانا پکانے وغیرہ کے لیے رکھا تھا وہ فرض ناشناس، کاہل اور گندا تھا۔ مولانا اس کے طرزِ عمل سے تنگ تھے۔ ایک دن میں نے سنا کہ مولانا اپنے ملازم سے کہہ رہے تھے: ''تمھیں روز کہتا ہوں، مگر آج بھی سحری کے برتن اب تک بے دھلے پڑے ہیں۔ روزے میں ان کو دیکھنے سے الجھن ہوتی ہے۔'' دوسری شکایتیں بیان کر کے کہنے لگے: ''اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جیسا برتاؤ دوسرے لوگ کرتے ہیں اور جس زبان کے سننے کے تم عادی ہو وہی زبان میں استعمال کروں اور ویسی باتیں کہوں تو تمھیں مایوس ہونا پڑے گا، مجھ سے اس زبان و بیان کی توقع نہ رکھو۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر کے مجھے بتا دو۔'' کیسے عجیب انسان تھے کہ اپنے نا ہنجار ملازم سے شکایت بھی درخواست کی صورت میں کر رہے تھے!''

''اخلاق و کردار کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں مولانا محترم اتنے ہی دیر باز تھے جتنے ہم جلد باز ہوتے ہیں۔ انھیں اس نکتے پر بڑا اصرار تھا کہ اصلاح بڑی حکمت کے ساتھ بڑے

تحمل سے اور بڑی تدریج سے ہونی چاہیے۔ انھوں نے ہم لوگوں کی اصلاح کے لیے بھی ایسا ہی حکیمانہ اور طویل المیعاد منصوبہ بنایا تھا۔ ہم میں سے کوئی کسی رفیق کی اخلاقی کمزوری یا کوتاہی یا نوافل سے غفلت کی طرف متوجہ کرتا تو مولانا حکمت سے لبریز لہجے میں فرماتے: ''ان کی اصلاح ہو رہی ہے، مگر رفتار ست ہے، آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں؟'' ایک بار ایک صاحب کی ڈاڑھی رکھنے کا ذکر آیا تو ہم نے درخواست کی: ''آپ ان کو متوجہ فرمائیں'' تو جواب دیا: ''ڈاڑھی میری سنت تو نہیں ہے، سنت رسول ہے اور انھیں بھی معلوم ہے کہ سنت رسول ہے، اس لیے آپ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیں، تا کہ جب بھی رکھیں تو سنت رسول سمجھ کر رکھیں۔ میری یا آپ کی فہمایش پر یا دکھاوے کے لیے نہ رکھیں۔'' ان کو امید تھی کہ جلد ہی یہ جذبہ ان کے اندر سے ابھرے گا اور وہ ضرور ڈاڑھی رکھیں گے۔ اسی طرح ایک صاحب کا ذکر آیا کہ: ''ان کی داڑھی کی مقدار شرعی نہیں ہے۔'' ''آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ ڈاڑھی شرعی نہیں ہے یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ پہلے ڈاڑھی نہیں تھی اب ڈاڑھی ہے، ان شاء اللہ بڑھ جائے گی۔''

حکیم شمس الحسن کے بقول: ''مختصر یہ کہ اخلاق و کردار کی اصلاح کے لیے ان کے کچھ تجربے اور کچھ اصول تھے، جن کو غلط بہر حال نہیں کہا جا سکتا۔ صوفیا کے مختلف سلسلوں میں جو اختلافات ہیں اور تورع اور تقشف کا جو اختلاف ہے وہ صوفیا کے تجربوں پر مبنی تھے، ایک سلسلہ تربیت یہ بھی سہی۔''

منظور علی صاحب: (م: ۸ مئی ۱۹۸۵ء) آج ہمسائے سید موجد علی صاحب، رکن جماعت اسلامی کے ہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، جن کا نام منظور علی ہے۔ ایٹہ (یوپی، بھارت) کے رہنے والے ہیں اور اب بھی وہیں ہیں، آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں، ان کی عمر تقریبا ۶۶ سال ہے۔ محفل میں مولانا مودودی کا ذکر آیا تو بولے: ''میں مولانا کو جانتا ہوں، ان کے ہاں چھ سات سال ملازم رہا ہوں۔'' میرے سوالات کے جو جوابات انھوں نے دیے ان سے حسب ذیل حالات کا علم ہوا:

''۱۹۳۹ء میں مولانا مجھ کو لاہور لائے تھے۔ ۱۲ روپے میری تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا کا محلہ چوبرجی میں قیام تھا۔ سات آٹھ مہینے کے بعد اسلامیہ پارک منتقل ہو

گئے تھے۔ یہ مکان مولوی ظفر اقبال صاحب کا تھا، جن کے ایک بھائی ڈاکٹر ریاض قدیر بڑے قابل سرجن تھے۔ اسی مکان میں جماعت کا پہلا جلسہ ہوا تھا۔ میں جب پہنچا تو مولانا کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ اسے پیار سے جگو [عمر فاروق] کہتے تھے۔ پھر میرے قیام کے دوران دو بچے پیدا ہوئے، امن [احمد فاروق] اور بیٹی حمیرا۔ حمیرا کے لیے ایک آیا تھی، جو ضلع ہردوئی کی رہنے والی تھی۔ پھر ۱۹۴۲ء میں مولانا، دارالسلام منتقل ہو گئے۔ وہ جماعت اسلامی کی بستی تھی۔ وہاں قمر الدین خان کے علاوہ ایک ماسٹر صاحب جو مولانا کے بچوں کو پڑھاتے تھے، ایک جیلانی صاحب تھے۔ ایک توختہ صاحب مولانا کے تانگے پر ملازم تھے، شاید ترکستان کے رہنے والے تھے اور ان کا انتقال بھی وہیں ہوا تھا۔ مولانا کی والدہ صاحبہ بھی ساتھ رہتی تھیں۔ کچھ دن کے لیے مولانا کے بڑے بھائی صاحب بھی آ کر رہے تھے، وہ شاید حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے تھے۔

گھر اور دفتر میں مولانا چوڑے پائنچے کا پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ گاؤں سے باہر جانا ہوتا تو شیروانی اور قدرے تنگ موہری کا پاجامہ پہنتے تھے۔ مولانا کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ کھانا بہت سادہ کھاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔ کپڑے دھونے کا صابن مولانا مودودی خود بناتے تھے۔ مولانا زیادہ تر سفید کپڑے پہنتے تھے، جو بہت اجلے ہوتے تھے، کیوں کہ وہ کپڑے زیادہ میلے نہیں ہونے دیتے تھے۔ جلد بدل لیتے تھے۔ ایک بار مجھ سے بھی کہا: ''کپڑے زیادہ میلے نہ ہونے دیا کرو۔ آسانی سے اور جلد صاف ہو جاتے ہیں۔'' مولانا نے مجھ پر ایک بار بھی غصہ نہ کیا اور میں نے تو ان کو کسی پر غصے ہوتے نہیں دیکھا۔ مجھ سے بہت غلطیاں ہوتی رہیں، قیمتی برتن توڑ دیے، ویسے بھی میں بہت الھڑ اور بھلکڑ تھا، اس لیے اکثر کام خراب کر دیتا، مگر انھوں نے کبھی ایک لفظ بھی سخت نہیں کہا۔ فروری ۱۹۴۴ء میں، میں اپنے گھر چلا گیا۔ ملازمت میں نے خود چھوڑی تھی۔''

☆......☆......☆

حکیم سید اعظم علی شاہ جے پوری

مولانا حکیم سید دائم علی کے نواسے مولانا سید برکات احمد کے بھانجے اور شاگرد، جے پور کے نامور خاندان اطبا کے رکن، ریاست کے محلات شاہی کے طبیب، ایک صاحب دل بزرگ، ایک بلند پایہ طبیب، حکیم سید اعظم علی شاہ ابن حکیم سید قاسم علی شاہ ابن حکیم سید مظہر علی شاہ، ابن حکیم سید محمد شاہ۔ ❶

---

❶ حکیم سید محمد شاہ، جے پور کے معروف پیر طریقت حضرت مسکین شاہ کے بھانجے تھے، مسکین شاہ کشتوار (کشمیر) کے رہنے والے تھے، ایک بزرگ کے ایما پر اپنی روحانی تربیت کے لیے شاہ نیاز احمد (ف ۱۸۳۴ء) کے پاس بریلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے روحانی تربیت کی تکمیل پر انھیں اپنی خلافت عطا کی اور جے پور کو اپنا مرکز بنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ مسکین شاہ جے پور جا کر متوطن ہو گئے اور وہاں ایک وسیع حلقہ اعتقاد چھوڑ کر ۱۸۵۹ء میں واصل بحق ہوئے۔ حکیم سید محمد شاہ نے اپنے ماموں کی طرح کشمیر سے ہجرت کر کے جے پور میں قیام کیا اور جلد ہی ہر حلقے میں ایک طبیب کی حیثیت سے متعارف ہو گئے۔ ان کے فن اور کردار کی شہرت سن کر مہاراجہ رام سنگھ نے انھیں اپنی ڈیوڑھی (مہارانیوں) کا معالج مقرر کیا اور دو گاؤں (اونیا اور رلاؤتا) جاگیر میں پیش کیے، یہ عہدہ صرف نہایت معتمد اور متدین اطباء ہی کو پیش کیا جاتا تھا۔ حکیم سید محمد شاہ کے بعد ان کے فرزند حکیم سید مظہر علی شاہ اس منصب پر فائز ہوئے۔ ان کا مطب مرجع خلائق تھا۔ منصبی فرائض سے فراغت کے بعد ڈیوڑھی (محلات شاہی) سے لوٹتے ہوئے جو بھی راستے میں ان کا منتظر ہوتا اس کے ساتھ جا کر مریض کا معائنہ کرتے۔ معائنہ کی فیس نہ غربا سے لینا پسند کرتے تھے، نہ امراء سے۔ صوم وصلوٰۃ کے علاوہ وظائف کے پابند تھے۔ نسخہ چاہے غریب کے لیے لکھتے یا رئیس کے لیے نہایت ارزاں قیمت کا ہوتا تھا۔ حکیم مظہر علی شاہ نے ۱۹۲۵ء میں وصال فرمایا۔ ان کے اکلوتے صاحبزادے حکیم سید قاسم علی شاہ (ولادت ۱۸۷۶ء) کا عقد مولانا حکیم سید دائم علی کی دختر اور مولانا سید برکات احمد کی خواہر (امۃ الغنی) سے ہوا تھا مگر وہ صرف ۲۴ سال کی عمر میں ۱۹۰۰ء میں انتقال کر گئے۔ حکیم سید قاسم علی شاہ کے اکلوتے صاحبزادے حکیم سید اعظم شاہ تھے۔

ولادت ۱۸۹۹ء۔ فارسی وعربی کی کتابیں شہر کے اساتذہ سے پڑھیں، طب کی تعلیم اپنے فاضل دادا حکیم سید مظہر علی شاہ سے حاصل کی پھرانہی کے ایما پر اپنے ماموں مولانا سید برکات احمد سے علم وعمل طب کی تعلیم وتربیت حاصل کر کے ۱۹۲۰ء میں فراغت پائی اور اپنے دادا کے ساتھ مطب کا آغاز کیا اور دادا کے وصال کے بعد ۱۹۲۵ء میں خاندانی منصب اور جاگیران کو منتقل ہوگئی جس کا سلسلہ بائیس تیئس سال تک جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب اور بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھ کر ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور ایک معزز منصب اور بڑی جاگیر ترک کر کے آگئے اور حیدرآباد کو مستقر بنایا۔ یہاں آ کر ہجرت کے ثمرات سے خوب متمتع ہوئے، برسوں کے بعد جے پور کی جاگیر کے بدلے کلیم میں انھیں زمینیں ملیں جن سے استفادے کی راہ میں دفتری کارروائیاں اور دوسرے حالات حائل رہے۔ ۱۹۷۹ء میں وہ ''یہاں'' سے ''وہاں'' چلے گئے۔

حکیم سید اعظم علی شاہ، مختلف اعتبارات سے ایک قابل قدر اور لائق احترام شخصیت تھے۔ وہ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے باعزت اور صاحب ثروت اور علمی ودنیوی دولتوں سے سرفراز خاندان سے وابستہ تھے۔ ان کے نانا (مولانا حکیم سید دائم علی) رئیس ٹونک کے طبیب خاص اور ریاست کے وزیر خزانہ تھے۔ دادا (حکیم سید مظہر علی شاہ) اور پردادا (حکیم سید محمد شاہ) طبیب محلات شاہی جیسے ممتاز منصب پر فائز اور ریاست کے درجہ اول کے جاگیردار تھے گویا فن اور ثروت دونوں انھیں وراثت میں ملی تھیں، مگر فن سے انھوں نے ہمیشہ عشق کیا اور دولت وثروت کو ہمیشہ پائے تحقیر سے ٹھکراتے رہے۔

جاگیردار ہونے کی وجہ سے انھیں فن کو وسیلہ معاش بنانے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور دوسرے خوشحال اطباء کی طرح مطب اور نسخہ نویسی کے ذریعہ خدمت خلق کر سکتے تھے مگر انھوں نے فن کی ترقی کی خاطر دواسازی پر توجہ دی اور مسلسل تجربات کرتے رہے اور فرماتے تھے:

''عطاروں کے یہاں گنی چنی دوائیں ہوتی ہیں۔ صرف معمولات عامہ اور قرابادینی مرکبات ہوتے ہیں۔ عسیر التراکیب، کثیر الاجزا مرکبات اور بزرگوں کی ریاضت وجاں کاہی کے ثمرات کیا بیاضوں میں مدفون پڑے رہنے کے لیے ہیں۔'' اس لیے وہ وقت، توانائی اور سرمایہ صرف

کر کے دوائیں تیار کرتے اور مریضوں کو دیا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ہی عصر حاضر کے تقاضوں کو دیکھ کران کا رجحان قلیل المقدار ادویہ کی تلاوش کی طرف تھا اوران کی معمول مطب بیشتر ادویہ قلیل المقدار ہوتی تھیں۔تقلیل مقدار اور سرعت اثر کی خاطر ہی انھوں نے فن تکلیس کی طرف توجہ کی تھی۔بعض ایسے امراض پر بھی ان کی توجہات مرکوز رہتی تھیں، جن کی طرف دوسرے کم توجہ کرتے جیسے شیب غیر طبعی،ضعف قوہ بصر،سرطان، ناصورلثہ۔ضعف بصارت کے ازالے کے لیے انھوں نے متعدد تجربات اور زرکثیر صرف کر کے بالاخر ایک سرمہ تیار کرلیا تھا، جس کے استعمال سے خودان کی دورونزدیک کی عینکیں چھوٹ گئی تھیں اور وہ ستر اسی سال کی عمر میں نہ صرف دن کو بلکہ رات کو بے تکلف حمائل کی تلاوت کرلیا کرتے تھے۔اسی طرح انھوں نے سرطان کے کئی مریضوں کا بڑا کامیاب علاج کیا تھا۔

متقدمین اور متاخرین کی معالجات کی کتابوں کا مطالعہ وہ آخر تک کرتے رہے اور ان سے اخذ واستنباط کا سلسلہ غیر منقطع رہا۔کثرت مطالعہ کی بناء پر ضخیم مجلدات میں سے مطلوبہ مقام باآسانی اور ہم سے بہت پہلے نکال لیا کرتے تھے۔عہد حاضر کے اطبا اور طب جدید سے مستفید مصنفین کی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔مفردات کے افعال اور خواص پر ان کی معلومات اوران کا استحضار ہر طبیب کے لیے قابل رشک تھا۔کئی بار یہ اتفاق ہوا کہ ان کے کسی حیرت انگیز علاج کے سلسلے میں ان سے دریافت کیا تو بتایا کہ فلاں مفرد دوادی تھی۔حکیم صاحب کا ایک وصف قابل ذکر ہے۔دنیا اوراہل دنیا کو حقیر سمجھنے والا ان جیسا کوئی انسان میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔وہ دنیا اور اہل دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے اور کوئی بات کہنے، کوئی قدم اٹھانے، کوئی لباس پہننے، کہیں بیٹھ جانے، کسی سے ملنے سے پہلے کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ رواج کیا ہے، چلن کیا ہے، مقبول کیا ہے، نامقبول کیا ہے۔لباس، رہن سہن، وضع قطع، نشست وبرخاست، گفتگوغرض کسی بات میں وہ اہل دنیا کی پسند و ناپسند کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔مثال کے طور پر لباس کی غرض و غایت ان کی نظر میں یہ تھی کہ تن پوشی ہو، موسمی اثرات سے تحفظ ہو، آرام ملے۔اس لیے کپڑا خریدتے وقت اس کے اعلیٰ یا ادنیٰ معیار، اس کی قیمت کی کمی بیشی یا رنگ کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے۔پھر اس کے سلوانے میں مرجہ تراش وخراش کی

پابندی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی مرضی سے ترشواتے اور سلواتے تھے۔ ان کے اس انداز کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ خلقی ہے اور وہ فطرتاً لاابالی، درویش صفت اور آزاد رو واقع ہوئے ہیں۔ مگر ایک روز وہ موج میں تھے اور یہی موضوع تھا، فرمانے لگے: ''ہم بھی پہلے تمھاری طرح ''دنیا کیا کہے گی'' کے چکر تھے۔ ایسا لباس پہنیں، اس طرح بیٹھیں، مطب اس طرح سجائیں، اس طرح رہا کریں جس طرح لوگ چاہتے ہیں اور ایک طبیب سے توقع کرتے ہیں۔ غرض قدم قدم پر اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ دنیا کے رواج کے مطابق رہو تو دنیا پوچھے گی مگر ایک روز ہم رام نواس باغ (جے پور کے مشہور زو اور میوزیم) سے گزر رہے تھے اور دوسرے حیوانات کے ساتھ ایک گدھا بھی پنجرے میں تھا اور اس وقت اسے راتب دیا جا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی دل لوٹ گیا۔ اچانک خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ جب گدھے کو اس اہتمام کے ساتھ وقت پر رزق پہنچاتا ہے تو کیا ہمیں نہیں پہنچائے گا، ہم کیوں رزق کی فکر میں اور اس کی خاطر خود پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کریں کہ یہ نہ پہنو، ایسے نہ بولو، یوں نہ چلو، ایسے نہ بیٹھو، بس اس دن سے دماغ سے یہ بوجھ اتر گیا'' کہ دنیا کیا کہے گی''؟ اور الحمدللہ بڑے مزے میں ہیں، اور تم لوگوں پر ترس آتا ہے کہ کس مصیبت میں ہو؟''

فرائض و واجبات کے ساتھ اوراد و وظائف کا خاص اہتمام کرتے تھے، ہر نماز کے بعد پانچوں وقت کلام اللہ کے چند رکوع التزاماً تلاوت فرماتے تھے۔

لڑے لڑکیوں کی شادی کروانے کا بہت شوق تھا، جلد شادی کر دینے کے قائل تھے۔ ماں باپ کو سمجھاتے، مجبور کرتے کہ بچوں کی شادی سے فارغ ہو جاؤ اور چوں کہ اپنی سب بچیوں کی شادیاں نہایت سادگی سے کر چکے تھے اس لیے ماں باپ کے عذر بے سروسامانی کو تسلیم نہیں کرتے تھے، ''بہ جبر بزرگی'' طرفین کے والدین کو مہلت دیے بغیر نکاح کروا دیتے تھے۔

☆......☆......☆

محمود احمد عباسی

محمود احمد عباسی صاحب مرحوم سے میرا تعارف پاکستان آ کر غالباً ۵۴-۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ انھیں کسی کتاب کی ضرورت تھی اس لیے کسی کی نشان دہی پر میرے یہاں آئے تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ہمارے استاد امام طب حکیم فرید احمد صاحب عباسی مرحوم و مغفور کے چھوٹے بھائی ہیں تو ایک قرب کا پہلو نکل آیا اور طرفین کی آمد و رفت شروع ہو گئی ان کے اور ان کے اہل و عیال کی خدمت علاج کے بھی مواقع بار ہا ملے۔

کچھ ہی دن کے بعد ان کی کتاب کے چرچے علمی حلقوں میں شروع ہوئے مگر مطالعے کی لت کے باوجود مجھے اس کتاب کے مطالعے کی اکساہٹ نہیں ہوئی کیونکہ اہل تسنن اور اہل تشیع کے اختلافات میرا موضوع فکر و مطالعہ ہیں، نہ میری افتاد مزاج کو خلافیات سے کوئی مناسبت ہے، نہ میں ان مناقشات کو امت محمدیہ (علیہ الصلوۃ والسلام) کے حق میں مناسب اور مفید سمجھتا ہوں اور تاریخی، کلامی یا فقہی مسالک کے اختلاف کے بجائے عقائد کے اشتراک اور متفق علیہ امور پر نگاہ رکھتا ہوں۔ بہر حال میں یہ کتاب نہ پڑھ سکا، مگر ایک بار خود عباسی صاحب مرحوم ہی نے مجھے "خلافت معاویہ و یزید" عنایت فرمائی تو اسی مطالعے کی لت کے ہاتھوں اس کا مطالعہ کر گزرا اور خلاف مزاج پا کر الماری میں سجا دی اور یوں عباسی صاحب کے افکار و آراء کا تعارف حاصل ہو گیا۔ لیکن اس موضوع پر ان سے گفتگو کی کبھی نوبت نہیں آئی حالانکہ انھوں نے بار ہا

سلسلہ چھیڑا مثلاً ایک بار انھوں نے فرمایا ''تم حسنی سید ہو یا حسینی؟'' میں اس سے پہلے کئی حضرات سے سن چکا تھا۔ کہ وہ شجروں اور انساب پر گفتگو کرتے ہیں اس لیے تڑاخ سے جواب دیا کہ ''میں نے آپ سے کب کہا کہ میں سید ہوں''؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ اسی طرح جب میں نے سر سید کے سیاسی کردار پر تنقید کی تو عباسی صاحب ایک روز فرمانے لگے: ''کل ہمارے ایک دوست کہہ رہے تھے کہ تمھارے عزیز (میری طرف اشارہ تھا) نے تمھارے مقتدا (سر سید) پر بڑی سخت تنقید کی ہے۔'' تو میں نے برجستہ جواب دیا کہ ''جی ہاں وہ صاحب مجھ سے بھی کہہ رہے تھے مگر میں نے ان سے کہہ دیا کہ عباسی صاحب نے ہمارے نانا (سیدنا حسینؓ) کو نہیں بخشا تو ہم ان کے مقتدا کو کیوں بخشتے'' اس پر وہ بڑی دیر تک ہنسے اور بات آئی گئی ہوئی۔

عباسی صاحب سے ان ملاقاتوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ معمولی صلاحیتوں کے آدمی تھے، عربی غالباً بالکل نہیں جانتے تھے، فارسی پر بھی عبور نہیں تھا۔ میں نے ان کو فارسی کی غلط عبارتیں پڑھتے کئی بار سنا ہے، تحریر کا کام بھی وہ مسلسل نہیں کرتے رہے، آغاز عمر میں تاریخ امروہہ، تحقیق الانساب اور تذکرہ الکرام لکھی تھیں۔ اس کے بہت عرصے بعد ۷۰ سال سے زیادہ کی عمر میں ''خلافت معاویہ و یزید'' لکھی۔ اس کتاب کے سلسلے میں ان کو متعدد اہل علم وقلم کا تعاون حاصل تھا، جن میں سے ایک نام کے متعلق مجھے تحقیق ہے اور وہ ہے مولانا تمنا عمادی کا نام، جو ان کے لیے کتب تاریخ سے اقتباسات اور ان کے ترجمے لکھ کر بھیجا کرتے تھے، ایک بار وہ عباسی صاحب کے یہاں چند روز مقیم بھی رہے اور وہاں بھی میں نے انھیں یہی کام کرتے دیکھا ہے۔

دوسرا تاثر میرا یہ ہے کہ وہ اپنی تحریک کے سلسلے میں مخلص نہیں تھے۔ زبان وقلم سے رد شیعیت کے باوجود اہل تشیع سے ان کے گوناگوں مراسم تھے۔ ایک بار میں پہنچا تو چند نام ور شیعہ اہل قلم ان کے یہاں بیٹھے تھے اور بڑا پر تکلف ناشتہ کر رہے تھے اور بہت اپنائیت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد از خود صفائی کرنے لگے کہ ان بچوں سے وطن ہی سے مراسم ہیں، بڑی محبت کرتے ہیں، میرا بڑا لحاظ کرتے ہیں، میں نے ''جی'' کہہ کر بات ٹال دی کہ مجھے اس سے کیا دلچسپی؟ اسی طرح ایک بار انتخابات میں انھوں نے ایک شیعہ امیدوار کو

ووٹ دیا اور میرے سامنے ایک صاحب کے سوال کے جواب میں اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس کے خاندان سے قدیم مراسم ہیں اور میں اسے اہل سمجھتا ہوں۔ ایک بار ان کی اہلیہ محترمہ، جو مجھ پر بڑی شفقت فرماتی تھیں، اپنے ایک ہمسائے کی شکایت کرنے لگیں کہ وہ آج صبح انھیں (عباسی صاحب کو) گالیاں دے رہا تھا اور یزید اور یزید کی اولاد تک کہہ گیا۔ اس پر میں نے ازراہِ تفنن کہہ مارا کہ "یہ تو آپ کے نقطہ نظر کے پیش نظر مدح ہوئی، قدح نہیں ہوئی۔" اس پر وہ بہت برہم ہو گئے اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے، اور ان کی اہلیہ محترمہ کہنے لگیں "کیوں چھیڑتے ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ میرے خیال میں وہ دل سے یزید دوست اور شیعہ دشمن نہیں تھے بلکہ دانستہ یا نادانستہ کسی اسلام دشمن تحریک یا طاقت کا آلہ کار تھے اور افتراق بین المسلمین کی مہم میں سرگرم تھے۔ میں نے ان میں شیعیت کے مظاہر تو کئی بار دیکھے (مثلاً مجالس تک ان کے یہاں برپا ہوتی تھیں اور وہ ذکر کر کے روتے اور رلاتے تھے) مگر ان کی پابندی احکام شریعت کا کوئی منظر اور واقعہ میرے علم و ذہن میں نہیں ہے، کم سے کم میں نے ان کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا نہ کسی سے سنا۔ تجارت اور معاشی منفعت بھی اس مہم میں یقیناً ان کے پیش نظر تھی، ایک بار نیاز فتح پوری کا ایک خط انھوں نے ایک دوسرے خط کے دھوکے میں مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ میں بھی جب خط پڑھ چکا تو پتہ چلا کہ یہ وہ مطلوبہ خط نہیں ہے۔ خط واپس کیا تو وہ بھی چکرا سے گئے۔ بہرحال اس خط کا جو مفہوم ذہن میں متحضر ہے کچھ اس قسم کا تھا کہ خوب کتاب لکھی ہے، کچھ ہنگامہ گرم رہے گا، لطف رہے گا۔ خوب نکل رہی ہو گی، میں نے بھی اس پر تبصرہ لکھا ہے، کتابی شکل میں بھی آئے گا، اسے وہاں نکلوائیں اور اپنی کتاب کے اتنے نسخے تاجرانہ نرخ پر مجھے بھجوائیں، کہ تبصرہ پڑھ کر کتاب کی مانگ بھی آئے گی۔

اسی طرح ایک صاحب سے جو نہ خدا کے قائل تھے نہ مذہب کے ان سے اپنی تحقیق کا ذکر کر کے چاہتے تھے کہ وہ رائے دیں، انھوں نے کہا "میری رائے کا کیا کریں گے، میری نظر میں آپ کے حسین اور آپ کے یزید دونوں گھٹیا تھے، عالمی سطح پر ان کی حیثیت نہیں ہے، تاریخ عالم کے اکابر میں ان کو محسوب نہیں کیا جا سکتا۔ تخت کے دو معمولی امیدوار لڑ پڑے تھے اور ایک

مارا گیا۔'' اس پر عباسی صاحب نے تائید اور مسرت کا اظہار ایک قہقہے سے کیا اور انگریزی میں چند جملے کہے جن کا مفہوم یہ تھا کہ بالکل یہی رائے میری اور ہر پڑھے لکھے آدمی (ایجوکیٹڈ) کی ہے۔ مگران صاحب (جنٹل مین) کے سامنے بات نہ کیجیے۔ یہ لوگ قدامت گزیدہ (آرتھو ڈکس) ہوتے ہیں۔ عباسی صاحب نے مجھے انگریزی سے نابلد سمجھا تھا، میں نابلد ہی بنا رہا اور اجازت چاہی جو بڑی خوش دلی سے دے دی گئی۔ میرے بعد باہم گفتگو ہوئی ہوگی کہ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ میں تو خود روشن خیال اور آزاد فکر ہوں، مگر ایک فرقے کو بہکانا اور معاشی منفعت حاصل کرنا ہے۔ اس قسم کے حضرات کو صرف معاشی منفعت ہی حاصل ہو کر رہ جاتی ہے یا پھر اس کے ساتھ کوئی عالی منصب اور شہرت بھی مگر اصل منفعت تو کفار کو حاصل ہوتی ہے، یہود کو حاصل ہوتی ہے، اسلام دشمنوں کو حاصل ہوتی ہے جنھیں اگر کوئی خطرہ ہے تو اس امت کی بیداری سے ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور ان میں تاریخی، کلامی اور فقہی مسائل پر اختلافات کی آگ کو اپنے دامن دولت سے ہوا دے کر فروزاں کرتے ہیں۔

ان کے مسلک کے بودے پن کے سلسلے میں یہ دلچسپ واقعہ بھی سننے کا ہے۔ ایک بار معلوم ہوا کہ لاہور سے حکیم حسین احمد صاحب عباسی مرحوم آئے ہوئے ہیں اور محمود احمد عباسی صاحب کے یہاں مقیم ہیں۔ چنانچہ میں اور میرے رفیق درس اور عزیز دوست حکیم جامی صاحب (جو کوٹری سے حسین میاں سے ملنے کے لیے ہی تشریف لائے تھے) عباسی صاحب کے یہاں پہنچے۔ حسین میاں تو نہیں ملے البتہ عباسی صاحب ضرور مل گئے اور حسب عادت وہی موضوع چھیڑ دیا۔ میں حسب دستور تحمل سے کام لیتا رہا مگر جامی صاحب تحمل کے قائل نہیں اور رد باطل کے لیے ہمہ وقت آمادہ و مستعد رہتے ہیں اور زبان و بیان تک کی اغلاط کی تصحیح کو جہاد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عباسی صاحب اسلامی تاریخ کے مآخذ پر گفتگو کر رہے تھے اور طبری وغیرہ کو نامعتبر بتا رہے تھے۔ اچانک سیدنا حسین کے لیے فرمانے لگے ''انھیں خناق کا مرض تھا اور اطبا نے لکھا ہے کہ اس مرض میں مبتلا انسان کی قوت فیصلہ بہت متاثر ہو جاتی ہے''۔ اب جامی صاحب کے جہاد کی گھڑی آ گئی تھی۔ عباسی صاحب سے پوچھا کہ یہ بات کس نے لکھی ہے؟ عباسی صاحب روانی میں کہہ گئے کہ طبری نے لکھا ہے۔ اس پر جامی صاحب نے ایک بڑے زہریلے قسم کا

طنزیہ قہقہہ سر کیا اور بولے جی ہاں وہی طبری جو نا معتبر ہے۔ اس پر عباسی صاحب نے اپنے موقف کے ضعف کو اپنی برہمی سے قوت میں بدلنا چاہا اور آپے سے باہر ہو گئے، کھڑے ہو کر کہنے لگے "میرے بھائی (بابائے طب مرحوم و مغفور) کا شاگرد ہو کر مجھ پر تنقید کرتا ہے" اور ایسی ہی حواس باختگی کی بہت سی باتیں بڑے جوش غضب کے عالم میں کہہ گزرے۔ جامی صاحب نے، جو ایسے معرکوں کے عادی اور ماہر اور جسمانی صحت سے بھی مایہ دار ہیں، بڑے اطمینان اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "بڑے میاں! پہلے تو بیٹھ جاؤ، ہانپ رہے ہو، پھر تم اس یگانہ وقت اور باخدا بزرگ (بابائے طب) سے کیا نسبت رکھتے ہو اور ان سے نسبت جتاتے ہو جس کی تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں، اگر ہے تو اسے ثابت کرو اور اچھے آدمیوں کی طرح معقولیت سے بات کرو، اپنی باتوں کے تضاد کو رفع کرو اور اگر کشتی ہی لڑنا ہے تو لو میں بھی کھڑا ہو جاتا ہوں" (اسی دوران دونوں کی بلند آوازیں سن کر زنانے میں سے ایک نوجوان غالباً نواسہ نکل آیا تھا اسے مخاطب کر کے جامی صاحب نے پچکارتے ہوئے کہا) "میاں! ابا کی مدد کے لیے صرف تم سے کام نہیں چلے گا۔ اللہ کے فضل سے ۲۵ آدمیوں سے بیک وقت لڑوں گا" وہ نوجوان تو مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور میں نے جامی صاحب کی آتش جلال کو سرد کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا کہ جامی صاحب کڑکے "معاف فرمایئے، محمود میاں! میں باطل اور گمراہ کن اور بے سروپا باتیں سن کر آپ کی طرح خاموش ہو جانا اور تردید کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ اب میں اس شخص کو بھگتنے کے لیے کیا کوٹری سے پھر کبھی آؤں گا۔ یا یہ مجھے معقول جواب دے ورنہ میں (اپنے بھرے بازو دکھاتے ہوئے) ان کو حرکت میں لاؤں گا۔" عباسی صاحب یہ عالم یہ رنگ دیکھ کر بڑے خوف زدہ اور بدحواس سے ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے مراسم کے زور پر جامی صاحب کو بہ جبر التواء جہاد پر آمادہ کیا اور ان کو گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے آیا۔

عباسی صاحب سے آخری ملاقات یوں ہوئی کہ میرے فاضل دوست جناب اقتدا ہاشمی صاحب اور میں عباسی صاحب کے یہاں گئے۔ ہاشمی صاحب تاریخ اسلام پر بڑا عبور رکھتے ہیں اور ان کے اور عباسی صاحب کے درمیان کتب مطالعہ کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ تو ایک دن ہاشمی

صاحب اور میں عباسی صاحب کے یہاں گئے۔ عباسی صاحب اور ہاشمی صاحب اسی موضوع (حسین ویزید) پر گفتگو کرنے لگے، میں ایک کتاب ہاتھ میں لے کر وقت گزارنے لگا۔ مطالعہ سے میری توجہ بلند ہوتی ہوئی آواز نے ہٹائی۔

ایڈیٹ؟ (بیوقوف)

ہاں، ایڈیٹ تھا

علی ایڈیٹ، علی ایڈیٹ

لیس علی ایڈیٹ، علی واز ایڈیٹ۔

اور ہاشمی صاحب جو پاؤں اٹھائے تخت پر بیٹھے تھے پاؤں لٹکا کر جوتا پہنتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے ''حکیم صاحب! آپ ٹھیریں گے؟ میں تو چلا، اب برداشت کی بات نہیں رہی۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، ''فوراً چلیے، اب یہاں کبھی نہیں آنا ہے توبہ توبہ!'' اور عباسی صاحب ''حکیم صاحب، ہاشمی صاحب'' چیختے رہے مگر ہم وہاں سے نکل آئے اور پھر کبھی وہاں نہیں گئے، یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں عباسی صاحب اس کے دربار میں پہنچ گئے جس کے سامنے ان کا باطن ظاہر ہوگا۔

☆......☆......☆

مولانا سیّد محمد جعفر شاہ پھلواروی

مولانا جعفر شاہ مرحوم و مغفور اور ہمارے تعلقات کا ایک سلسلہ ہے۔
ہمارا پہلا مرکز اشتراک تو شہر عظیم آباد تھا جس کا ایک قصبہ ان کا وطن اور ایک قصبہ ہمارا آبائی وطن تھا۔ ان کے بزرگ مولانا شاہ سلیمان اور مولانا بدرالدین سے میرے جد مولانا سید برکات احمد کے مراسم تھے۔ مولانا شاہ قمرالدین، مولانا شاہ نظام الدین، مولانا شاہ حسین میاں کی میں نے بھی زیارت کی ہے۔ مولانا شاہ امان اللہ اور مولانا عون شاہ احمد میرے رفیق درس رہے ہیں۔ اور پھر مولانا حسن مثنیٰ ندوی نے اور میں نے کراچی میں ان دیرینہ روابط کو تازگی دی اور کتاب ماضی میں ضمیمہ حال کا اضافہ کیا۔

دوسرا نقطہ اشتراک فکر و نظر کا اتحاد تھا، وہ ندوی تھے، صرف اس لیے نہیں کہ ندوہ میں تعلیم پائی تھی بلکہ پیدائشی ندوی تھے۔ یعنی مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے فرزند و جانشین تھے جو علما کی مرکزیت، اتحاد و نفاق اور درسِ نظامی میں تبدیلی کی تحریک کے اساطین میں سے تھے اور میں بھی طبعاً فرقہ واریت، قدامت پسندی، تنگ نظری، تصلب و تشدد اور ملایانہ یبوست سے نفور اور بیزار واقع ہوا ہوں اور ان امراض مزمنہ کو ملت کے لیے ہلاکت خیز اور مضرت ناک سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ ازل ہی سے ہماری روحوں کے درمیان ارتباط تھا۔ ان سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو اس طرح ہوئی جیسے یہ پہلی ملاقات نہ ہو برسوں سے شناسائی ہو اور واقعہ بھی یہی تھا۔

اللہ غریق رحمت کرے شفیق بریلوی مرحوم کو، وہ آئے دن دعوتیں کرتے رہتے تھے اور مجھ پر اتنے حاوی تھے کہ میری انجمن بیزاری اور خلوت پسندی کو استثنا کا پہلو نکالنا پڑتا تھا۔ اکثر وہاں مولانا سے نیاز حاصل ہوتا تھا اور دیر تک انکی عالمانہ، بے تکلفانہ اور شاعرانہ گفتگو سے استفادہ و احتظاظ کے مواقع حاصل ہوتے تھے۔ کبھی موج میں آتے تو رومی، اقبال اور خود اپنے اشعار اپنے مخصوص و دل آویز ترنم میں سناتے اور سماں باندھ دیتے۔ اشعار، لطائف اور خاصانِ دین و ادب کی حکایات ان کا دل پسند موضوع تھے۔ حافظہ و ذاکرہ بڑا قوی تھا۔ زبان میں بڑی طلاقت تھی۔ گفتگو کتنی ہی دراز کیوں نہ ہو جائے گراں نہیں ہوتی تھی، دلچسپی برقرار رہتی تھی۔

معروف معرکہ آرا خلافیات پر انھیں بولتے نہیں سنا۔ ان کے بجائے متعدد ایسے فقہی، کلامی اور تاریخی مسائل کو جو جمہور کے متفق علیہ سمجھے جاتے رہے تھے انھوں نے مختلف فیہ بنا دیا تھا اور ان پر اپنی تحقیق کا اظہار تحریر میں متانت و شائستگی اور دلائل و شواہد کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ ان کی تحقیق سے اختلاف کیا جاسکتا ہے بلکہ کیا گیا ہے مگر سطحیت یا عصبیت یا تجدد پسندی کا کوئی داغ اُن کے دامن پر نظر نہیں آیا۔ جماعت اسلامی میں شرکت کی مگر جماعت کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو سکے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے ایک ہی سال بعد بڑی شرافت اور خاموشی کے ساتھ علاحدہ ہو گئے اور بعد کے چالیس برسوں میں جماعت یا مولانا مودودی کے خلاف لکھنے پر انھیں آمادہ نہیں کیا جاسکا۔ مولانا مودودی کے متعلق بڑی بلند رائے ظاہر فرمائی اور یہ بھی بتایا کہ اب بھی مولانا مودودی سے میرے تعلقات ویسے ہی شگفتہ ہیں اور ترک جماعت کا کوئی اثر طرفین نے ذاتی مراسم پر نہیں پڑنے دیا۔

ایک مشہور خانقاہ میں نشو و نما پائی تھی، مگر خانقاہی نظام، خانقاہی رسوم و آداب بعض خانقاہی نظریات و روایات اور صوفیا میں متداول بعض اوراد پر بے باکی سے نقد و جرح فرمایا کرتے تھے جو اپنی ندرت کی بنا پر میرے لیے حیرت و عقیدت کا موجب ہوتے۔

مجھے یہ سوچتے ہوئے اور لکھتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں بہت کم، بہت ہی کم ایسے علماء رہ گئے ہیں جو کسی ایک گروہ سے وابستہ اور مبتلائے عصبیت نہ ہوں۔ میں اپنے علم کی حد تک شہادت دیتا ہوں کہ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی اُن چند علماء عصر میں سے

جو نہ دیوبندی تھے نہ بریلوی، انھیں میں نے ہر گروہ کے فضلاء کے فضل و کمال کا ایک ساتھ معترف پایا۔ میں نے انھیں ہر گروہ کے مصنفین و مدرسین کے صحیح افکار کی صحت کا برملا اور واشگاف اعتراف کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ مذہب فقہی کے باب میں وسیع النظر اور وسیع المشرب تھے مگر دین کی حمایت و نصرت میں بڑے چاق و چوبند اور حساس واقع ہوئے تھے اور یہ صفت بڑی ہی نادر اور بے حد قابل قدر اور لائق تقلید ہے۔

مولانا مرحوم غالباً عمر کے نصف اول میں خطابت کی طرف زیادہ متوجہ رہے اور اسی لیے ان کی بیش تر تالیفات گزشتہ تیس سال میں سامنے آئیں۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے تعلق کے بعد شاید وہ ادھر متوجہ ہوئے۔ اپنی ان تالیفات میں بعض مابہ النزاع اور معرکہ آرا موضوعات پر دادِ تحریر دی اور اپنے نتائج تحقیق پیش کیے۔ مولانا کے نتائج تحقیق بالعموم جمہور کے مسلک سے مختلف نکلے۔ مگر میری نظر میں اصل اہمیت نتائج کی نہیں اصل اہمیت طریق استشہاد اور اندازِ استدلال کی ہے کہ وہ منطق اور دیانت پر مبنی ہے کہ نہیں۔ مولانا کے انداز تحقیق میں نہ اصولِ موضوع سے انحراف پایا جاتا ہے، نہ لہجے کی شائستگی مجروح ہوتی ہے۔ انھیں جراتِ اظہار جیسی دولتِ نایاب بھی ودیعت ہوئی تھی۔ وہ صرف اپنے دماغ سے سوچنے کے خوگر تھے اور اپنے افکار کو قلم بند کرتے ہوئے اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ اس باب میں فلاں فلاں بزرگ کیا فرما گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت اور بے حد مسرت ہوئی کہ اس میں خود ان کے والد محترم کی عقیدت بھی حارج و مانع نہیں ہوئی۔

مولانا کی ایک اور مابہ الامتیاز صفت میری نظر میں یہ ہے کہ کسی فتوائے تکفیر پر ان کے دست خط اور تائید و تصویب میری نظر سے نہیں گزری۔ اس صفت میں بھی دور حاضر کے بہت کم علما ہی ان کے مثیل و سہیم نکلیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان علماء ہی کے متبع، ہم نوا اور ہم مسلک تھے جو تکفیر مسلمین اور جہاد بالمومنین کے قائل نہیں ہوتے بلکہ تکثیر مسلمین کے درپے ہوتے ہیں، جو اکرام مسلم کے قائل ہوتے ہیں، جو کفر کے پہلو کی فکر و تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتے، ایمان کے پہلو نکالنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں، جو اپنوں کے لیے ''رحما'' ہوتے ہیں اور دشمنانِ دیں کے لیے ''اشدا'' ہوتے ہیں۔

ایوب قادری مرحوم کی یاد میں

غالباً ۱۹۵۸ء میں پہلی بار ایوب صاحب مرحوم کا نام سنا اور انھیں دیکھا۔ وہ مولانا عبدالرشید نعمانی کے ساتھ غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ پہلی ملاقات میں مجھ کم نظر کو انھوں نے زیادہ متاثر نہیں کیا تھا اس لیے ابتداءً ہمارے روابط سست روی سے آگے بڑھے مگر جلد ہی اتفاق و اتحاد کے پہلو روشن ہوتے چلے گئے اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اور فاصلے سمٹنے لگے۔ اب اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں۔ ان ملاقاتوں میں علمی موضوعات پر گفتگو کے علاوہ نجی معاملات پر مشورے ہوتے اور وہ مجھ سے اور میں ان سے بہت سی راز کی اور گھریلو باتیں بیان کر دیا کرتا تھا جو دوسروں سے نہیں کہا جاتا حالانکہ یہ تاثر عام ہے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے کھلتے نہیں تھے۔

اس تقریباً ۲۵ سال کے قرب و اخلاص میں ان کی سیرت کے جو محاسن میرے علم اور مشاہدے میں آئے ان میں سے چند خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

سب سے نمایاں اور اہم رخ جسے میں ان کا عنوان حیات کہہ سکتا ہوں یہ تھا کہ وہ ایک طالب علم (Scholor) تھے۔ طالب علم ہونا ایک قابل افتخار نعمت و دولت ہے جو کمیاب بھی ہے۔ میلوں سفر کرنے کے بعد کہیں کوئی طالب علم ملتا ہے' لیکچرر، پروفیسر، ڈاکٹر اور صدر شعبہ قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ایوب صاحب طالب علم تھے طالب سند نہ تھے۔ طالب سند حصول سند کے بعد' کتاب سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے اور مطالعے کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے اور پھر علم اس سے

گریز کرتا ہے اور وہ علم سے۔ طالب علم کا رشتہ علم سے ہمیشہ استوار رہتا ہے بلکہ اور محکم ہوتا جاتا ہے اور اس کے طلب علم کا سفر کسی ایک منزل پر پہنچ کر منتہی نہیں ہوتا بلکہ ہر منزل پر پہنچ کر اس کو دوسری کئی منزلوں کے راستے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ جب تک زندہ رہتا ہے طالب علم رہتا ہے جب تک اس کی بینائی ساتھ دیتی ہے مطالعے سے باز نہیں آتا' رب زدنی علما کی دعا سے اس کے لب کبھی غفلت نہیں کرتے۔ ایوب صاحب نے اسناد بھی حاصل کیں مگر حصول اسناد کے بعد کتاب کو طاق پر نہیں رکھ دیا وہ ہمیشہ ان کی بغل میں ہی رہی۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ پڑھنے اور لکھنے میں گزارتے تھے اور ان کی گفتگو کا موضوع زیادہ تر علمی مسائل ہوتے تھے۔ دوسرے موضوع سے ان کی دلچسپی برائے نام ہی تھی۔ جب بھی ملاقات ہوتی اور کسی دوسرے موضوع پر گفتگو ضروری ہوتی تو شتابی سے فارغ ہو لیتے اور ''کام'' کی بات شروع کر دیتے'' فلاں کتاب پڑھی؟ اس رسالے میں وہ مضمون نکلا ہے'' فلاں کی تاریخ وفات نہیں مل رہی۔''

ان کی سیرت کا دوسرا قابل تقلید پہلو یہ تھا کہ انھوں نے ایک میدان منتخب کر لیا تھا اور اسی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ تاریخ کا ذوق ان کو ودیعت ہوا تھا اور انھوں نے ایک علاقہ اور ایک دور مخصوص کر لیا تھا کہ اس میں تخصیص حاصل کریں گے اور بالآخر یہ تخصیص حاصل کر لی تھی۔

''یک فن گیر تا یکتا شوی'' ایک تجربہ کارانہ مقولہ ہے۔ اور اس کو نظر انداز کر کے تخصیص سے محروم رہ جانے والوں کی قابل رحم حالت کچھ یوں ہوتی ہے کہ پیش طبیب ملا، پیش ملا طبیب و پیش ہیچ ہر دو پیش ہر دو ہیچ۔

تیسری بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ وہ نہ صرف خود کسی نہ کسی موضوع پر تحقیق و تلاش میں مصروف رہتے بلکہ احباب کو بھی مسلسل متوجہ کرتے رہتے تھے اور انھیں نہ صرف موضوع منتخب کر کے دیتے بلکہ لوازمے کی بھی نشان دہی کرتے اور اس کے حصول میں بھی اعانت کرتے۔ بارہا اپنے کم کوش احباب کو انہوں نے کسی موضوع پر خامہ فرسائی کے لیے آمادہ کیا اور پھر بار بار یاد دلاتے رہے اور مہینوں حیلے اور عذر سنتے رہنے کے باوجود مایوس نہیں ہوئے اور مضمون لکھوا کر رہے۔ میری تالیف ''سیرت فریدیہ'' اور مضمون ''سلطنت خداداد کا کتب خانہ'' مرحوم کی اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہیں۔

ایوب صاحب زندگی لکھوا کر نہیں لائے تھے ورنہ وہ ایک علمی خانوادے کی بناڈال رہے تھے اور ان تمام لوازم سے مسلح تھے جو ایک بانی خاندان میں ہونے چاہئیں۔ مشکلات سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ' موانع کو خاطر میں نہ لانے کی ہمت، خطرات کا سامنا کرنے کے تیور، پیہم سفر کا ولولہ، طویل المعیاد منصوبہ سازی، جفاکشی، معیاری صحت، غرض وہ ہر طرح سے ایک بانی خاندان ہونے کی اہلیت اور استحقاق لے کر پیدا ہوئے تھے اور اس حیثیت سے بھی وہ میرے زیر مطالعہ تھے۔ کیونکہ ابتدائی عمر سے مجھے اس موضوع سے دلچسپی رہی ہے اور خاندانی عروج وزوال کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑی توجہ سے کرتا رہا ہوں۔ ایسے بہت سے حضرات میرے پیش نظر تھے اور ہیں جو کسی اہل علم یا صاحب ثروت یا مقتدر خاندان کے خاتم تھے یا ہیں اور اب بڑے خشوع وخضوع سے اس خاندان کو زوال وانجام تک پہنچانے کے لیے سرگرم ہیں۔ یہ لوگ بالعموم نازک طبع، کم ہمت، رخ بماضی، پشت بہ مستقبل اور تھکے تھکے ہوتے ہیں۔

اسی طرح چند بانیان خاندان بھی نظر میں رہے ہیں۔ ایوب صاحب بھی اس گروہ میں تھے وہ تقسیم کے بعد بھی مزید تین سال بھارت میں رہے اور بدایوں سے انٹرمیڈیٹ کر کے ۱۹۵۰ء میں وطن سے ہجرت کی اور ہجرت کے بعد نامساعد حالات میں ایک طویل اور صبر طلب سفر کا آغاز کیا۔ حصول تعلیم کی طرف توجہ کی تو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ ملازمت کا آغاز ایک سرکاری محکمے میں کلرک کی حیثیت سے کیا اور کالج کے شعبے کی صدارت تک پہنچے۔ ایک خستہ سے مکاں سے نکل کر ایک ذاتی اور وسیع وآراستہ مکان میں منتقل ہوئے۔ پہلی کتاب ''مولانا فیض احمد بدایوانی'' تقریباً ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی اور ۱۹۸۳ء تک ان کے تراجم و تالیفات وتصانیف کی تعداد دو درجن تک پہنچ گئی، جن میں مآثر الامرا جیسی کئی ہزار صفحات کی کتاب بھی ہے۔ کئی کتابیں زیر قلم تھیں، مقالات اس کے علاوہ۔ پچیس سال میں یہ ذخیرہ وہی جمع کرسکتا ہے جسے سانس پھولنے کا عارضہ نہ ہو، جو ہانپ نہ جاتا ہو، جو پچھلی نسلوں کے لیے سامان افتخار چھوڑ کر جانا چاہتا ہو۔۔۔ انھیں ہم سے جدا ہوئے آج دس سال ہو رہے ہیں۔ مگر وہ مرے نہیں ہیں وہ ہم جیسے ''مرتے ہی وفات پا جانے'' والوں میں سے نہ تھے، ایک خاتون ضرور بیوہ ہوگئیں چند بچے ضرور یتیم ہوگئے مگر ایوب قادری زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

بخاری صاحب

آج اچانک مطب میں مولوی محمود الحسن بخاری صاحب آ نکلے۔ برسوں بعد انھیں زندہ سلامت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور ماضی کی، بھولے بسرے ماضی کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ فرمانے لگے: ''ایک ضرورت سے حیدر آباد سے کراچی آنا ہوا تو تم سے بھی ملنے کو جی چاہا اور میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا آ پہنچا ہوں۔''

مولوی محمود بخاری ٹونک میں ہمارے مدرسہ خلیلیہ کے طالب علم تھے۔ درس سے فراغت کے بعد ٹونک ہی میں رہ پڑے۔ ٹونک ہی کے ایک گھرانے میں شادی کر لی۔ سید انوار احمد مرحوم انسپکٹر پولیس کی حقیقی بہن سے منسوب تھے۔ معاش کے لیے گھڑی سازی کرنے لگے۔ ملک تقسیم ہوا تو یہ بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور حیدر آباد میں قیام کی طرح ڈال دی۔ گھڑی سازی کو معاش کا ذریعہ برقرار رکھا۔ اب ماشاءاللہ صاحب سلسلہ یعنی ایک خاندان کے سربراہ ہیں۔ بیٹے بیٹیاں، بہویں داماد، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ہیں۔

میں نے بخاری صاحب سے ان کے برعظیم اور خصوصاً ٹونک آنے کے متعلق سوال کیا تو کہنے لگے کہ: ''ہم طلب علم دین کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ کچھ عرصہ افغانستان کے چند شہروں میں منقولات کی متوسطات کی تحصیل کی پھر رجحان معقولات کی طرف زیادہ ہو گیا اس لیے پہلے صوبہ سرحد پہنچ کر وہاں کے معقولین سے استفادہ کیا اور معقولیات کی کئی کتابیں کئی بار مختلف

مدرسین سے پڑھیں مثلاً ''الافق المبین'' تین بار تین علما سے پڑھی مگر تشفی نہیں ہوئی۔ اس لیے دہلی پہنچے اور وہاں کسی ایسے عالم کو تلاش کیا جو اس کتاب کی تدریس کا حق ادا کرتا ہو لیکن ایسے کسی عالم کا پتہ نہیں چلا اور بدایوں کے ایک مدرس کا، جن کا نام اس وقت ذہن میں متحضر نہیں ہے، پتہ چلا چنانچہ بدایوں پہنچے اور ان سے الافق المبین کا درس لینا شروع کیا لیکن چند دن کے بعد میں اندازہ ہو گیا کہ کسی نے غلط رہبری کی تھی اور یہ صاحب اس کتاب کی تدریس پر قادر نہیں ہیں۔ حسن اتفاق سے ایک عالم سے ملاقات ہوگئی جو تدریس کی مشغولیت تو نہیں رکھتے تھے مگر فارغ التحصیل تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تمھاری تشنگی صرف ٹونک میں رفع ہو سکتی ہے چنانچہ ہم نے ٹونک کا رخ کیا اور وہاں تمھارے والد، مولانا محمد میاں سے یہ کتاب پڑھنی شروع کی۔ پڑھنے میں لطف آیا، سوالات حل ہوئے اور بالآخر کتاب ختم کر لی۔ کتاب ختم کرنے کے بعد دورہ کی جماعت میں شرکت کی اور صحاح ستہ کی سماعت و قرات کرنے لگے اور اس سے فارغ ہو کر سند فراغت حاصل کی۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد معاش کا سوال درپیش آیا۔ تحصیل علم کے دوران تو صورت یہ بھی تھی کہ قیام مدرسہ کے دارالاقامہ میں تھا اور کھانا بھی مدرسے کے مطبخ سے ملتا تھا۔ نصاب کی کتابیں بھی مدرسے کے کتب خانے سے مستعار ملتی تھیں۔ اس کے ساتھ تمام طلبہ کو دو روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ مگر بخارا و تاشقند کے طلبہ کو تین روپے ماہانہ ملتے تھے کیونکہ ان مقامات کے طلبہ چائے نوشی کے بھی عادی ہوتے تھے۔ بہر حال تحصیل علم کے دوران تو معاش کا سوال پیش نہیں آیا لیکن فراغت کے بعد دارالاقامہ سے ہم ایک مسجد کے حجرے میں منتقل ہو گئے اور یوں قیام کا مسئلہ حل ہو گیا۔ ایک مقامی دوست نے ازراہ ہمدردی مشورہ دیا کہ گھڑی سازی کا فن سیکھ لو۔ ہمیں یہ مشورہ بہت پسند آیا کیوں کہ ہم علم دین کو وسیلۂ معاش بنانا فطرتاً گوارا نہیں کرتے تھے چنانچہ ہم نے اس دوست سے جو گھڑی سازی کی ایک چھوٹی سی دوکان کرتا تھا، یہ فن سیکھنا شروع کر دیا اور کچھ دن میں شد بد بھی ہو گئی۔ اس طرح ٹونک میں ہماری مستقل سکونت کا سروسامان ہو گیا۔''

بخاری صاحب سے مستقل سکونت کا ذکر سن کر میں نے دریافت کیا: ''بخاری صاحب! آپ نے ٹونک میں شادی کب کی تھی؟ اور کیسے کی تھی؟''

"آپ کو معلوم نہیں؟ ہاں آپ اس وقت کم سن تھے۔"

بخاری صاحب نے کہنا شروع کیا: "آپ کو یاد ہوگا، ہمارا ایک چھوٹا بھائی احمد بھی تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ٹونک آیا تھا۔ ساتھ ہی فارغ ہوا تھا۔ پہلے اس کی شادی ہوئی۔ اس کو متاہل دیکھ کر ہمیں بھی شوق ہوا اور ہم نے بھی شادی کر لی۔"

میں نے اس پر دونوں بھائیوں کی شادی کا قصہ تفصیل سے بیان کرنے کی درخواست کی اور بخاری صاحب نے بڑے بھولے پن اور سادگی کے ساتھ یہ قصہ سنایا مگر پہلے آپ مجھ سے ٹونک کے متعلق تھوڑی سی تفصیل سن لیں۔

راجستھان آج کل تو رقبے کے لحاظ سے بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور وہاں جمہوری نظام رائج ہے لیکن تقسیم سے پہلے اس صوبے کا نام راجپوتانہ تھا اور یہ صوبہ بائیس رجواڑوں (ریاستوں) کا مجموعہ تھا جن میں سے اکیس ریاستیں تو ہندو تھیں اور صرف ایک ریاست مسلمانوں کی تھی اور ریاست ٹونک کہلاتی تھی۔ اس ریاست کا قیام نواب امیر خاں اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ کے نتیجے میں ۱۸۱۷ء میں عمل میں آیا تھا اور اس طرح راجپوتانے میں ایک مسلم نو آبادی کا اضافہ ہوا تھا۔ اس کے آباد کاروں کا بڑا حصہ تو خود نواب امیر خان کے لشکر پر مشتمل تھا۔ پھر ان لوگوں نے، جو بیشتر روہیل کھنڈ اور سوات، بنیر وغیرہ کے باشندے تھے، اپنے اعزہ کو بلا بلا کر بسانا شروع کیا۔ چند سال بعد اس آبادی میں ایک اہم اور انقلاب انگیز اضافہ تحریک مجاہدین کے قافلے کی آمد سے ہوا تھا۔ سید احمد صاحب اور بہت سے رفقاء جب ۱۸۳۱ء میں شہید ہو گئے تو باقی رفقاء میں سے ایک گروہ شکار پور (سندھ) میں آ کر متحیرانہ ٹھہرا ہوا تھا۔ نواب امیر خاں کے جانشین وزیر الدولہ نواب وزیر خاں نے، جو سید احمد شہید کے مرید تھے، ان لوگوں کو ٹونک آ کر بس جانے کی دعوت دی اور یہ قافلہ ۱۸۳۵ء میں ٹونک آ کر بس گیا اور "قافلہ" ہی کے نام سے ایک پورا محلہ آباد ہو گیا۔ اس کے ایک عرصے بعد جب سن ستاون کا ہنگامہ جہاد برپا ہوا اور ناکام رہا تو ٹونک کو حیدر آباد دکن، رام پور وغیرہ کی طرح ایک پناہ گاہ سمجھ کر دہلی اور اسکے اطراف سے بہت سے شرفا اور ارباب علم و ادب بھی ٹونک پہنچنے لگے۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ اور طرح ٹونک میں ملک کے شرفاء کے

بہت سے خاندان جمع ہو گئے اور بڑی تعداد میں علماء دین بھی آئے یا بلائے گئے۔ خود والیان ریاست کا سپاہیانہ، سادہ اور دینی کردار پھر تحریک مجاہدین کے قافلے والوں کا نہایت گہرا اسلامی رنگ، نو آباد کار علما کی سیرتوں، ان سب عوامل نے مل کر ٹونک کی معاشرت پر دین کی گہری چھاپ لگا دی۔ اس دینی معاشرے کے جس پہلو کا اس وقت تذکرہ مقصود ہے وہ یہ ہے کہ کارواں در کارواں علما کی آمد سے درس وتدریس کا ہنگامہ گرم ہو گیا۔ اب ہر مسجد مدرسہ بن گئی اور نام ور اساتذہ اور اصحاب درس کا شہرہ سن کر دور دور سے طالبان علوم آنے لگے اور قال واقوال کی مجالس آراستہ ہو گئیں۔ ٹونک کے غریب اور سادہ دل عوام اور دین دار اہل ثروت ان طالبان علوم کی کس طرح پذیرائی اور میزبانی کرتے تھے، اس کا اندازہ یوں کیجیے کہ ان افغانی، سرحدی اور بخاری طلبہ میں سے ایک بڑی تعداد ٹونک ہی میں رہ پڑتی تھی اور ٹونک کے باشندے بڑے آسانی سے، بڑے شوق سے، بڑے فخر سے، کار ثواب سمجھ کر اور بعض بعض نیک دل مسلمان تو خود پیش کش کر کے اپنی لڑکیاں ان کے عقد میں دے دیا کرتے تھے حال آں کہ ان طلبہ کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہوتا تھا اور سسرال والوں کی ذمہ داریوں سے ایک ذمہ داری ان کے لیے ذریعہ معاش فراہم کرنا بھی ہوتا تھا۔ پھر ان طلبہ کے خاندان اور نسل کا کوئی پتہ ہوتا تھا نہ لڑکی کے سسرال کا کوئی وجود۔ ان کی واحد کوالی فیکیشن یہ ہوتی تھی کہ یہ "طالبیلم" (طالب علم) ہیں۔ سوا سو روپیہ چنور شاہی (ریاستی روپیہ) کا مہر بندھتا تھا جس سے زیادہ مہر باندھنے کی ریاست کی طرف سے شدید پابندی تھی۔ اور والیٔ ریاست کے حکم سے اس رقم میں اضافہ کیا جا سکتا تھا اور والیٔ ریاست کے حکم میں استثنا کی مثالیں نادر ہیں۔ لڑکی کے والدین ہی اس جوڑے کے لیے معاش کا انتظام نیز مکان اور اثاث البیت فراہم کرنے کے ذمے دار ہوتے تھے اور بڑے چاؤ سے وہ یہ ذمہ داری نباہتے تھے۔ یہاں اسی سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ فارسی کے زیر اثر افغانستان وترکستان وغیرہ میں "پیدا کرنا" حاصل کرنے' فراہم کرنے اور تلاش کرنے کے مفہوم کے لیے استعمال کرتے ہیں چنانچہ ایک "طالبیلم" نے جب ٹونک میں توطن اور تاہل کا فیصلہ کیا تو اپنے ایک مقامی اور ہم عمر شناسا سے بے تکلفی کے ساتھ ارشاد ہوا "صیب (صاحب)! تم ایک لڑکی پیدا کرو، ہم اس سے شادی

ے گا۔" مقامی شناسا مولوی صاحب کے محاورے سے بے خبر تھا اس لیے" تم ایک لڑکی پیدا
و" کے جملے پر بگڑ گیا اور برہم ہو کر چیخنے لگا۔ مجمع ہو گیا۔ مولوی صاحب گھبرا گھبرا کر کہتے تھے
ہم نے ایسا کیا بات کہہ دیا ہے؟" آخر ایک معمر بزرگ نے اس نوجوان کو الگ لے جا کر
ھا۔ نوجوان نے جب لڑکی پیدا کرنے کی بات کہی تو ان بزرگ نے اس کے سامنے" پیدا
نے کے فارسی اور اردو مفاہیم کا فرق بیان کر کے اس کی برہمی کو رفع کیا اور خود ایک لڑکی
پیدا کرنے" کا وعدہ کر کے مولوی صاحب کو مطمئن کیا۔

لیجئے اب بخاری صاحب کی شادی کا قصہ خود انھی کی زبان سے سینئے کہنے لگے" جب ہم
ں سے فراغت حاصل کر چکے تو ہمارے دوستوں نے ہم سے کہا کہ" مولوی صاحب اب
یہیں سکونت اختیار کر لیں اور شادی کر لیں۔" ہم نے کہا: ہماری آمدنی بہت محدود ہے۔
بی بی کو کیا کھلائیں گے؟ دوست نے ٹوکا" آپ عالم ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ رازق تو
تعالیٰ ہے۔ آنے والی خود اپنا رزق ساتھ لائے گی۔" ہم نادم ہوئے اور سوچ کر جواب
نے کا وعدہ کیا۔ چند روز کے بعد وہ دوست جواب لینے آئے تو ہم نے کہا:" فی الحال ہمارا
دی کا ارادہ نہیں ہے اس لیے تم احمد (چھوٹے بھائی) کی شادی کی فکر کرو۔ وہ شادی پر آمادہ
۔" دوست نے کہا" اچھا تو جمعہ کے دن عصر کی نماز پڑھ کر ہمارے یہاں آ جانا۔ ہم اپنی
ں سے تمھارے بھائی کا عقد کر دیں گے۔"

چنانچہ ہم جمعہ کے دن اپنے بھائی اور دو ایک طلبہ کے ساتھ اس دوست کے یہاں پہنچ
۔ وہاں بھی کچھ لوگ جمع تھے۔ سوا سو روپیہ مہر فاطمہ کے عوض احمد کا عقد شرعی ان کی لڑکی سے
یا۔ مغرب کی نماز کے بعد ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو کھانا کھلایا گیا۔ کھانے کے دوران ہی
ں خیال آیا کہ احمد اپنی بی بی کو لے کر جائے گا کہاں؟ مسجد کے حجرے میں تو لے جا
ں سکتا۔ چنانچہ ہم نے کھانے کے دوران ہی احمد کے سسر سے اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا
اس نے یہ کہہ کر مجھے کھانا جاری رکھنے کو کہا کہ" کھانا تو اطمینان سے کھاؤ۔ اللہ سب انتظام
دے گا۔" کھانے سے فراغت کے بعد اس نے مجھے اپنے مکان سے متصل ہی ایک چھوٹا
مکان دکھایا جس میں لازمی اثاث البیت موجود تھا اور کہا" یہ ہے احمد کا مکان، احمد اندر گیا

ہے اور اپنی دلھن کو لے کر آنے والا ہے۔" تھوڑی دیر میں احمد اپنی بی بی کو لے کر آ گیا اور ہم اس کو وہیں چھوڑ کر اپنی مسجد کے حجرے میں چلے آئے۔

جب ہم نے احمد کی شادی کے اتنے آسان انتظام اور احمد کی خوش حالی کو دیکھا تو ہمارے دل میں بھی اپنی شادی کا داعیہ پیدا ہوا اور ہم نے چند روز کے بعد احمد کے سسر سے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تو اس نے جواب دیا کہ آپ نے پہلے انکار کر دیا تھا اس لیے ہم نے اپنی بڑی بیٹی احمد کو دے دی۔ اب آپ اس کی چھوٹی بہن سے نکاح پر راضی ہوں تو ہم تیار ہیں۔ ہم نے کہا ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک جمعہ کی شام کو ہماری شادی اور آبادی بھی ہو گئی۔"

یہ ہے ایک غریب حمزہ کی داستان اور ایک بخاری کے ٹونکی بن جانے کا قصہ۔ وہ ایک ٹونکی کی حیثیت سے ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہوئے، ٹونک والوں کے حلقے سے ان کے ہر نوع کے روابط رہے، ٹونک والوں ہی میں ان کے بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ مولوی محمود بخاری ایک بھرا پُرا خاندان چھوڑ کر ایک سو تین سال کی عمر میں مارچ ۱۹۸۵ء میں وصال فرما گئے۔

☆......☆......☆

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

طبیہ کالج میں داخلے کے بعد جلد ہی مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے تعارف ہو گیا۔ مولانا روزانہ علی الصباح اجمل پارک چہل قدمی کے لیے تشریف لاتے تھے، جس کے ایک کنارے پر طبیہ کالج ہے اور دوسرے کنارے پر ندوۃ المصنفین اور برہان کا دفتر تھا جو مولانا اور ان کے رفقاء نے قائم کیا تھا۔ مگر مولانا قرول باغ کی ایک مشہور تاریخی عمارت نسیم بلڈنگ میں رہتے تھے۔ اس کے ایک حصے میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنی زندگی کا آخری دور بسر کیا تھا۔ حسن اتفاق سے مولانا سعید احمد کا قیام بھی اسی حصے میں تھا۔ ممکن ہے اس میں حُسن اتفاق کی بجائے مولانا کے حسن انتخاب کو دخل ہو۔ مولانا سینٹ اسٹیفن کالج میں پڑھاتے اور باقی وقت یا کالج کی تعطیل کے دن ندوۃ المصنفین میں گزارتے تھے۔ ندوہ مولانا سعید، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے مل کر قائم کیا تھا۔ اس ادارے میں ایک دور میں مولانا عبدالرشید نعمانی نے بیٹھ کر لغات القرآن مرتب کی تھی اور یہیں بیٹھ کر مولانا بدر عالم میرٹھی نے ترجمان السنہ تصنیف کی تھی۔ ندوہ اور طبیہ کالج کے درمیان اجمل پارک حائل تھی۔ طبیہ کالج اجمل روڈ پر تھا اور ندوہ کا دفتر ایک خوبصورت بنگلے میں کھجور روڈ پر۔ ندوہ کا اہتمام و انتظام مفتی صاحب کے ذمے تھا۔ وہ ندوے میں رہتے تھے ورنہ مولانا نسیم بلڈنگ میں اور مولانا حفظ الرحمٰن شیدی پورہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ مولانا بدر عالم کے

قیام کا علم نہیں، یا یاد نہیں رہا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کو جمعیۃ العلماء کے فرائض اور بیرونی دوروں سے فرصت ملتی تو ندوہ کے دفتر میں آتے اور تحریری کام کرتے تھے۔ اپنی بیشتر تصنیفات اُنھوں نے یہیں بیٹھ کر مرتب کیں۔ مولانا بدر عالم بیشتر ندوے کے ہوادار برآمدے میں بیٹھ کر کام کیا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کا قیام اوپر کے حصے میں تھا مگر نیچے دفتر میں وہ دن بھر دست یاب رہتے تھے اور ندوہ اور دفتر برہان مفتی صاحب کے حُسن انتظام کا مظہر تھا۔ صاف ستھرا ماحول، خاموش علمی فضا۔ میرے ذہن میں علمی اداروں کا جو نقشہ تھا، ندوہ اس پر پورا اترتا تھا اور میں وہاں جا کر ایک ایسے ہی ادارے کی تشکیل کا خواب دیکھتا تھا جو آج تک پورا نہیں ہوا۔

مولانا سعید سے ہماری بے تکلفی تھی۔ صبح کی اجمل پارک کی چہل قدمی کی لازمی ملاقات یا آمنے سامنے کے علاوہ نسیم بلڈنگ میں بھی ملاقات ہوتی اور برہان کے دفتر میں بھی۔ مفتی صاحب مرحوم مجوزہ اور ''منتظم'' واقع ہوئے تھے اس لیے جب جاتا تو مولانا سعید کہتے حکیم صاحب کو چائے پلانا چاہیے۔ مفتی صاحب چائے کے نقصانات پر تقریر فرماتے مگر جب مولانا سعید چائے منگوا لیتے تو وہ بھی شریک ہو جاتے۔

مولانا سعید میں اور مجھ میں عمر میں کوئی بیس سال کا تفاوت تھا مگر ہماری بے تکلفی ہو گئی تھی۔ بے تکلفی ہونے کا مطلب ان کی طرف سے بے تکلفی تھا میری طرف سے ادب و لحاظ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ویسے مولانا میں مولویانہ تقشف نہیں تھا۔ نہ وضع قطع مولویانہ تھی۔ سر پر جناح کیپ، بر میں شیروانی سلیقے کی علی گڑھ پاجامہ، شو، ہاتھ میں چھڑی ضرور رکھتے تھے جو قبل از وقت اور بے ضرورت تھی۔ ڈاڑھی مختصر تھی بلکہ مشت و دو انگشت نہیں صرف دو انگشت ہی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ بھی صاف کروا دی پھر چند سال بعد دوبارہ رکھی مگر رہی پھر بھی مختصر ہی۔

ایک بار دلی سے میرٹھ کے سفر میں اُن کا ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ قاضی سجاد حسین کے پاس اُن کے والد کی تعزیت کے لیے جا رہے تھے اور ہم (میں اور ایک رفیق کالج) مولانا عبدالعلیم صدیقی کو جلسہ سیرت میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے۔ آج کل کے ماحول میں اکثر خیال آتا ہے کہ مولانا دیوبندی تھے اور مولانا عبدالعلیم بریلوی مگر مولانا نے قطعاً یہ محسوس نہ کیا بلکہ میرٹھ پر اتر کر اپنی منزل مقصود پر جانے سے پہلے ہم لوگوں کو مولانا عبدالعلیم کی گلی کے نکڑ تک

پہنچا کر گئے۔

ہم طلبہ کالج میں اکثر سیرت النبی ﷺ، یوم اقبال وغیرہ کے جلسے کرتے رہتے تھے۔اس کے لیے دوسرے علماء کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو ضرور بلاتے تھے۔ مولانا کی تقاریر بہت پسند کی جاتی تھیں۔مولانا سعید بھی تقریروں کے لیے بلائے جاتے تھے مگر ہمارے کالج میں اُنھیں نہیں بلایا جاتا تھا اور طلبہ اُن کے انداز تقریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔دو ایک بار یہ تذکرہ ہوا اور سب نے بے تکلفی سے کہہ دیا کہ نہیں مولانا سعید کو نہیں بلائیں گے۔ مولانا کا انداز تقریر پسندیدہ نہیں ہے۔

اجمل پارک کی صبح کی چہل قدمی میں ایک بار مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ یہ سامنے جو شخص جا رہا ہے یہ متنبّی ہے۔میں یہ سمجھا کہ یہ عربی زبان کا بڑا شاعر اور اپنے وقت کا متنبّی ہے مگر مولانا نے تصحیح کی کہ یہ مدعی نبوت ہے تو میں مشتعل ہو گیا اور اُس کی طرف لپکا۔اس کے بعد کا قصہ میں ایک الگ مضمون میں ''امام آخرالزماں سے ملاقات'' کے نام سے لکھ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس نے کسی زمانے میں مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا مگر وہ اپنے دعوے میں سنجیدہ نہیں تھا۔ایک بندۂ زر اور شہرت کا بھوکا تھا۔میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔وہاں جب وہ سنجیدہ گفتگو پر آمادہ نہ ہو سکا تو میرے مرحوم دوست حکیم جامی صاحب نے اس کی گردن داب لی اور کہا۔''متنبّی صاحب یہ معجزہ دکھاؤ اور اپنی گردن میرے پنجے سے چھڑواؤ۔'' وہ رونے لگا تو بڑی مشکل سے جامی صاحب نے اس کی گردن سے رفع قبض کیا۔

دوسرے دن صبح کی چہل قدمی میں جب میں نے مولانا کو کل کا قصہ سنایا تو وہ ہنسی سے اتنے بیتاب ہو گئے کہ کھڑے نہ رہ سکے، بیٹھ گئے اور قصہ دوبارہ سنا۔اس داستان میں لطف کا رنگ یوں اور گہرا ہو گیا کہ امام الزّماں آج بھی پارک میں ٹہل رہا تھا۔

مولانا کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔سیماب صاحب سے رسمی تلمذ کا رشتہ بھی تھا۔ایک بار 'برہان میں ان کی ایک غزل چھپی تھی جس کے مقطع کا مصرع تھا۔

سعید آج جاتے ہیں مجبور ہو کر

غزل بے جان اور بے رنگ تھی۔سیماب صاحب نے قرآن کریم کا منظوم اردو ترجمہ کیا

تھا۔ ایک بار وہ چند روز دلی آکر رہے اور ندوہ آکر اصلاح کی غرض سے روزانہ آکر سنایا کرتے تھے۔ مولانا سعید اور مفتی صاحب کے علاوہ کئی بار مولانا حفظ الرحمٰن بھی اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ ایک بار میں بھی جا بیٹھا تھا۔ یہ حضرات بہت غور سے ترجمہ سنتے اور متعدد اردو تراجم سامنے رکھ کر موازنہ کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کا سیاسی نقطہ نظر قوم پرستانہ تھا، وہ دور شدت جذبات کا تھا مگر وہ مشتعل نہیں ہوتے تھے اور تحریک پاکستان سے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

مولانا ایک بار کراچی بھی تشریف لائے تھے [1] اور مرحوم سید الطاف علی بریلوی نے اپنی ایجوکیشنل کانفرنس میں انھیں مدعو کیا تھا۔ وہاں ملاقات ہوئی اور میں نے اپنا تعارف کروایا تو مولانا نہیں پہچانے اور معذرت کے طور پر اپنی ایک کتاب کا ذکر کیا کہ وہ تک میرے حافظے میں نہیں رہی تھی۔ دہلی میں اتنے مراسم کے بعد مولانا کے بھول جانے کو میں نے محسوس کیا مگر اب دو دہائی کے بعد جب خود اس منزل میں ہوں اور ذاکرہ بے جان ہو کر رہ گیا ہے تو مولانا سے میری شکایت رفع ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

---

[1] مولانا کی ایک صاحبزادی کراچی میں تھیں۔ ان سے ملنے آتے تھے۔ آخری بار ۱۹۸۵ء میں کراچی آئے تھے کہ مالک حقیقی کا بلاوا آ گیا اور یہیں ۲۴۔ مئی ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔ قبرستان دار العلوم کورنگی میں مولانا مفتی محمد شفیع کے مزار کے جوار میں تدفین ہوئی۔ (مظہر)

حافظ نصیر احمد

بہت سے اولیاء اللہ اور ارباب فضل و کمال کے تذکروں میں دوسرے حالات کے ساتھ ان کے ذرائع معاش کا بھی ذکر آتا ہے، بلکہ بہت سے مصنفین اور بزرگوں کے اسماءِ گرامی کے لاحقوں سے ہی ان کے ذرائع معاش کی نشانی دہی ہوتی ہے۔ دباغ، ضّاف، نساج، حدّاد، ندّاف، سرّاج، قصّاب، زجّاج، عطّار، ورّاق، خیّام، حلوائی، حسیری، حریری، زرکوب، دواکوب، نقش بند، کفش دوز، پشمینہ دوز جیسے پیشوں کے باوجود یہ بزرگ اپنے دور میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور آج بھی ان کا نام ادب سے لیا جاتا ہے اور ان کے ملفوظات سے استدلال واستناد کیا جاتا ہے۔

انھی ذرائع معاش میں سے ایک پیشہ نائی[1] (حجام، حلاق) کا ہے۔ صوفیا کرام کے تذکروں میں بعض اہل اللہ کا ذریعہ معاش حجامت بتایا گیا ہے۔ مولانا جامی نے ''نفحات الانس'' میں ایک بزرگ یاسین المغربی کا تذکرہ کیا ہے جو امام نووی کے مُرشد تھے، ان کا پیشہ حجامت تھا (۳۷۳)۔

برعظیم کے ایک نامور سیاسی رہ نما اور بلند پایہ عالم دین مفتی کفایت اللہ کے اسلاف کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ حجام تھے۔ (۴۴۹، یادرفتگاں)

---

[1] ہمارے یہاں نائی کو حجام کہا جاتا ہے مگر عربی میں حلاّق کہتے ہیں اور حجام سنگیاں لگانے والے کو کہتے ہیں۔

میں نے بچپن ایک ایسی خاتون کی زیارت کی ہے، جو نائن تھیں۔ نائیوں کے گھرانے سے تھیں اور اسی حیثیت سے ہمارے یہاں آیا کرتی تھیں۔ ہر جمعہ کو وہ نہرنی (ناخن تراش) لے کر آتیں اور خواتین خانہ کے ناخن تراشتی تھیں۔ میں دیکھتا تھا کہ ان کے ساتھ ادب کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ ایک دن پوچھنے پر والدہ محترمہ نے فرمایا کہ ''یہ اللہ والی ہیں، ان کا دل ذاکر ہے اور ذکر کی آواز دوسروں کو بھی سنائی دیتی ہے۔ تم پاس بیٹھ کر سُن سکتے ہو۔'' چنانچہ وہ جب بھی آتیں میں ان سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ ''ہُو ہُو'' کی آواز ہر وقت ہر حالت میں سنائی دیتی تھی۔ ابّا میاں (مولانا سید برکات احمد) کے متعلق سنا کہ وہ بھی ان کا ادب کرتے تھے۔

آج جن بزرگ کا ذکر خیر مقصود ہے وہ بھی حجام تھے اور ابھی ابھی (۱۹۸۹ء میں) یہاں سے وہاں گئے ہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے ایک دوست سے ان کا نام سنا اور جو باتیں سنیں وہ نئی اور انوکھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود بھی باریش ہیں اور حلق ریش (شیونگ) سے انکار کر دیتے ہیں۔ دوکان پر معذرت کا بورڈ بھی لگا رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود بھی بہت صاف ستھرے رہتے ہیں اور رجوع ہونے والوں کے لیے بھی شرط ہے کہ صاف کپڑے پہن کر آئیں۔ مجھے بھی مشورہ دیا گیا کہ انھی سے رجوع کیا کرو۔ خبروں میں بڑی کشش تھی، چنانچہ میں بھی انھیں کے پاس جانے لگا۔

کم قامت، کھلتا رنگ، چہرے پر شرعی ڈاڑھی، سر پر مسنون بال، سفید اور بہت صاف کپڑے۔ پہلے دکان دوسرے محلے میں تھی پھر میرے ہی محلے میں آ گئے تھے اور میرے مطب کے سامنے سے ہی اپنی دکان پر آتے جاتے تھے۔ سامنا آمنا اور سلام جواب ہوتا رہتا تھا۔ تفصیلی ملاقاتیں بھی ہوتیں۔ بعض عوارض کے سلسلے میں مجھ سے رجوع بھی کیا۔ اس قرب کے نتیجے میں ان سے حسنِ اعتقاد پیدا ہوا اور بڑھتا گیا۔

نام تھا نصیر احمد، کلام اللہ کے حافظ تھے جن اصحاب نے ان کی امامت میں تراویح پڑھی ہیں ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم بہت اچھا تھا۔ نہ صرف صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے بلکہ کردار میں تقوے کا رنگ غالب تھا، اجتناب نواہی ہی نہیں بلکہ امتثال اوامر کا التزام کرتے تھے۔

حلق وحجامت کا پیشہ چاہے شرعاً دوسرے پیشوں سے کم تر اور پست [1] نہ ہو مگر پاک و ہند کے مسلمانوں میں ہنود کے میل جول کے اثر سے اس پیشے کا شمار پست و ذلیل پیشوں میں کیا جاتا ہے اور حجام کو ہمارے معاشرے میں عزت و احترام کا مقام حاصل نہیں ہوتا، لیکن حافظ نصیر احمد صاحب مرحوم کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ باشعور اہل محلہ اور تمام نام ور اہل علم اور معتبر اہل قلم جو ان سے رجوع کرتے تھے ان کے لیے عزت و احترام کے جذبات رکھتے تھے اور ان کے آداب و اصول کا لحاظ رکھتے تھے۔ حافظ صاحب خود دکان کھولنے اور بند کرنے کے اوقات کی پابندی کرتے تھے۔ اس لیے آنے والے اگر تاخیر سے آتے تو سلام و دعا کے بعد خود ہی واپس ہو جاتے۔ حافظ صاحب کے انکار کی نوبت ہی نہ آتی۔ اگر نوبت آتی تو حافظ صاحب بلا تامل مگر خندہ رُوئی کے ساتھ معذرت کر لیتے چاہے وہ تاخیر سے آنے والا ایسا عالم دین ہو جس سے خود حافظ صاحب کو عقیدت ہو۔ ان کے یہاں آنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا۔ جانے پہچانے لوگ ہی ان کے یہاں آتے تھے، اور ان کی شرائط پوری کر کے آتے تھے۔ عام طور پر ہم آپ حجامت سے فراغت کے بعد غسل اور تبدیل لباس کرتے ہیں، مگر ان کے یہاں غسل اور تبدیل لباس کے بعد جایا کرتے تھے۔ شانوں پر کپڑا ڈالنے کے بعد گردن پر روئی کا ایک قلادہ لگا کر اس پر ایک ضماد (کریم) لگاتے تھے، اور یوں ان کے پاس سے فارغ ہو کر غسل کی حاجت نہیں ہوتی تھی۔

حسن اخلاق کا یہ پہلو نادر الوجود ہے کہ اصول اور آداب کی سختی سے پابندی کے باوجود وہ کبھی سر کہ جبیں نہیں ہوتے اور لہجے میں تلخی نہیں آنے دیتے ورنہ ہمارے یہاں دیانت دار اور بااُصول تاجر یا دست کار عام طور پر کج خلق اور ترش رو ہوتے ہیں اور اسی لیے ان کی اصول

---

[1] اسلام، پاک و ہند میں ایران اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے ذریعہ پہنچا جو ایرانی اور زرتشتی عقائد سے کلیتہً فارغ نہیں ہوئے تھے۔ پھر ہند میں تو مسلم ہندو اپنے نسلی تقسیم کے عقیدے سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے اس لیے بعض پیشے یہاں ذلیل و پست تصور کیے جاتے تھے۔ غالباً اسی کی اصلاح کے لیے بزرگوں نے ان پیشوں کو باعزت نام دیے تھے۔ سقے کو بہشتی کہا گیا جو غالباً دعائیہ کلمہ بھی ہے۔ خاک روب کو اکبر بادشاہ نے حلال خور کا نام دیا۔ اسے مہتر بھی کہا گیا۔ نائی کو مغل بادشاہوں نے خاص تراش کہنا شروع کیا تھا مگر ایک منکر خلافت گروہ نے خلیفہ مشہور کر دیا۔ اس گروہ کا جذبہ یہ تھا کہ جیسے سر برآوردہ لوگ بھی ضرورتاً نائی کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اسی طرح ہمیں خلفاء کے سامنے مجبوراً سر اطاعت جھکانا پڑا۔

دوستی اور دیانت داری ان کے حسنِ قبول اور فروغِ تجارت میں معاون نہیں ہوتی۔ میرے علم میں نہیں کہ حافظ صاحب کا کوئی قول وعمل کسی کے لیے وجہ شکایت ہوا ہو۔

حافظ صاحب کی خصوصیات، دین داری اور نفاست کی بنا پر دور دور سے لوگ ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ میں کئی اکابر علماء اور مشاہیر اہل قلم سے واقف ہوں جو مستقلاً ان کی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔

مطالعہ کا ذوق تھا۔ دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے پاس دینی کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا۔ ایک بار مجھے شمائلِ ترمذی کا اردو ترجمہ ہدیۃً عنایت کیا تھا۔ ممکن ہے دوسرے افراد کے ساتھ بھی یہ طرزِ عمل ہو۔

کئی دینی رسائل کے مستقلاً خریدار تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا صدقِ جدید برسوں سے ان کے نام آتا تھا۔ صدقِ جدید کے قارئین اور قدر شناس ایک خاص سطح ذوق اور خاص معیار کے حضرات ہوتے ہیں۔ ہر کسی کو اس میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ رسائل کی جلد مکمل ہونے پر ان کو مجلد کروا کے رکھتے جو ان کے علمی ذوق اور سلیقے کی دلیل ہے۔

صرف مطالعہ ہی نہیں قلم کشی کا بھی ذوق تھا۔ مزاج میں انکسار بہت تھا اس لیے یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ جوانی میں کیا کیا لکھا، لیکن میرے علم میں ہے کہ فرقۂ ضالّہ احمدیہ کے ردّ میں ایک مبسوط کتاب بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی تھی، جس میں اس فرقے کی تمام ہی خاص خاص کتابیں بالاستیعاب پڑھ کر ان کے اقتباسات نقل کیے پھر ان کا رد وابطال کیا تھا۔ ایک معروف ناشر نے وہ کتاب طباعت کا وعدہ کر کے حاصل کی اور چند ماہ بعد فرما دیا کہ وہ مسودہ ضائع ہو گیا۔ اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے اسے بہت محسوس کیا اور حافظ صاحب سے اظہار ہمدردی کرتے وقت میرے الفاظ معیاری نہیں رہے اور ناشر کے لیے میرا ذہن سوءِ ظن کی طرف بھٹک گیا، مگر حافظ صاحب نے میری بات سن کر فرمایا:

''حکیم صاحب! مُسودے کا ضائع ہو جانا ممکن تو ہے۔''

میں اپنے سوء ظن پر نادم اور حافظ صاحب کے حسنِ خلق اور وسعت ظرف پر متحیر ہو گیا۔

حافظ صاحب نے از سر نو محنت کر کے دوبارہ وہ کتاب تحریر کی مگر افسوس ہے کہ شائع

ہونے کی سعادت اس کے مقدر میں بھی نہیں تھی۔

صبر و شکر کے اس مقام پر فائز تھے کہ ان کے ایک صاحب زادے اچانک رحلت کر گئے، ایم ایس سی (یا بی ایس سی) تھے۔ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ سن رسیدہ باپ کے لیے ایسے صدمے کا تحمل آسان نہیں ہوتا مگر انھوں نے اس شانِ صبر سے اِس حادثے کا سامنا کیا کہ نہ تلقینِ صبر کی ضرورت ہوئی نہ جرأت۔ فرمانے لگے: ''حکیم صاحب! نہ اس کی آمد میرے بس میں تھی، نہ اس کی پرورش اور تعلیم، نہ اس کی صحت اور زندگی پر مجھے قدرت تھی۔ اس نے جب چاہا دیا، جتنے دن رکھنا منظور تھا رکھا، جب مصلحت ہوئی بلا لیا۔'' محفل میں ایک صاحب نے مرحوم کے منصب اور تن خواہ کا ذکر کیا تو بولے:

''جی جی! یہ بھی ایک فتنہ تھا، اللہ کی بندہ نوازی تو دیکھیے، غیر اللہ پر جو بھروسہ ہو چلا تھا۔ اس کا سدِ باب مالک نے خود فرما دیا۔ کبھی کبھی خیال بھٹک جاتا تھا۔ کہ لڑکا برسرِ کار ہو گیا ہے۔ تو وہ سہارا اٹھا لیا گیا۔ اب صرف اللہ کا سہارا ہے، الحمد اللہ!''

میں یہ باتیں سن رہا تھا اور حیران تھا کہ یا اللہ! یہ باتیں کون کہہ رہا ہے؟ کوئی مرشدِ طریقت، کوئی صاحب جبہ و دستار یا کوئی عامی، جس کے پاس نہ کسی جدید و قدیم درس گاہ کی سند ہے نہ کوئی حلقہ ارشاد و ہدایت۔

آخر عمر میں کئی ماہ بیمار اور بستر پر پڑے رہے۔ صحت یاب ہو کر اٹھے تو یہ شغل ترک کر دیا اور مولانا بنوری کے مدرسے میں کسی درجے کی تعلیم پر مامور ہو گئے۔ سال دو سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اب ان سے میری ملاقات بھی کم ہونے لگی تھی، اچانک سنا کہ وہ چپکے سے یہاں سے ''وہاں'' منتقل ہو گئے۔ اِنَا للہِ و انا اِلیہِ راجِعُون۔

اخفاء حال پر بڑی قدرت تھی، عمر بھر اپنے حالات چھپاتے رہے۔ بہت سوں کو، بہت سوں کو کیا، زیادہ تر لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کیا ہیں؟ کس مرتبے کے آدمی ہیں؟ کس قافلے اور کس قبیلے کے آدمی ہیں؟ ان کے جانے کے بعد ایک بزرگ نے جو خود اخفا کے ماہرین میں سے ہیں ایک دن (شاید جوش میں یا روانی میں) یہ بتا دیا کہ حافظ صاحب ''صاحب خدمت'' تھے۔۔۔ ضرور ہوں گے!

مالک رام

غالباً ۱۹۴۳ء میں مکتبہ جامعہ، دہلی کی فہرست مطبوعات میں غالب کی ایک کتاب ''سبد باغ دودر'' کا نام پڑھا اور فوراً منگوائی۔ کتاب پر مرتب کا نام مالک رام تھا۔ یہ نام میں نے پہلی بار پڑھا تھا مگر اس کے چند سال بعد ''ذکر غالب'' کے نام سے ان کی ایک کتاب دیکھی جو غالب پر دوسری کتابوں سے مختلف اور منفرد انداز کی لگی اور اب مالک رام کے نام میں وزن محسوس ہوا۔ پھر تلامذہ غالب پر ان کی کتاب نے متاثر کیا۔ اولاً اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے ثانیاً غالب کے تلامذہ کی تلاش میں بڑی محنت کی گئی ہے۔

غالب کے بعد مالک رام کی دوسری محبوب شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد ہیں چنانچہ مولانا آزاد کی نثر نگاری کے شاہ کار ''غبار خاطر'' کی تدوین اور اس پر عالمانہ حواشی مالک رام کی ایک اہم علمی خدمت ہے۔ مولانا نے اپنے خطوں میں کثرت سے اردو، فارسی اور عربی کے اشعار استعمال کیے ہیں۔ مولانا اپنی دوسری تحریروں میں بھی بعض اشعار میں جزوی ترمیم کر دیتے ہیں۔ یہ سہواً بھی ہوتا ہے اور ارادتاً بھی۔

مالک رام نے ایسے تمام اشعار میں ترمیم کی نشان دہی کی ہے۔ ساتھ ہی شاعر کا نام حاشیے میں لکھ دیا ہے۔ ان کی اردو کے ساتھ فارسی میں دست گاہ کا تو علم تھا مگر حیرت عربی اشعار کی تصحیح اور شاعر کے نام کی صراحت پر ہوا۔ عربی دانی کے سلسلے میں یہ تو علم میں آ چکا تھا کہ

وہ مصر میں کئی سال رہے ہیں اور عربی بھی جانتے ہیں مگر جاننے کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ عربی میں گفتگو کر لیتے ہیں اور یہ گمان بھی نہیں تھا کہ عربی ادب پر ایسی نظر ہے۔

غالباً ۱۹۵۷ء میں انھوں نے ماہنامہ "تحریک" (دہلی) میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی جنگ آزادی میں شرکت پر جس طرح اظہارِ خیال کیا تھا، میں نے اپنی کتاب "فضل حق خیر آبادی اور سنہ ستاون" میں اس پر نقد کلام کیا تھا۔ کتاب ان کو بھیجی بھی تھی مگر انھوں نے اس کی رسید نہیں دی تھی اس لیے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان کا کیا تاثر ہے۔

۱۹۸۴ء میں خدابخش لائبریری (پٹنہ) میں ایک سیمینار میں شرکت کر کے جب میں اور مسعود میاں (مسعود احمد برکاتی) دہلی پہنچے تو چند دوسرے اہل قلم کے ساتھ مالک رام سے بھی ملاقات کی خواہش تھی چنانچہ مسعود میاں نے انھیں فون کیا اور اپنا اور میرا ارادہ ان کے پاس جانے کا ظاہر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ زحمت نہ فرمائیں، میں خود آتا ہوں اور اصرار کیا کہ خود مجھے حاضر ہونے دیجیے مگر میں نے مسعود میاں سے دوبارہ فون کروایا کہ بھائی صاحب خود ہی حاضر ہونے پر مصر ہیں تو انھوں نے سپر ڈال دی اور ہم دونوں ان کے پاس حاضر ہو گئے۔

میں نے ملاقات کے آغاز ہی میں ان سے اپنی کتاب کا ذکر کیا جس میں ان پر نقد و کلام کیا تھا۔ میرا سوال یہ تھا کہ اس میں کوئی بات ناگوار خاطر تو نہیں ہوئی۔ انھوں نے اس کا جواب ذرا بلند آواز سے دیا اور واضح انداز میں انکار کیا اور فرمایا "نہ آپ سے ایسی توقع تھی۔" ہم ان کے پاس تقریباً تین گھنٹے رہے۔ میں نے ان کے خیال سے دوبارا اجازت چاہی۔ اس پر انھوں نے فرمایا "کچھ دیر اور بیٹھیں۔" کئی باتوں میں ہم لوگوں سے اختلاف بھی کیا مگر نہ لہجہ بگڑا نہ ذہن۔ انھوں نے ہم دونوں کو ارمغان مالک رام کا ایک ایک نسخہ بھی عطا فرمایا۔ دینی موضوعات پر ایک مجموعہ مضامین کا ذکر کیا جو زیر طبع تھا۔ چلتے وقت فرمایا، حکیم صاحب! دعا کیجیے۔" میں نے دعا کی: ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنه۔ انھوں نے آمین کہا اور فرمایا: بڑی جامع دعا ہے۔

میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی مگر افسوس ہے کہ آخری بھی تھی۔ میں نے انھیں ایک

شائستہ اور نستعلیق انسان پایا۔ان کے علم کا ثبوت تو ان کی تحریریں ہیں۔آپ ان لوگوں میں سے تھے جن سے گفتگو کر کے کوئی سیکھنا چاہے تو اسے گفتگو کرنا آ سکتا ہے۔

شخصیات پر اظہار خیال میں غیبت سے احتراز ان کا خاصہ امتیاز تھا۔اختلاف کا تحمل اور خندہ پیشانی سے سامنا کرنا بھی ان کا ایسا وصف تھا جس سے نام ور اہل علم محروم پائے گئے ہیں۔

ان کے متعلق سنا تھا کہ وہ ہندو دھرم ترک کر کے قادیانی ہو گئے ہیں مگر میں نے ملاقات میں یہ موضوع چھیڑنا نہ یہ مناسب تھا۔ویسے وہ ہندو دھرم کو ضرور ترک کر چکے تھے۔ان کی ایک صاحبزادی کا نام بشریٰ تھا جو اگر چہ خالص اسلامی نام نہیں ہے مگر عربی نام ضرور ہے۔انھوں نے گفتگو میں اپنے ایک مجموعہ مضامین کا ذکر کیا تھا جو زیر طبع تھا۔کہنے لگے اس میں سے ایک مضمون نکال دیا ہے اس لیے کہ اس سے ہندو ناخوش ہو جائیں گے۔بعد میں انھوں نے وہ [کتاب] بھیجی بھی تھی۔اس کا نام ''اسلامیات'' ہے۔مولانا ماہر القادری نے فاران کا سیرت نمبر شائع کیا،اس میں ایک مضمون پر ان کا نام عبدالمالک تھا۔مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ یہ مالک رام کا ہے۔انھوں نے ہدایت کی تھی کہ ان کا نام نہ لکھا جائے۔

☆......☆......☆

حکیم محمد سعید شہید بحیثیت معالج

شہید پاکستان حکیم محمد سعید مرحوم ان اعاظم رجال میں سے تھے جن کو اپنی دنیا آپ بنانی ہوتی ہے۔ نام، وسائل، حلقہ تعارف سب کچھ انھیں حاصل کرنا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں اپنی علمی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان کا سامان بہت مختصر، مگر بڑا وزنی تھا۔ ہمت، حوصلہ، ولولہ اور کچھ کر ڈالنے کا جذبہ، یہ تھا ان کا سامان سفر۔ جذبہ جب شدید ہوتا ہے تو وہ جنون بن جاتا ہے۔ حکیم صاحب جوش جنوں میں سفر پر نکلے، تیز رفتار سے چلے، منزلوں پر منزلیں طے کیں، معرکوں پر معرکے سر کیے۔ نام بلند ہوتا چلا گیا، حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ مسائل کی فوجیں آئیں، ان کا سامنا کیا، مشکلات کی موجیں آئیں، ان سے نمٹے، مخالفتوں کے طوفان آئے، ان سے کھیلے، موانع کے پہاڑ آئے ان کو عبور کیا اور وہ وقت بہت جلد آ گیا جب دہلی کا ایک نیا اور چھوٹا دواخانہ سب سے بڑا دواخانہ بن گیا۔ پھر پاکستان کا طلوع ہوا اور حکیم صاحب نے پاکستان کو اپنی جولاں گاہ بنایا اور نئے ولولوں، نئے عزائم کے ساتھ دوبارہ آغاز سفر کیا۔ سب سے پہلا قدم جو انقلابی قدم تھا، یہ اٹھایا کہ اپنے ہمدرد کو ملت کے لیے وقف کر دیا اور ساتھ ہی خود کو بھی آخری سانس تک خلق خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نظارے کو جنبید ن مژگاں کا گلہ مند ہونا پڑا، نئے نئے ادارے تشکیل دیے گئے، نئی نئی عمارتیں ابھرنے لگیں اور پھر ایک شہر علم و حکمت آباد

ہو گیا۔

حکیم صاحب! ایک عظیم انسان تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی عظیم انسانوں کی طرح گزاری۔ پھر ان کا وصال بھی عظیم انسانوں کی طرح ہوا یعنی بستر پر نہیں میدان جہاد میں۔ سورج نکل رہا تھا کہ وہ نماز فجر سے فارغ ہو کر تسبیح ہاتھ میں اور قلم جیب میں لیے بیماریوں سے جنگ کرنے کے لیے اپنے مطب تک پہنچے ہی تھے کہ شہید کر دیے گئے۔

ایسی شان دار موت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ انھیں اپنی نیکیوں اور خدمت انسانیت کا صلہ اُس دنیا میں بھی انشاء اللہ ضرور ملے گا، مگر اس دنیا میں بھی انھیں سب سے بڑا اعزاز بخشا گیا، شہادت کا اعزاز!

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاے ہے

طب نام ہے کم زوری اور بیماری سے جنگ کا، کم زوروں اور بیماروں کی امداد کا اور خدمت خلق خدا کا۔ ایک کام یاب طبیب بننے کے لیے جن اوصاف اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ حکیم صاحب میں پوری عظمتوں کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔ پابندی وقت کے ساتھ انھوں نے مطب کے لیے ہفتے میں جو دن مقرر کر رکھے تھے ان دنوں میں نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی مطب کے لیے روانہ ہو جاتے تھے اور صحیح وقت پر مطب شروع کر دیتے تھے۔ اس کا اس قدر اہتمام تھا کہ چند بار ایسا ہوا کہ وہ طویل غیر ملکی سفر سے آخر شب میں واپس پہنچے، مگر صبح ہی وقت پر مطب کے لیے روانہ ہو گئے۔ برسوں سے پشاور، پنڈی اور لاہور بھی مہینے میں ایک بار مطب کرتے تھے۔ خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ مہینوں پہلے ان مقامات کے لیے جہاز کی نشست مختص کروا لیتے تھے اور جہاں تک معلوم ہے کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ مقررہ تاریخ پر عازم سفر نہ ہوئے ہوں۔ کئی سال اس فہرست میں، یادش بخیر، ڈھاکہ بھی شامل تھا۔ وہاں ہر مہینے ایک دن مطب کے مقرر تھا۔ ہر مہینے بلا ناغہ مقررہ دن ڈھاکا پہنچتے اور دردمندوں کا مداوا کرتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک وہاں جانا ممکن رہا۔ بعض اوقات فرماتے تھے کہ ایسا بھی ہوا کہ میں صحیح وقت پر مطب پہنچ گیا، مگر شہر میں بدامنی اور خطرے کی وجہ سے ایک مریض بھی نہ آسکا، مگر میں آخر تک اپنی نشست پر جما رہا۔

بیرون کراچی کے مطبوں کی فہرست میں ایک بیرون پاکستان کا مطب بھی کئی سال شامل رہا۔ وہ ہر مہینے ایک مقررہ دن لندن بھی جایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ اس وقت تک نبھاتے رہے جب تک فراخ دل فرنگی کو مغرب میں طب مشرق کا نفوذ برداشت ہوتا رہا۔ جب صاحب بہادر کی عالی ظرفی جواب دے گئی اور یونانی مطب وہاں ممنوع قرار دے دیا گیا تو حکیم صاحب کا مطب بھی بند ہو گیا۔

حکیم صاحب کے مطب کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ بالعموم مفرد ادویہ اپنے نسخوں میں تجویز کرتے تھے ورنہ اب تو ہم بیش تر معالجین مرکبات ہی زیادہ تر تجویز کرتے ہیں۔

اطبائے مشرق کی روایت کے مطابق نہ وہ اپنے مطب میں معائنے کا نذرانہ وصول کرتے تھے، نہ مریض کے گھر جا کر نذرانہ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے تھے بلکہ روزانہ مطب سے فارغ ہو کر چند مریضوں کے گھر جا کر معائنہ کرتے تھے۔ ایک بار مجھے بھی ایسے دورے میں ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ حکیم صاحب کی کار کے پیچھے کئی کاروں کی ایک قطار تھی اور وہ باری باری ایک ایک مریض کے گھر گئے تھے۔

معشرِ اطبا کی ایک اور شان دار روایت کے بھی حکیم صاحب سختی سے پابند تھے۔ ہم نے صدیوں سے یہ اہتمام اور التزام کیا ہے کہ مریض کی غربت اور امارت وجہ امتیاز نہ بنے۔ حسن توجہ اور تقدم و تاخر میں کوئی امتیاز ہمارے معاشرے میں کسی دور میں بھی روا نہیں رکھا گیا۔ مرحوم محمد ایوب کھوڑو، جب وہ صوبے کے وزیر اعلا تھے، ایک بار مطب ہمدرد تشریف لے آئے۔ اطلاع ملنے پر حکیم صاحب نے ناظم مطب کو ہدایت کی کہ ان کو صحیح نمبر دے دیا جائے۔ چناں چہ وزیر اعلا کی باری تقریباً دو گھنٹے بعد آئی۔

اہل علم اور ارباب قلم کے ساتھ خصوصیت کا رویہ بھی ہماری روایات کا ایک قابل فخر حصہ ہے۔ کئی اہل علم نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب جس نسخے پر دستخط کر دیتے ہیں اسے دیکھ کر دواخانہ مجھ سے دواؤں کی قیمت نہیں لیتا۔ اس قابل عزت گروہ کے ایک حساس بزرگ نے خود کو صاحب استطاعت سمجھ کر اس رعایت سے مستفید نہ ہونے کا یہ طریقہ نکالا کہ وہ حکیم صاحب کے نسخے کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے دواخانے میں دیتے تھے۔ چناں چہ ان سے قیمت وصول

کر لی جاتی تھی۔

غربا اور بے مایہ مریضوں کے ساتھ حسن التفات بھی حکیم صاحب کا شعار تھا۔ ایک بار کوٹری سے ایک مریض نے اپنا حال اور حال زار لکھ کر بھیجا۔ حکیم صاحب نے اس کے جواب میں ادویہ کا ایک بڑا بنڈل اس کو بھجوا دیا۔

ایک نادار نوجوان نے مجھ سے کہا کہ میری والدہ بیمار ہیں اور انھیں حکیم صاحب سے رجوع کرنے کا ارمان ہے، مگر وہ کمزور اس قدر ہیں کہ مطب تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اس نے میرے اصرار پر ایک پوسٹ کارڈ میں یہ صورت حال لکھ کر حکیم صاحب کو بھیج دی۔ چند دن بعد حکیم صاحب پوسٹ کارڈ ہاتھ میں لیے تلاش کرتے ہوئے اس کے غربت کدے پر جا پہنچے۔ مریضہ کا معائنہ کیا، اسے تسلی دی، نسخہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دیا اور ایک لفافہ اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ نسخے پر حکیم صاحب کے دستخط بھی تھے، جس کو دیکھ کر دوا کی قیمت نہیں لی جاتی۔ نادار نوجوان اور یہ واقعہ سننے والے اس انوکھے طرزِ عمل پر متحیر تھے۔

حکیم صاحب شگفتہ مزاج بھی تھے۔ وہ مریضوں سے خوش طبعی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مجھ سے متعدد مریضوں نے کہا کہ حکیم صاحب ہر بار کوئی مزاحیہ جملہ ضرور فرما دیتے ہیں۔

انھی اوصاف و خصوصیات کا ثمرہ تھا کہ حکیم صاحب نے جب کراچی میں مطب شروع کیا تو وہ تقریباً ۲۸ سال کے تھے اور اس وقت کراچی میں ہمارے کالج کے کئی اساتذہ برسر مطب تھے۔ امام طب حکیم عبدالحفیظ، حکیم اجمل خاں کے ایک قریبی رفیق حکیم فضل الرحمٰن، حکیم سید نذر احمد اور ان اساتذہ کے علاوہ برعظیم کے کئی سن رسیدہ اور بزرگ اطبا کراچی میں مطب کرتے تھے، مگر اپنے انھی اوصاف کے نتیجے میں حکیم صاحب کے مریضوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جلد ہی ان کا مطب کراچی میں سب سے بڑا مطب بن گیا۔

حکیم صاحب نے مریضوں کی خدمت کے ساتھ فن کی ایک اور اہم علمی خدمت بھی انجام دی ہے۔ میرا اشارہ ان کی کتاب "تجربات طبیب" کی طرف ہے۔ وہ خاص خاص مریضوں کی رودادِ علاج بھی محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو گیا تھا۔ اس

ذخیرے کا ایک حصہ تجربات طبیب کے نام سے شائع کر دیا تھا جس کی افادیت اور اہمیت ہے۔ کتاب میں پہلے مریض کا بیان ہے، پھر مریض کے معائنے یا نبض معائنہ باللمس وغیرہ کی تفاصیل ہیں، پھر رطوبات واخلاط کے معملی امتحانات کے نتائج ہیں، پھر معالج کی تشخیص ہے، پھر تجاویز ہیں اور ہر بار مریض کی آمد (VISIT) پر ان تجاویز میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ اور آخر میں اشارات معالج کے عنوان سے مرض کی ماہیت (PATHOLOGY) پر مفصل اور معلومات افزا بیان ہے۔ اس طرح یہ معالجات پر جدید انداز کی ایک نہایت مفید کتاب بن گئی ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ کتاب اردو زبان کی پہلی کتاب ہے جس میں عدم حوین منوی (AZOOSPERMIA) بیان ہے۔

حکیم صاحب کی ایک اور بہت مفید کتاب ان کے وہ طبی مشورے ہیں جو وہ مریضوں کے خطوط کے جواب میں برسوں لکھتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں بھی مفرد دوائیں ہی لکھی ہیں۔ اور سادہ مفرد دواؤں کے مشورے دیے ہیں۔ ساتھ ہی حفظ صحت کے سلسلے میں مفید مشورے بھی دیے ہیں۔

حکیم صاحب کے مشوروں میں طب کے دونوں اجزا نظر آئیں گے۔ وہ ازالہ مرض سے زیادہ حفظ صحت کے اصول کی تلقین بار بار کرتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ خوراک، روغنی غذا، چائے اور گائے کے گوشت سے احتراز کی ان مشوروں میں بڑی تاکید نظر آتی ہے، ساتھ ہی سحر خیزی، چہل قدمی اور ورزش کی تلقین سے نہیں چوکتے تھے۔ ایک لڑکی نے لکھا تھا کہ میرا چہرہ بد صورت ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں لکھا کہ بدصورتی کا علاج خوب سیرتی ہے۔ کسی نے اپنے پستہ قد کا گلہ کیا تھا، ان کو نپولین کی مثال دی جو عظیم سپہ سالار تھا مگر پستہ قد تھا۔

غرض شہید پاکستان حکیم محمد سعید ایک حاذق اور کام یاب طبیب ہونے کے علاوہ طب و صحت پر متعدد معیاری کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی کتابیں اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک شریف النفس، پرمحبت، سادہ اور منکسر المزاج انسان تھے۔ ایسے انسان ہمارے معاشرے میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

(حکیم محمد سعید شہید سیمینار میں جمعہ ۱۷۔ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو پڑھا گیا۔)

ایک ادارے کا اختتام

مشفق خواجہ صاحب مرحوم سے مراسم سے پہلے مجھے اُن کے والد ماجد خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم سے نیاز حاصل تھا۔ میرے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ وہ خاصانِ اقبال میں سے تھے اور میں ہر ملاقات میں حضرت علامہ اقبال سے اپنی شیفتگی کی بنا پر ان سے علامہ اقبال کی عادات و مشاغل وغیرہ کے سلسلے میں سوالات کر کے استفادہ کرتا تھا۔ اسی طرح ان کے عزیز کرنل خواجہ عبدالرشید مرحوم سے بھی قیام پاکستان سے پہلے دہلی میں نیاز حاصل تھا۔ ندوۃ المصنفین اور اس کی مطبوعات مشترکہ دلچسپی کا باعث تھیں۔ ندوۃ المصنفین میں ہی ملاقات رہتی تھی۔ انھیں کتابوں اور خصوصاً مخطوطات جمع کرنے کا خاص ذوق تھا۔ اس اتحاد مذاق کی بنا پر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ کراچی میں جب وہ جناح اسپتال کے ایڈمنسٹریڑ ہوتے تھے، بہت سے بے وسیلہ مریضوں کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتا تھا اور وہ خصوصی توجہ فرماتے تھے۔

مشفق خواجہ صاحب مرحوم کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب انھوں نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی مرتبہ اُردو لغت پر ایک تفصیلی اور وزنی مضمون لکھا تھا۔ پھر ایک روزنامے میں کتابوں پر ان کے تبصرے ہونے لگے۔ اس طرح ان سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ پہلی ملاقات اپنے پیارے دوست جمیل اختر خاں کے توسط سے ہوئی۔ ان کی خواجہ صاحب مرحوم سے نوک جھونک

رہتی تھی۔ اس محفل میں زیادہ تر وہ دونوں ہی سرگرم گفت گو رہے اور میں ان دونوں کے مکالمے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر اس کے بعد کئی بار مسعود میاں (مسعود احمد برکاتی) کے یہاں دعوتِ طعام میں ملاقاتیں اور تفصیل سے باتیں ہوئیں اور میں ان کے وسیع مطالعہ، ادبیات اردو پر ان کی نظر اور استحضار سے متاثر ہوا۔ ایک زمانے میں ''جسارت'' بعد میں ''تکبیر'' وغیرہ میں ان کے کالم شائع ہوتے تھے اور ان کے شوخ اور تیکھے جملوں سے لذت یاب ہوتا رہا۔

ان کے یہاں زیادہ تر حاضری بیرونِ کراچی کے مہمانوں کے ساتھ ہوتی رہی۔ میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر سفیر اختر اور ڈاکٹر نبی ہادی وغیرہ کو لے کر ان کے یہاں گیا ہوں، پھر وہ فرمانے لگے کہ اللہ کرے باہر سے مہمان آتے رہیں اور اس بہانے سے آپ تشریف لایا کریں۔

وہ نہایت ذکی و ذہین انسان تھے۔ حافظہ بھی قوی پایا تھا۔ ان کا ذوق مطالعہ جنوں کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ جتنے رسائل نکلتے ہیں میرے پاس آتے ہیں۔ اعزازی طور پر نہیں آتے تو میں خریدتا ہوں۔ پاک و ہند کے ادبی حلقوں سے مراسم کی بنا پر کثرت سے ہدیتاً کتابیں آتی تھیں ورنہ خریدتے تھے اور ہر کتاب توجہ سے پڑھتے تھے۔ مطالعہ میں سماجی تعلقات اور معاشی مشاغل وغیرہ حائل ہوتے ہیں۔ وہ عرصے سے گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اپنے کتب خانے میں معتکف تھے۔ ان کا واحد مشغلہ پڑھنا اور لکھنا تھا۔ اردو ادب اور علمی کتب کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا اور وہ سب، بڑے نظم و سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ فرماتے تھے یہ سب تذکرے ہیں اور یہ سب دواوین ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی عجیب صفت، شہرت سے ان کا گریز تھا۔ نام آوری کا جذبہ ان میں تھا ہی نہیں۔ وہ زیادہ تر قلمی ناموں سے لکھتے تھے۔ ان کے کالموں کے مجموعوں تک پر ان کا نام نہیں ہے۔ قلمی نام 'خامہ بگوش' ہے۔ یہ بہت نادر صفت ہے۔ بہت کم، بہت ہی کم انسان ایسے ملیں گے جو نام وری کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں نہ ہوں۔

اہل علم و قلم اور طالبان تحقیق اعانت کے لیے آتے اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان سے اعانت و تعاون فرماتے۔ موضوع پر جتنا مسالہ ان کے پاس ہوتا وہ بے تکلف پیش کر دیتے۔

اس اعانت کا سلسلہ پاکستان سے بھارت تک دراز تھا۔

حسن خلق میں وہ اسلاف کا نمونہ تھے۔ مجھے راستہ بھول جانے کی عادت ہے، جہاں کئی بار جا چکا ہوں وہاں بھٹکے بغیر نہیں پہنچتا۔ ایک دفعہ مشہور دانشور اور محقق ڈاکٹر سفیر اختر کراچی تشریف لائے تھے اور خواجہ صاحب سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ میں نے ان کو اپنے ساتھ لے جانے کا ذمہ لیا۔ خواجہ صاحب سے وقت لے لیا۔ خواجہ صاحب کے مشغول اوقات کا علم تھا اور خود بھی وقت کا پابند ہوں۔ اس لیے مقررہ وقت پر پہنچنے کی نیت سے مہمان کو لے کر چلا اور حسب عادت ''گم راہ'' ہو گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے۔ آخر ایک جگہ سے خواجہ صاحب کو فون کیا کہ دیر سے آپ کے جوار میں ہوں مگر پہنچ نہیں سکا اور اب ناکام واپس جا رہا ہوں۔ بے وقت آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا مگر انھوں نے بہ اصرار فرمایا کہ ضرور تشریف لائیں، میں سراپا انتظار ہوں اور گھر کی نشان دہی فرمائی۔

بالکل یہی ''گم راہی'' علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر ڈاکٹر نبی ہادی کو ساتھ لے جانے میں پیش آئی اور بھٹکتے بھٹکتے رات کے دس بج گئے تو میں نے ہمت ہار دی اور فون پر معذرت چاہی۔ وہ بضد ہوئے کہ ضرور آئیں اور راہ نمائی فرمائی۔ ہم پہنچے اور خود خواجہ صاحب کے کہنے پر دیر تک نشست رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

☆......☆......☆

ذہین اور بھولے

اپنے حبیب لبیب کشفی صاحب پر مجھے تفصیل سے لکھنے کا شوق بھی ہے اور فرض بھی، مگر اس وقت اختصار میری مجبوری ہے۔

محترم کشفی صاحب بہت سی صفات حسنہ کے حامل ہیں، ان میں سے کئی صفات اُن کے اصلاً عربی اور نسلاً فاطمی ہونے کی بنا پر انھیں ودیعت ہوئی ہیں۔ وہ عربوں کی طرح مہمان نواز، کشادہ دل، کشادہ دست، عالی ظرف اور قوی الحفظ ہیں۔ فاطمی ہونے ہی کی بنا پر وہ فطانت و فراست سے نوازے گئے ہیں۔ اور فاطمیوں ہی کی طرح غیر معمولی فطین و ذکی و ذہین ہونے کے ساتھ بھولے بھی ہیں۔ جناب فاطمہ کی (اُن پر اور اُن کے بابا پر ہزاروں سلام) صحیح النسب اولاد میں یہ بات لازماً پائی گئی ہے کہ ذہین ہونے کیساتھ ساتھ بھولے بھی ہوتے ہیں اور کشفی صاحب میں دونوں باتیں پوری شان سے پائی جاتی ہیں، بہت ذہین بھی، بڑے بھولے بھی، سادہ دل، نیک دل، آئینہ دل بچوں کی طرح معصوم۔

اُن کی ایک ادا کا ذکر ضروری ہے۔ ''ادا'' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس پر پیار آتا ہے اور خوب آتا ہے۔ یہ ان کے جلال کی شان ہے۔ غصہ آئے گا تو آتش فشاں کی طرح مگر صرف ایک حرف معذرت کا سامنا نہیں کرے گا اور سرد ہو جائے گا۔

ان کی زندگی کا ایک قابلِ رشک پہلو یہ ہے کہ عائلی زندگی کے باب میں بڑے خوش

نصیب واقع ہوئے ہیں ورنہ اکثر اربابِ کمال اور دانش وروں کی حیات کا یہ گوشہ بڑا قابلِ رحم ہوتا ہے۔ کشفی صاحب کی پہلی بیگم طاہرہ مرحومہ تھیں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا، لیکن کشفی صاحب کے قلب کا ایک گوشہ انھوں نے اب تک آباد کر رکھا ہے اور شاید ہمیشہ رہے۔ عالی مقام نانا کا نواسہ اپنی خدیجہ کو کیسے بھلا سکتا ہے (دونوں پہ لاکھوں سلام)۔ بہر حال کشفی صاحب کا بیان ہے کہ وہ معیاری شریک حیات تھیں اور عاکف میاں کا اجلا کردار اعلان کر رہا ہے کہ وہ ماہر تربیت کار تھیں۔

کشفی صاحب کی موجودہ رفیقہ حیات بلقیس شاہین، جو مختلف جہات سے ایک مکمل اور معیاری شریکِ حیات ہیں، تعلیم اعلیٰ، ذوق ادب نکھرا ہوا، کردار ستھرا، مطالعہ وسیع، اندازِ نگارش کشفی صاحب سے زیادہ شگفتہ۔ اُن کے کردار کا ایک روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ وہ کشفی صاحب جیسے حساس، نازک مزاج شوہر کی مزاج شناس ہیں، مزاج شناس تو پہلے ہوں گی، اب تو وہ کشفی صاحب پر حاوی ہیں، ہم سفر، ہم نوا، ہم قدم۔ ایک بار جاپان کا علمی سفر ساتھ کیا اور مکے مدینے کے پھیرے ساتھ ساتھ کیے، خدا دونوں کو سلامت رکھے۔

(۲ مئی ۲۰۰۳ء)

پس نوشت

۱۶ مئی ۲۰۰۸ء میں اردو ادب کے ایک استاد بلکہ استادوں کے استاد، ایک نامور ادیب و نقاد اور ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی رحلت فرما گئے۔ معاشرہ ایک متدین مسلمان، ایک مردِ بزرگ، ایک شفیق استاد سے محروم ہو گیا۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی اپنے فضل و کمال کے ساتھ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی ایک عظیم انسان تھے، جو برعظیم میں قدیم مشرقی تہذیب کے ایسے نمائندے تھے جن کی تعداد کم ہوتے ہوتے بہت گھٹ گئی ہے۔

بڑھاپے کے مرحلے میں داخل ہوتے ہی ذیابیطس، ضعفِ قلب، ضعف اعصاب جیسے امراض اور عوارض کے جال میں پھنس گئے تھے اور صحت مسلسل گرتی جا رہی تھی، اس لیے ان کی

وفات اگر چہ نا گہانی نہیں ہے اور وہ بہت دن سے آمادہ سفر نظر آ رہے تھے مگر پھر بھی ان کی جدائی ہم جیسے ہزاروں نیازمندوں کے لیے ایک رنج و حادثہ ہے۔ خصوصاً میرے لیے تو یہ حادثہ نا قابل تحمل محسوس ہو رہا ہے اور ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔

جگر مراد آبادی کے لیے ''کاشانہ اصغر'' اور میرے لیے ان کا گھر ''حریم حسن معنی'' تھا۔ ان سے مل کر ان کو دیکھ کر دل کو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے گھپ اندھیرے میں کسی نے شمع روشن کر دی ہو۔ جب تک وہ جامعہ نگر میں رہے یا پھر شہر میں منتقل ہو گئے تو جلد جلد حاضری ہوتی تھی مگر جب سے وہ مجبوراً بیرون شہر منتقل ہوئے تھے تو حاضری کے وقفے بڑھ گئے تھے مگر فون سے رابطہ برابر رہتا تھا۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور فون پر بات ہو جاتی تھی۔ مگر ہفتہ سے زیادہ وقفہ ہوتے ہی ان کا فون آ جاتا، فرماتے کہ بہت دن سے تمھاری آواز نہیں سنی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں چھ سات سال چھوٹے تھے۔ مگر الحمدللہ میں نے کبھی عمر کو معیار بزرگی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ علم و کردار کو معیار سمجھا۔ اس لیے میں ان کو بڑا بھائی سمجھتا رہا اور خردانہ ملتا رہا۔ مگر وہ مجھ سے بڑے بھائی کی طرح معاملہ فرماتے رہے اور یہ ان کے خاندانی ماحول کا ثمر بھی تھا اور انھیں حسن خلق کا جو جوہر ودیعت ہوا تھا اس کا مظہر بھی۔ ہمارا تعارف ۱۹۶۴ء میں ہوا، میں نے سیرت فریدیہ کے مقدمے میں سر سید مرحوم کے سیاسی کردار پر جس انداز سے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا وہ بہت سے اہل علم کو نا گوار گزرا، ایک نوعمر اہلِ قلم نے جوشِ غضب میں یہ بھی لکھ دیا کہ حکیم صاحب کو اپنے دماغ کا علاج کروانا چاہیے۔ کشفی صاحب نے روزنامہ انجام میں جب یہ تبصرہ پڑھا تو وہ کتاب حاصل کی اور پڑھ کر میری جرات اظہار کی تحسین فرمائی۔ یوں ہم باہم متعارف ہوئے۔

مرحوم ایک دینی و روحانی گھرانے میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، اس لیے ان کے کردار میں دین کا رنگ ابتداء ہی سے نمایاں تھا۔ وہ شعراء اور ترقی پسند ادیبوں کے حلقے میں ''مسلمان'' مشہور تھے مگر وہ نہ کبھی اپنے اسلام سے شرمائے نہ اپنی پاکستانیت سے' نہ اپنی مشرقیت سے' نہ اپنی قدامت پرستی سے۔ وہ اپنے احباب کی روشن خیالی سے نہ صرف قطعاً متاثر نہیں ہوئے بلکہ ہر محاذ پر جہاد سے بھی غافل نہیں رہے۔

جامعہ کراچی نے ساٹھ سال ہوتے ہی ان کو فارغ کر دیا مگر وہ افادہ اور تدریس سے کبھی

فارغ نہیں ہوئے، ہمیشہ ان کا گھر درس گاہ بنا رہا اور خردوں کی رہبری سے کبھی غافل نہیں رہے۔

وہ اردو ادب کے استاد تھے مگر اب تو برسوں سے ان کا موضوع فکر و تحریر دینی موضوعات خصوصاً تفسیر اور حضرت سرور کونین ؐ کی سیرت تھے۔ انھوں نے ایک مشہور ضخیم تفسیر پر مصنف کی خواہش پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ حضورؐ کی سیرت سے تو انھیں خصوصی شغف تھا، سیرت پر ان کے کئی مقالات شائع ہو چکے ہیں اور کئی مستقل کتابیں بھی ان کی وسعت نگاہ اور موضوع پر عبور کی مظہر ہیں۔ سیرت پر ان کی تحریر و نگارش کا سلسلہ ضعف و نقاہت کے باوجود آخر تک جاری رہا۔ میری آرزو تھی کہ میری نمازِ جنازہ وہ پڑھائیں مگر مجھے ان کی نماز جنازہ پڑھنی پڑی۔



جھلکیاں

رام پور کی کچھ ان کہی کہانیاں

رام پور مختلف و متعدد اعتبارات سے ایک نام اور مقام کا حامل رہا ہے۔ مگر میرے لیے ذاتی طور پر اس کی خصوصی اہمیت ہے۔ میرے جد بزرگ مولانا سید برکات احمد کے استاد علامہ عبدالحق خیر آبادی اور مرشد طریقت میاں رکن عالم (رحمہما اللہ) سے اس ریاست کو نسبت ہے اور میرے لیے یہ نسبت جاذبیت بھی رکھتی ہے اور تقدیس بھی۔

انھی دونوں بزرگوں کے حوالے سے رام پور کی چندان کہی کہانیاں سناتا ہوں۔

علامہ فضل حق خیر آبادی ایک زمانے میں رام پور میں قیام فرما رہے تھے اور نواب کلب علی خان کو ان کے عہد ولی عہدی میں پڑھایا کرتے تھے۔ علامہ فضل حق کے صاحب زادے علامہ عبدالحق بھی شریک درس تھے۔ اس تعلق کی بنا پر نواب کلب علی خان نے اپنے عہد ریاست میں علامہ عبدالحق کو رام پور بلایا تھا اور مدرسہ عالیہ کی مسند صدارت کو ان کی ذات گرامی سے زینت دی تھی۔۔ علامہ عبدالحق نواب کی وفات تک رام پور رہے۔ اس عرصے میں ان کے اور نواب کلب علی خانؔ کے درمیان بہت سے ایسے معاملات پیش آئے جو، اگر ہمیں شاعر نوازیوں اور غالب پرستیوں سے مہلت ملے تو، ہماری تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ ادھر علما کی خویشتن داری. اپنے منصب کی رفعت و عظمت کا احساس. اپنے اسلاف کرام کی تابندہ روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش اور خواہش. اُدھر والی ریاست کی شرافت. اہل علم اور ارباب کمال کی

قدردانی. ناز برداری اور ان کی خدمت کے مواقع کی تلاش. غرض ہر پہلو سے اسلامی ہند کے یہ تاب ناک اوراق ہیں اور اب گل دستہ طاق نسیاں بھی۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں علامہ عبدالحق نواب کلب علی خان کے ہم درس رہ چکے ہیں۔ اس لیے نواب نے زمام اقتدار سنبھالتے ہی علامہ کو رام پور بلا لیا۔ اس دعوت کا اصل مقصد مولانا کی ذات گرامی سے ریاست کی عزت وعظمت میں اضافہ کرنا تھا مگر نام ولی عہد حامد علی خاں کی اتالیقی کا دیا گیا۔ ساتھ ہی مدرسہ عالیہ کی صدارت بھی۔ نواب کلب علی خاں علامہ کے صرف فضل وکمال کے معترف ومعتقد ہی نہیں تھے بلکہ اکل وشرب میں ان کے اعلیٰ ذوق کے بھی قائل تھے۔

نواب علامہ کا کس قدر احترام ملحوظ رکھتے تھے اور ان کی کتنی ناز برداری کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیجیے کہ ایک بار شہر کوتوال علامہ کے ایک بے گناہ اور پاک دامن شاگرد کو نام کے التباس کی بناء پر گرفتار کرنے کے درپے تھا۔ غریب الدیار اور بے سہارا طالب علم نے گھبرا کر علامہ کے سایۂ شفقت میں پناہ لی۔ علامہ نے اُس کو تسلی دے کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کڑک کر فرمایا۔ ''دیکھتا ہوں، کس کی ہمت ہے کہ تم پر ہاتھ ڈالے، کوتوال کی یہ مجال کہ میرے شاگردوں کو گرفتار کرے۔'' اتنے میں کوتوال بھی پہنچ گیا۔ علامہ کوتوال کو دیکھتے ہی برس پڑے اور جلال کے عالم میں یہ تک فرما گئے کہ۔ ''خود کیوں آیا اپنے نواب کو کیوں ساتھ نہیں لایا'' اور فرطِ غیظ میں کوتوال کے ساتھ نواب کلب علی خاں کے متعلق ایسے الفاظ زبان پر لائے جن کا آج سے سو سال پہلے ایک دیسی ریاست میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کوتوال برہم ہو کر علامہ کے حکمت کدے سے نواب کے دولت کدے پر جا پہنچا اور ماجرا بیان کیا۔ یہ بھی کہا کہ حضور کے متعلق اور حضور کے بزرگوں کے متعلق مولوی صاحب نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ مجھ سے سنا بھی نہیں گیا۔ کوتوال کو یقین تھا کہ نواب کو ان باتوں کا تحمل بھی نہیں ہوسکے گا اور وہ غضب ناک ہو کر علامہ کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کریں گے اور بعید نہیں کہ ریاست بدر کردیں (جیسا کہ ریاستوں میں رواج عام تھا) مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ ایسا نہیں ہوا اور جلال فقیر کے آگے شکوہ امیر سپر انداز ہوگیا۔ دولت نے کمال کو سلامی دی اور ایک رئیس ایک عالم کی

گالیاں سن کر بے مزا نہ ہوا۔ کوتوال کی توقعات کے خلاف نواب نے فرمایا:

''بھائی! غلطی تمھاری تھی کہ تم نے ایک ایسے شخص کے مکان پر دھاوا بول دیا جو کلب علی خاں کو گالیاں دے سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر میری کوئی فضیحت ہوئی بھی ہے تو اس کے ذمے دار تم ہو نہ کہ مولانا، نہ تم وہاں جاتے نہ مجھے یہ باتیں سننی پڑتیں۔''

نواب کلب علی خاں بہادر بالقابہ، والیِ ریاستِ رام پور نے امام معقول علامہ عبدالحق کی برہمی جس ظرف اور ارباب کمال کی نازکشی کے جس بلند جذبے کے ساتھ ''بصد خوشی'' برداشت کی اس نے شمشیر قلم کے اس معرکے کی یاد تازہ کر دی جو تفتازانی اور تیمور کے درمیان ہوا تھا اور جس میں شمشیر، قلم کے سامنے لچک گئی تھی اور خود تیمور، پیکر جلال تیمور کو کہنا پڑا تھا کہ ''میرے مفتوحہ ممالک کو میری تلوار سے پہلے ہی تفتازانی۔۔۔ علامہ سعید الدین تفتازانی کا قلم زیرنگین کر چکا تھا۔''

نواب کلب علی خاں کے لیے علامہ کے غصے پر پیار آنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا، جو ادائے برہمی کے نظارے کے لیے اکثر مواقع خود پیدا کر لیا کرتے تھے۔ خود کوئی ایسی بات کرتے یا کسی درباری سے ایسی حرکت سرزد کرا دیتے کہ علامہ اپنی باکمالانہ بے نیازی اور بیباکی کے ساتھ اس کی گرفت فرماتے اور نواب لطف لیتے۔

مثلاً ایک بار نواب اور علامہ ہم طعام تھے۔ نواب کے اشارے پر ملازم نے ہڈیوں کی ایک رکابی علاّمہ کے سامنے رکھ دی۔ علامہ نے ملازم سے فرمایا:

''بھئی! اس کے مستحق تو یہ ہیں۔ تمھیں یوں تمیز نہیں ہے تو نام (کلب۔ کتا) ہی سے اندازہ کر لیتے۔'' اور نواب مسکرا دیے۔

بعض مواقع پر نواب کی کسی لغزش، کسی غلط اقدام یا کسی بھول چوک پر علامہ برملا متنبہ کر دیتے اور نواب فوراً اپنا حکم واپس لے لیتے۔

ایک بار نواب نے حج و زیارت کا ارادہ کیا اور جانے کیا جی میں آئی کہ دوسرے سروسامان کے ساتھ ہاتھی بھی لے جانا چاہا۔ علامہ سے جب نواب نے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو علاّمہ نے بے ساختہ فرمایا:

''بہت خوب! ابرہہ کے بعد پہلے آدمی آپ ہوں گے جو کعبے کی طرف ہاتھی ہنکا کر لے

جائیں گے۔"

علامہ کا یہ فقرہ سنتے ہی نواب کو جیسے ہوش آ گیا اور فوراً ارادے کے التوا کا حکم اور اعلان کر دیا۔

نواب کی نظر میں علامہ کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ بقول ریاض خیرآبادی (فتنہ) علامہ نے کسی موقع پر ایک لفظی صحت مثال سے ثابت کرنا چاہی اور کسی ولایتی شاعر کا شعر پڑھا جس پر جلال مرحوم (حکیم ضامن علی جلال) نے کہا: "یہ شاعر مشاہیر میں سے نہیں ہے اور آپ اس کوچے سے نابلد ہیں" یہ بات نواب کو بے حد گراں گزری اور اسی وقت چیں بہ اَبرو ہو کر فرمایا:

"زیادہ گوئی اور زبان درازی کی بدولت کیا کیا نوبت نہیں پہنچی مگر باز نہیں آئے۔"

جلال روٹھ کر چلے گئے اور پھر نواب کلب علی خان کے ہاں زندگی بھر نہیں گئے۔

اب میں اپنے جد کے خیرآبادی استاد اور رام پوری مرشد کا ایک واقعہ سناتا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں۔ یہ قصہ ہے بھی تو انیسویں صدی کا۔ ہماری آپ کی سائنس گزیدہ بیسویں صدی کا نہیں۔ دوسری دنیا کا، ایک بہت مختلف دنیا کا قصہ ہے۔ ہماری آپ کی اس مادّیت زدہ دنیا کا نہیں۔

بہر حال قصہ یہ ہے کہ یہی مولانا سیّد برکات احمد، جن کی روایت سے یہ سارے واقعات بیان کیے گئے ہیں، رام پور میں علامہ سے تحصیل علوم کر رہے تھے۔ اگرچہ علامہ، مولانا سے خصوصی شفقت فرماتے تھے اور دوسرے طلبہ سے امتیاز برتتے تھے مگر ایک بار مزاج شناس ملازم کی غیبت سے متاثر ہو کر علامہ کو جلال آ گیا اور مولانا کا اپنی درس گاہ سے اخراج کر دیا۔ اس زمانے میں علامہ رام پور کا قیام ترک کر کے خیرآباد میں اقامت فرما تھے۔ مولانا نے کئی ماہ خیرآباد میں رہ کر بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی تو وطن (ٹونک) آ گئے۔ یہاں والد صاحب نے بہت سے علما کے نام لیے کہ ان سے تکمیل کر لی جائے، مگر مولانا کو اصرار تھا کہ میں "بلند ذوق نظر" میں مبتلا ہوں، اس لیے میرے معیار پر کسی دوسرے معلم کا پورا اُترنا دشوار ہے، پڑھوں گا تو صرف علامہ سے...... چنانچہ سفارشی خطوط لکھے اور لکھوائے گئے مگر خیرآبادی علامہ کا جلال برقرار رہا۔ جب مزاجِ یار کی برہمی دُور کرنے کی تمام تدابیر ناکام

ہوگئیں تو آخری تدبیر اور اکسیری دوا کے طور پر ایک نیا ذریعہ اور وسیلہ اختیار کیا گیا اور حسب توقع یہ "تدبیر" بڑی کامیاب اور موثر ثابت ہوئی اور اکسیری دوا نے اپنا اثر دکھایا۔ سوچا یہ گیا کہ سب ظاہری وسائل تو اختیار کر لیے گئے، اب اہل اللہ سے رجوع کیا جائے۔ کسی صاحب دل اور خدا رسیدہ بزرگ نے اگر دست دعا بلند کر دیے تو انشاء اللہ ضرور مقصود حاصل ہوگا۔ ذہن اپنے مرشد طریقت کی طرف منتقل ہوا اور دل نے گواہی دی کہ اس در سے گوہر مقصود ضرور ملے گا۔ چنانچہ رام پور پہنچے اور شاہ رکن عالم کے آستانے پر حاضری دی، شاہ صاحب چشتی صابری سلسلے کے باخدا بزرگ تھے اور مولانا اپنے قیام رام پور کے دوران ان سے بیعت ہو چکے تھے۔ شاہ صاحب مولانا پر خصوصی التفات فرماتے تھے۔ ادب سے عرض کی: "حضور کی خدمت میں حاضری کا مقصد رضائے الٰہی ہونا چاہیے مگر فی الحال ایک بندۂ خدا کی رضا مقصود ہے اور اس کے لیے دعا کی درخواست ہے۔" شاہ صاحب نے پوری داستان سنی اور دعا کا وعدہ فرمایا مگر ں کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی کہ "صبر و سکوں سے حکم الٰہی کا انتظار کرو اور جب وجائے تو ایک لمحے کے توقف کے بغیر روانہ ہو جانا چاہیے، آندھی چلتی ہو یا پانی برستا ہو۔" رض کی، "ایسا ہی ہوگا"۔ چنانچہ مرشد کے آستانے پر بستر جما دیا اور انتظار کرنے لگے۔ مدرھویں دن جناب شیخ نے زنانِ خانے سے برآمد ہو کر فرمایا:

"مولوی صاحب! روانہ ہو جاؤ، حکم ہو گیا ہے۔" مولانا کو اسی گھڑی کا انتظار تھا اگرچہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر بے تابانہ اور والہانہ عازم خیرآباد ہو گئے۔

شیخ سے رخصت ہو کر کوسی ندی پہنچے کیوں کہ اس وقت ریل میں سوار ہونے کے لیے کوسی کو پار کرنا پڑتا تھا مگر کوسی میں طغیانی آئی ہوئی تھی اس لیے اس کو پار کرنا بظاہر ناممکن نظر آیا۔ ُخرچوکی کے داروغہ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا کہ ڈاک لے کر جو گھڑناؤ جائے گی اس کے ساتھ ان کے گھڑے کا بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔ چناں چہ اس طرح گھڑناؤ کے ذریعے کوسی کو ر کیا اور ریل کے ذریعے خیرآباد پہنچے اور علامہ کے حکمت کدے پر حاضر ہو کر اطلاع کروائی۔ ،ر اًبلا لیے گئے اور لطف و کرم سے نوازے گئے۔

یوں خیرآبادی استاد کی پانچ سالہ برہمی رام پوری مرشد طریقت کی دعا سے دور ہوئی۔

فقیہ شریعت وطریقت

علماء دین میں تو ایسے حضرات بکثرت نظر آتے ہیں جو صرف عالم ہوتے ہیں مگر اکابر صوفیہ میں شاید ہی ایسے حضرات ملیں جو علوم دینیہ سے بہرہ ور نہ ہوں۔ بلکہ اس طبقہ صوفیہ میں ہمیشہ ایسے حضرات بکثرت رہے ہیں جو بیک وقت درویش اور زاہد بھی تھے اور متبحر عالم بھی، مزّکی ومربّی اور معلّم اخلاق ومرشد طریقت بھی اور مدرس ومصنّف بھی، صاحب سلسلہ بھی اور صاحب تصنیف بھی۔ علماء کے تذکروں میں ایک معقول تعداد دراویش وفقراء کی نظر آتی ہے اور متعدد حضرات کے ''عنوانِ حیات'' کا تعین دشوار ہوتا ہے کہ انھیں علماء میں شریک کیا جائے یا صوفیہ میں۔

طریقت نام ہے شریعت پر عمل میں اخلاص کا اور شریعت کا علم حاصل کیے بغیر طریقت میں قدم رکھنا بغیر زینے کے اوپر چڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ تصوف کا نام فقہ باطن بھی ہے اور فقہ باطن کی تحصیل اور اس میں ذروۂ کمال تک پہنچنے کے لیے فقہ ظاہر کی تحصیل لازمی ہے۔

عہدِ ماضی میں صوفیہ کرام جامۂ فقر پہننے کی اجازت دینے سے پہلے تحصیل علم کی شرط عائد کیا کرتے تھے اور خانقاہ میں داخلے کے لیے مدرسہ کی سند دیکھی جاتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء نوعمری میں شیخ فریدالدین گنج شکر کی خانقاہ میں پہنچے تو جواب ملا کہ:

''درویش را قدرے علم باید'' (اخبارالاخیار، ص ۵۷، طبع ہاشمی، میرٹھ)

درویش کو کسی حد تک صاحب علم ضرور ہونا چاہیے

پھر ایک عرصے کے بعد یہی نوعمر ''نظام الدین اولیاء'' بن چکا تو اس نے ایک نوعمر اخی سراج کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرنے سے پہلے ایک عالم کے سپرد کر کے فرمایا:

''اول درجہ دریں کار علم است و این را
چنداں نصیبے ازعلم نیست''

''اس (درویشی کے) کام میں پہلا قدم حصول علم ہے اور اس نوجوان کو زیادہ علم حاصل نہیں ہے (اس لیے اسے پڑھا دو)'' (اخبار الاخیار، ص ۸۵)

شیخ جمالی دسویں صدی ہجری کے ایک فقیر تھے۔ ''سیر العارفین'' انھی کی تالیف ہے۔ شاعر بھی تھے۔ علامہ اقبال نے ان کے ایک شعر کو نعت نبی ﷺ کا بہترین شعر بتایا ہے:

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوہ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

یہی شیخ جمالی اپنے ابتداء سلوک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں تحصیل علم بھی کر رہا تھا اور مرشد کے زیر تربیت بھی تھا۔ ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ:

''ترک تعلم ظاہر گیرم و بصفاء باطن کلی مشغول گردم''

(سیر العارفین، ص ۱۷۵)

''علم ظاہر کی تحصیل ترک کر دوں اور صفائے باطن پر توجہ مرکوز کر دوں۔''

شیخ پر اس کا کشف ہوا تو ٹوکا کہ:

''تعلم کہ بناء شرع و اساس دین برآں است ترک نباید کرد از خدائے تبارک و تعالیٰ خواستہ ام کہ اہل ظاہر و باطن از تو فائدہ گیرند چناں کہ پیران ما ظاہر و باطن معمور و آراستہ بودند امیدوارم کہ تو نیز ہم چناں آراستہ و پیراستہ باشی۔'' (سیر العارفین ص ۱۷۵)

''علم ظاہر کی تحصیل ترک نہ کرنا اس پر تو شریعت کی بناء اور دین کی اساس ہے۔ میں نے خدا تبارک و تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ تم سے اہل علم اور اہل دل دونوں متمتع ہوں جیسا کہ ہمارے بزرگوں کا ظاہر و باطن آراستہ و معمور تھا مجھے امید ہے کہ تم بھی اسی

طرح دونوں رخوں سے آراستہ و پیراستہ ہوگے۔"

شیخ رکن الدین ابوالفتح (نبیرۂ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی) نے ایک بار اپنے ایک مرید سے فرمایا کہ صوفی کے لیے تین چیزیں لازمی ہیں۔ان میں سے ایک علم ہے۔

"تاچوں بعلماء صحبت باشد بہ ایشاں از علم ایشاں گوید۔" (اخبار الاخیار، ص ۶۸)

"تاکہ جب علماء سے گفتگو کا اتفاق ہو تو ان ہی کی زبان (اصطلاحات) میں گفتگو کی جاسکے۔"

قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی، شیخ نصیر الدین محمود کے خلیفہ اور بقول شیخ محدث دہلوی درویش کامل تھے۔فرماتے ہیں:

"فکر در یک مسئلہ شرعی فضل دارد بر ہزار رکعتے با عجب وریا۔" (اخبار الاخیار، ص ۱۴۶)

"ایک مسئلہ شرعی میں غور و فکر، ہزار رکعت با عجب وریا سے افضل ہے۔"

علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد خاص مریدین کو ایک نصاب تصوف بھی پڑھایا جاتا تھا جس میں قوت القلوب، احیاء العلوم اور عوارف المعارف وغیرہ کتب شامل تھیں۔شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے مدرسے کا نصاب درس تصوف اس طرح ترتیب دیا تھا۔پہلے لوائح (جامی) پھر لمعات و شرح لمعات پھر درر فاخرہ (از شاگرد صدر الدین قونوی) پھر فصوص پھر فتوح الغیب...... (ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص ۲۵)۔

ہمارے عہد زوال میں جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں انقلاب آیا وہیں خانقاہوں کے سحر و شام بھی بدل گئے۔اب فقر کے لیے علم کی شرط نہیں رہی اور مرشد کا عالم دین ہونا، فقیہہ باطن کا فقیہہ ظاہر بھی ہونا ضروری نہیں رہا۔اب وہ حضرات خال خال نظر آتے ہیں جو "خرقہ درویشی دربر اور دستار فضیلت برسر" ہیں۔ان خال خال فقراء میں ایک شخصیت حضرت سیّد پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

حضرت کی ولادت ہمارے زوال و ضعف کے عہد شباب میں ہوئی یعنی "سن ستاون" کے دو سال بعد (۱۸۵۹ء میں)۔والد ماجد ایک پیر طریقت تھے مگر انھوں نے نور نظر کو پہلے عالم بنانے کا فیصلہ کیا۔تحصیل علم کا آغاز قصبے میں ہی ہوا تھا مگر جلد ہی اس مقدس مقصد کے لیے

ہجرت کا آغاز ہو گیا۔ پہلے اطراف کے قصبات میں ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر علی گڑھ پہنچے اور مدرس عصر مولانا لطف اللہ علی گڑھی (۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) سے علوم کا نصاب درس مکمل کیا۔ پھر سہارنپور گئے اور اس دور کے نامور استاد حدیث مولانا احمد علی سہارنپوری (۱۲۹۷/ ۱۸۸۰ء) سے درس حدیث لیا۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد تزکیہ باطن کی منزل آئی اور خواجہ شمس الدین سیالوی کے حلقہء ارادت میں شامل ہو گئے۔ علم ظاہر و باطن سے معمور و آراستہ ہو کر گولڑا تشریف لائے اور تدریس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ چند سال بعد جب آپ کو مرشد کی طرف سے خرقہ خلافت بھی عطا ہو گیا تو خلق اللہ کی اصلاح باطن اور اخلاق و سیرت کے تزکیہ و تحلیہ کی ذمہ داری بھی قبول فرمالی۔ تدریس و تعلیم اور ارشاد و تربیت کے ساتھ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت تالیف و تصنیف پر بھی توجہ فرمائی اور قلم رانی کی خداداد صلاحیت کو تطہیر افکار اور اصلاح مفاسد میں صرف فرمایا۔ قادیان کے ''متنبی'' کے ہذیانات کی اشاعت جب عام ہونے لگی تو نہ صرف قلم سے اس کا ابطال کیا بلکہ خانقاہ کا حصار توڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور اس سے مناظرے کے لیے لاہور جا پہنچے۔ کبھی کبھی سیاسی و ملی جدوجہد میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔ اس طرح تقریباً نصف صدی علمی و روحانی فیوض تقسیم فرما کر اس کارواں سرائے سے ''وطن'' تشریف لے گئے۔ رحمتہ اللہ علیہ!

شاہ صاحب کی شخصیت میرے لیے کئی رخوں سے بڑی جاذبیت رکھتی ہے۔

اولاً وہ بیک وقت ایک مرشد طریقت بھی تھے اور عالم دین بھی۔ مگر وہ ایک صوفی کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں اور کم سے کم میں ایک عرصہ تک انھیں اپنے دور کے اخیار و صلحاء میں شمار کرتا تھا۔ مگر ان کی سوانح اور خود ان کی تالیفات کے مطالعے کی سعادت ملی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مدرس و معلم تھے اور عمر بھر طالبانِ علوم کو درس دیتے رہے۔ ان کا دائرہ درس بھی محدود نہیں تھا۔ علومِ دینیہ کی طرح علومِ عقلیہ بھی پڑھاتے تھے۔ انھیں کتب تصوّف کی تدریس کا بھی ذوق تھا اور وہ فصوص الحکم، الفتوحات المکیہ اور مثنوی مولوی معنوی کا درس بالالتزام دیا کرتے تھے۔ ان کی تالیفات اور ملفوظات کے مطالعے سے ان کے مطالعہ کی وسعت، معلومات کے استحضار اور ذوق کی رنگارنگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے فتاویٰ ان کی فقیہانہ ژرف نگاہی کا

اور سیف چشتیائی، الفتوحات الصمدیہ اور اعلاء کلمۃ اللہ جیسی کتابیں ان کے متکلمانہ مقام کا نیز تحقیق الحق، فن تصوف پر ان کے عبور کا اور بعض مذاکرات صرف ونحو میں ان کے تبحر کا پتہ دیتے ہیں۔ ثانیاً عالم اور مدرس ہونے کے باوجود مزاج مولویانہ نہیں تھا، صوفیانہ تھا۔ ان میں مولویوں کی سی تنگ نظری، تصلب و تشدد اور گروہی عصبیت نہیں پائی جاتی بلکہ صوفیوں کی سی وسعت مشرب، عالی ظرفی، نرم خوئی اور افتادگی تھی۔ انھیں مولویوں کا سا ''تکفیر مسلمین'' کا ذوق نہیں تھا بلکہ صوفیوں کا سا ''تکثیر مسلمین'' کا جذبہ تھا۔ ثالثاً ان کا اعتدالِ مسلک اور ان کے افکار و نظریات کا توازن علماء عصر سے ان کو ممتاز کرتے ہیں۔ اس میں اُن کے مزاج کو بھی دخل ہوگا اور ان کے اساتذہ کی تربیت کو بھی۔ وہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا احمد علی سہارنپوری سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ یہ دونوں حضرات جانشین شاہ عبدالعزیز محمد اسحاق محدث دہلوی (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۰ء) کے سلسلہ تلمذ سے وابستہ تھے۔ اول الذکر بالواسطہ اور ثانی ذکر بلا واسطہ شاہ اسحاق کے شاگرد تھے۔ شاہ اسحاق اپنے معاصر اور عزیز شاہ اسمٰعیل کے برعکس معتدل مسلک رکھتے تھے اور شاہ اسمٰعیل کی طرح ''صغیرہ کو کبیرہ اور شرکِ خفی کو شرک جلی'' نہیں کہتے تھے۔ وہ فروع کی بجائے اصول پر زور دیتے تھے۔ وہ ''فصل کردن'' کے بجائے ''وصل کردن'' کے آرزومند تھے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک سخت گیر، شعلہ مزاج اور گرم خو ملا کے بجائے ایک دردمند اور محبت کیش صوفی تھے۔ یہ رویہ انہیں اپنے نانا شاہ عبدالعزیز سے ورثے میں ملا اور تربیت سے حاصل ہوا تھا۔ شاہ عبدالعزیز اپنے والد شاہ ولی اللہ سے مختلف فکر رکھتے تھے اور انھوں نے اس اختلاف کا اظہار بڑے سلیقے اور شائستگی کے ساتھ اپنی بعض تحریروں میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت سید مہر علی شاہ کے یہاں فکر و نظر کا جو توازن پایا جاتا ہے وہ نادر بھی ہے اور قابل قدر بھی۔ میں نے اس تحریر میں اپنی مجبوری و معذوری سے اختصار کی راہ اختیار کی ہے لیکن ضرورتاً چند مثالیں دے رہا ہوں۔ ''وما اھل بہ لغیر اللہ'' کے مسئلہ میں آپ کو شاہ عبدالعزیز دہلوی کی رائے سے اختلاف تھا۔ ایک استفتاء کے جواب میں آپ کو اس اختلاف کا اظہار کرنا پڑا۔ شاہ عبدالعزیز پر آپ کا سلسلہ سند حدیث منتہی ہوتا ہے، اس لیے اظہارِ رائے میں تامل ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے بے تامل اظہار رائے کیا۔ لیکن اس شان کے ساتھ کہ سوء ادب کا شائبہ تک

نہیں پیدا ہوا، ادب اور شائستگی ہر قدم پر ملحوظ رہی اور شاہ صاحب کو ہر مقام پر ''خاتم المحد ثین'' کے الفاظ سے یاد کیا۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم سے متعدد مسائل میں اختلاف کے باوجود ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کے تبحر عالم اور خادم اسلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ (مہر منیر، ص ۱۴۲)

مولوی عبدالرحمٰن لکھنوی کی کتاب ''کلمتہ الحق'' کی تردید میں ''تحقیق الحق'' تالیف کی اور ان کے بیان کے ابطال پر زوردار استدلال صرف کیا۔ لیکن اس کے باوصف ان کی تکفیر نہیں کی حالانکہ بعض علماء تکفیر کر چکے تھے۔ شاہ صاحب نے تکفیر کے بجائے ان کے بیان کو اس مفہوم کی طرف جذبہ دعوت پر محمول کیا جو مولانا لکھنوی کے نزدیک بوجہ غلبہ حال وانہماک حق ہے۔

شاہ اسمٰعیل کی ''تقویت الایمان'' کے مشتملات کی پرزور تردید کی مگر بعض معاصر علماء کی طرح ان کی تکفیر تو کجا ان کو ماجور و مثاب قرار دیا (مجالہ بردورسالہ، ص ۵۹)

شاہ صاحب کے اس طرزِ فکر و عمل کی بناء ان کا درج ذیل نقطہ نظر ہے۔ فرماتے ہیں:

''اہل قبلہ را کافر نباید گفت الادر صورتے
کہ انکار نماید امرے از ضروریات دین
مثل صوم وصلوٰۃ یا مطلق امر شرعی بودن او''

(اعلاء کلمۃ اللہ، ص ۱۳۹)

''اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں کہنا چاہیے ہاں اگر ضروریات دین جیسے صوم وصلوۃ کا انکار کرے یا ان کے مطلق امر شرعی ہونے کا انکار کرے''

اس کے بعد جن اقوال وافعال کو کفر کہا جاتا ہے ان کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مراد فقہا از قول ایشاں ''یکفر'' آن است
کہ فَعَلَ فعل الکفرِ نہ آنکہ اورا کافر گفتہ شود''

(اعلاء کلمۃ اللہ، ص ۱۳۵)

''مفتی جب کسی کے لیے یکفر کہتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے کفر کا کام کیا نہ کہ اس کے فاعل کو کافر کہا جائے۔''

اس کے بعد لزوم کفر اور التزام کفر کا فرق بیان کرتے ہیں کہ:

التزام کفر یہ ہے کہ کوئی شخص مدلول نص کو مدلول نص جانتے ہوئے اور حکم شرعی کو حکم شرعی سمجھتے ہوئے اس کا انکار کرے اور کہے کہ اگرچہ یہ حکم واقعی شارع کا حکم ہے مگر میں اسے نہیں مانتا اور لزوم کفر یہ ہے کہ لاعلمی اور نادانی یا تاویل سے کسی پر کفر لازم آئے۔ تو التزام کفر تکفیر کا موجب ہوتا ہے کہ کوئی شخص جانتے ہوئے کفر کو قبول کرے۔ اس کو کافر کہا جاتا ہے۔ اور لزوم کفر تکفیر کا موجب نہیں ہوتا۔ اس لیے محققین فقہا کلمات کفر ذکر کرنے کے بعد کہنے والے کے جہل کو عذر میں شمار کرتے ہیں۔ (اعلاء کلمۃ اللہ، ص ۱۳۵)

☆......☆......☆

مولانا شبلی کے صندوق کی چوری

مولانا حکیم نصیر الدین ندوی اجمیری (نظامی دواخانہ، کراچی) مولانا معین الدین اجمیری کے شاگرد اور بھتیجے، شفاء الملک حکیم نظام الدین اجمیری کے فرزند و جانشین، ندوہ اور طبیہ کالج (دہلی) کے فارغ، غیر معمولی ذکی و فطین اور نہایت قوی الحفظ ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک نامور علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ثروت و فراغت کا ماحول ملا۔ حسن ظاہر کے لحاظ سے ہزاروں میں ممتاز، حسن بیان و حسن تقریر کا فطری ملکہ، زبان کی طلاقت و فصاحت کے ساتھ مجلس آرائی کا ذوق، شعر و ادب سے غیر معمولی شغف، فارسی، عربی اور اردو کے اساتذہ کے ہزاروں اشعار، پوری پوری غزلیں، طویل طویل قصیدے برنوک زبان، عہد کے بیش تر اکابر و مشاہیر سے ذاتی اور بے تکلفانہ مراسم و روابط، سیاسی، صحافتی، علمی ادبی شخصیات میں سے شاید سب ہی سے تعارف و شناسائی رہی ہے۔ وسیع المطالعہ اور وسیع المعلومات بزرگ ہیں۔ برعظیم کے اکابر علم و ادب کے متعلق بہت سی ان کہی کہانیوں کا وافر ذخیرہ بھی آپ کے فقید المثال حافظے میں محفوظ ہے۔ یہ واقعہ آپ نے مولانا شبلی کے ایک معاصر بزرگ کی زبانی سنا ہے اور ابھی تک کہیں ضبط تحریر میں نہیں آیا۔ مولوی عبدالغفور صاحب کے، جو اکبری مسجد (درگاہ خواجہ صاحب، اجمیر) میں صدر مدرس تھے (جن کے صاحب زادے مولوی عبدالودود صاحب ندوۃ العلماء

لکھنو میں مدرس تھے) مولانا شبلی سے گہرے مراسم تھے۔ مولانا شبلی ان سے عمر میں کئی سال چھوٹے تھے۔ وہ بیان فرماتے تھے کہ ایک بار مولانا شبلی دورانِ سفر مجھ سے ملاقات کی غرض سے اجمیر اتر گئے اور درگاہ خواجہ صاحب پہنچ کر وہاں ایک حجرے میں اپنا سامان، جو صرف ایک صندوق پر مشتمل تھا، رکھ کر مجھے تلاش کرنے نکلے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے گھر قیام کے لیے اصرار کیا اور سامان یہاں منتقل کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ اس حجرے تک آیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ صندوق غائب ہے، چوری ہو گیا۔ پولیس میں رپٹ لکھوادی گئی۔ اس دور کی پولیس (یہ انیسویں صدی کے اواخر کا قصہ ہے) فرض شناس ہوتی تھی۔ چنانچہ پولیس کا سپاہی بار بار یہ پوچھنے کے لیے آتا کہ اس صندوق میں کیا کیا تھا۔ مولانا شبلی ہر بار یہی جواب دیتے کہ چند کپڑوں کے علاوہ فلاں فلاں کم یاب اور نایاب کتابیں تھیں۔ آخر وہ سپاہی مجھے الگ لے جا کر کہنے لگا کہ ایک صندوق تو ہم نے دریافت کر لیا ہے مگر اس میں تو نقد رقم بھی ہے اور آپ کے مہمان اس رقم کا تذکرہ ہی نہیں کرتے، اس لیے خیال ہوتا ہے، کہ ان کا صندوق یہ نہ ہو۔

میں نے مولانا شبلی سے دریافت کیا کہ اُس صندوق میں کیا کیا تھا؟ تو انھوں نے پھر یہی جواب دیا کہ فلاں فلاں کم یاب و نایاب کتابیں تھی۔ میں نے پوچھا، کوئی رقم بھی تھی؟ تو جواب دیا کہ، ہاں رقم بھی تھی مگر اصل سرمایہ تو وہ کتابیں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ رقم کتنی ہے تو جواب دیا کہ پانچ ہزار روپے۔ اس پر میں نے جھنجلا کر کہا کہ کئی روز ہوئے ہم بھی پریشان ہیں اور پولیس بھی اور انھوں نے اب تک کتابوں ہی کتابوں کا نام لیا ہے، رقم کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ چنانچہ میں نے غصے سے چیخ کر کہا: ''اب تک کیوں نہیں بتایا کہ پانچ ہزار روپے بھی تھے۔'' بہرحال میں نے سپاہی کو بتایا کہ اس صندوق میں پانچ ہزار روپے بھی تھے۔ غرض پولیس نے وہ صندوق مولانا کے حوالے کر دیا اور مولانا شبلی نے اسے کھول کر سب سے پہلے اپنی کتابوں کو سنبھالا اور رقم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ یہ واقعہ مولانا شبلی کے طالب علم، علم دوست اور فنافی العلم ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کو صندوق کی گم شدگی کا صدمہ تھا تو اس لیے نہیں کہ اس میں ان کے کپڑے تھے اور ایک معتدبہ رقم تھی۔ بلکہ صرف اس لیے کہ اس میں فلاں فلاں

کتابیں تھیں۔ پولیس نے جب صندوق کو بازیافت کرلیا اور اس کی تلاشی لی، تو اس میں سے پانچ ہزار روپے بھی نکلے (جو آج سے تقریباً سو سال پہلے ایک معقول رقم تھی)۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ مولانا نے اپنی رپورٹ میں اتنی بڑی رقم کا تذکرہ نہیں کیا تو اپنے معیار کے مطابق اس الجھن میں گرفتار ہونا ہی تھا کہ صندوق ان صاحب کا نہیں ہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ صندوق کے مشتملات میں اس کا تذکرہ نہ کرتے۔ خود مولانا شبلی کے میزبان بھی شاید اسی لیے ''مولانا'' ہوں گے، کہ نصاب درس کی رسمی تکمیل کرلی ہوگی۔ مگر علم ان سے کترا کے نکل گیا ہو گیا۔ ریشے ریشے میں پیوست نہیں ہوا ہوگا۔ اسی لیے وہ ''شبلی نعمانی'' نہیں بن سکے اور مرتے ہی ''وفات'' پا گئے۔ یہی سبب تھا کہ مولانا شبلی کی اس حرکت پر اور دولت دنیا کی ناقدری پر انھیں غصہ آ گیا۔

اصل چیز معیار ہے۔ ایک چیز جو آپ کی نظر میں بے قیمت ہے وہی دوسرے کے لیے بیش قیمت ہے۔

اے کہ می گوئی، چرا جامے بہ جانے می خری
ایں سخن با ساقیء ماگو کہ ارزان کردہ است

غنی کاشمیری جب تک اپنے گھر میں رہتا تو دروازہ بند رکھتا اور جب گھر سے باہر جاتا تو دروازہ چوپٹ کھلا چھوڑ جاتا۔ لوگوں نے اس طرزِ عمل کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس گھر میں ایسی چیز جس کو حفاظت کی ضرورت ہو بس میں ہوں اس لیے جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو دروازہ بند کرلیتا ہوں اور جب گھر سے نکلتا ہوں تو پھر گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں رہ جاتی جس کی حفاظت کی جائے اس لیے دروازہ کھلا چھوڑ جاتا ہوں، حال آں کہ گھر میں غنی کے علاوہ ایسی بہت سی چیزیں ہوتی ہوں گی جو دوسروں کی نظر میں، ان سب کی نظر میں جو ''غنی'' نہیں ہوتے، حفاظت کی متقاضی تھیں۔ علامہ اقبال نے ''پیام مشرق'' میں غنی کاشمیری کی یہ بات ان اشعار میں نظم کی ہے۔

زمن آں چہ دیدند یاراں رواست
دریں خانہ جز من متاعے کجاست

غنی تا نشیند به کاشانه اش
متاعے گرانے ست در خانه اش
چو آن محفل افروز در خانه نیست
تہی تر ازین ہیچ کاشانه نیست

☆......☆......☆

مہمانانِ رسول ﷺ کی تکریم

مولوی نواب علی بنگالی میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ احمد آباد میں ملازم تھے۔ مگر ٹونک ہی میں شادی کر لی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی سسرال والوں سے بیوی بچوں کو ملانے ٹونک آتے رہتے تھے۔ جب بھی ٹونک آتے، تو ہمارے یہاں ضرور آتے۔ والد مرحوم کے بعد بھی ان کا رویّہ برقرار رہا۔ ایسے ہی ایک بار آئے ہوئے تھے۔ ہمارے یہاں بھی آئے۔ میں اس جگہ، جہاں والد، دادا، اور پردادا مطب کیا کرتے اور درس دیتے تھے، مطب کر رہا تھا۔ مریضوں سے فارغ ہو کر اُن کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور عجیب تاثر کے عالم میں ہیں۔ میں نے گھبرا کر توجیہہ چاہی تو بولے، بیس برس پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے بے چین کر دیا۔ میرے دریافت کرنے پر کہنے لگے: جہاں تم بیٹھے ہو یہیں تمھارے والدِ ماجد بیٹھا کرتے تھے اور جیسا کہ تمھارے یہاں تین پشتوں سے ہوتا آیا ہے کہ طلبہ کی ایک جماعت کو درس دیتے اور اس عرصے میں جو مریض جمع ہو جاتے، درس سے فراغت کے بعد ان کی طرف توجہ فرماتے۔ ان سے فارغ ہو کر پھر دوسری جماعت آ جاتی اور پھر درس شروع ہو جاتا۔ ایک دن ایسے ہی ہم سبق پڑھ رہے تھے اور مریض منتظر تھے، جن میں ایک صاحبزادے (والیٔ ریاست کے بھائی) بھی تھے۔ ہم جیسے ہی درس سے فارغ ہوئے، صاحب زادے نے مجھ سے پانی مانگ لیا اور میں ان کی فرمائش سنتے ہی پانی لانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ بس میرا

کھڑے ہونا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا۔

ریاست کے والی اور ولی عہد کے علاوہ حکمران خاندان کے تمام افراد صاحبزادے کہلاتے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم اس زور سے گرجے کہ سب لوگ تھرا گئے۔ ان کو جلال اس بات پر آ گیا کہ صاحبزادے نے ایک طالب علم سے پانی پلانے کو کیوں کہہ دیا اور طالب علم نے ان کے اس ''حکم'' کی تعمیل کیوں کرنی چاہی؟ سب سے پہلے مجھے ڈانٹ پڑی: خبردار! آگے نہ بڑھنا۔ پھر صاحبزادے کی طرف رخ کیا۔

آپ نے اس طالب علم سے پانی کیسے مانگ لیا؟ آپ مجھ سے کہتے، میرے مہمان تھے، میں خود آپ کو پانی پلاتا۔ غلام حسین (ملازم) سے کہتے۔ وہ یا کوئی اور ملازم پانی پلاتا۔ مگر آپ کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ایک طالب علم سے پانی مانگیں؟ یہ طلبہ مہمانانِ رسول اکرم ﷺ ہیں۔ آپ کی ریاست کے لیے وجہ اعزاز و افتخار ہیں۔ یہ علم دین حاصل کرنے آئے ہیں، آپ کو پانی پلانے نہیں آئے۔ یہ ہمارا نام سُن کر آئے ہیں۔ آپ کا نام سُن کر نہیں آئے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کی قدر کریں، ان کی عزت کریں۔ ان کی یہاں آمد کو ریاست کے لیے باعث برکت سمجھیں۔ اگر آپ ان کو حقیر سمجھیں گے، ان سے خدمت لینا چاہیں گے، تو ریاست اجڑ جائے گی، برباد ہو جائے گی۔ مہمانانِ رسول اکرم کی قدر نہ کرنے والا پنپ ہی نہیں سکتا۔

حکیم صاحب عالم جلال میں آتش فشاں تھے اور صاحب زادے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آخر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے:

حکیم جی! قسم خدائے پاک کی، بس بے خیالی میں، بے سوچے سمجھے ان سے کہہ دیا، بس آپ مجھے معاف کر دو۔

حکیم صاحب نے فرمایا:

مجھ سے معافی کیسی مانگتے ہیں، خدا اور اس کے رسول سے معافی مانگیے جن کے دین کے ان طلبہ اور ان مسافران عزیز کی آپ نے تخفیف شان کی ہے۔

صاحب زادے رونے لگے اور چیخ چیخ کر اللہ سے توبہ کرنے لگے تو اب حکیم صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، میں اب تک کھڑا ہوا تھا۔

فرمایا:

تم آج سے میرے درس میں نہیں بیٹھ سکو گے۔ تمہیں جب اپنا مقام نہیں معلوم، تم جب علم دین کے مرتبت شناس نہیں، تم جب علم اور علماء کی قدر کرنا اور کروانا نہیں جانتے اور سگ دنیا (رئیس کی طرف اشارہ کر کے) کے ایک اشارے پر دوڑ پڑے ہو تو تم سے کیا امید کی جائے کہ تم اس مقدس امانت کی حفاظت بھی کر سکو گے۔ اس لیے میں آج سے تمہیں اپنے درس میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔

میرے تو اس شان جلال کے نظارے سے ہوش وحواس پہلے ہی گم تھے۔ اب اس سے تو خون ہی خشک ہو گیا۔ مگر صاحبزادے پھر آڑے آئے اور انھوں نے میری طرف سے حکیم صاحب کے ہاتھ جوڑے اور مجھے معافی دلوائی۔

حکیم صاحب کا رنگ دیکھ کر صاحبزادے نے درخواست کی کہ کل یہ سب حضرات (ہماری جماعت) میرے یہاں مدعو ہیں۔ حکیم صاحب نے اس دعوت کے ردو قبول کو ہم پر چھوڑ دیا۔ ہم سب خائف وترساں تھے۔ اس لیے مہر بلب رہے مگر حکیم صاحب نے فرمایا: تم قبول کر لو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

چنانچہ دوسرے روز ہم سب صاحبزادے کی حویلی پہنچے۔ صاحبزادے نے خود ہم سب کا استقبال کیا، خود کھڑے ہو کر ہاتھ دھلائے، خود کھڑے ہو کر کھانا کھلایا، پھر ہاتھ دھلائے اور ایک بار پھر رو رو کر ہم سب سے معافی مانگی۔

☆......☆......☆

خانوادہ برکاتی اور اصحاب پھلواری کے روابط

برکاتی خاندان اور ''اصحاب پھلواری'' (جن میں پھلواری شریف کی دونوں خانقاہوں کے ارکان شامل ہیں) کے باہم روابط کا آغاز مولانا حکیم برکات احمد اور مولانا شاہ بدرالدین اور مولانا شاہ سلیمان کے عہد میں ہوا تھا۔ ان تینوں حضرات میں باہم ملاقات غالباً کبھی نہیں ہوئی، مراسلت ہی کی حد تک یہ سلسلہ رہا۔ ان تینوں میں مولانا تمنا عمادی کو بھی شامل کیا جائے تو یہ رباعی مکمل ہو جائے گی۔ دوسری نسل میں میرے والد ماجد مولانا حکیم محمد احمد اور مولانا حکیم محمد شعیب صاحب، مولانا شاہ حسن میاں وغیرہ کے درمیان اجمیر شریف میں ملاقاتوں، مراسلت اور اپنی تالیفات کے ہدایا کے باہم تبادلے ہوتے رہے۔ بعد میں آنے والوں میں مولانا شاہ امان اللہ، مولانا شاہ عون احمد، مولانا سید جعفر شاہ ندوی، مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی سے اس خاک سار کی نیاز مندی نے اس تسلسل کو قائم رکھا۔ ان میں سے خانقاہ مجیبیہ کے متاخرین کو میں اگر برکاتیوں میں شامل کرلوں تو غلط نہ ہوگا کیونکہ مولانا شاہ محی الدین، مولانا شاہ قمر الدین، مولانا شاہ نظام الدین نے تحصیل علوم دو برکاتی تلامذہ مولانا مقبول احمد خاں دربھنگوی اور مولانا شاہ عبیداللہ اجمیری سے کی تھی۔ پھر مولانا شاہ امان اللہ اور مولانا شاہ عون احمد نے بھی تحصیل علوم کے بعد سند فراغ ایک اور برکاتی مولانا محمد شریف مبارک پوری سے لی تھی۔

خانوادۂ برکاتی اور اصحاب پھلواری میں ایک نقطہ اشتراک فکر ونظر کا اتحاد تھا۔ خانقاہ مجیبیہ کا

کلامی اور فقہی مسلک دیوبند و بریلی دونوں کے علمائے مسلک سے کسی قدر مختلف رہا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ دونوں کے بین بین ہے۔ کئی دوسرے علمی مراکز، خیرآباد، فرنگی محل، علی گڑھ (مولانا لطف اللہ کا مدرسہ) رام پور، بدایوں، ٹونک، اجمیر کا بھی یہی رویّہ ہے کہ دونوں سے الگ، دونوں کے قدر شناس اور ان کی دینی خدمات کے معترف مگر دونوں کے تصلب و تحزّب سے محترز۔

مولانا شاہ عون احمد اور مولانا امان اللہ سے میرے مراسم خلّت و اخوت کا آغاز ۱۹۴۱ء سے ہوا تھا۔ میرے دادا کے شاگرد مولانا محمد شریف مبارک پوری جب دارالعلوم معینیہ عثمانیہ کے صدر المدرسین ہو کر اجمیر تشریف لائے تو وہ دونوں حضرات کو پھلواری اور مجھے ٹونک سے اجمیر لے گئے۔ ہم چاروں درگاہ خواجہء بزرگ سے متصل ایک مکان میں رہتے تھے۔ آخری سالوں میں محی الدین صاحب نے اس رباعی کو تخمس کر دیا تھا۔ سید محی الدین جعفری زینبی، الہ آباد کے مشہور بزرگ، مرشد طریقت، عالم دین اور معالج حکیم سیّد فخر الدین کے نواسے تھے۔ اس وقت وہ ہم لوگوں سے بہت چھوٹے تھے۔ اب تو وہ بھی نہیں رہے۔ اب اس گروہ میں سے صرف میں رہ گیا ہوں۔ سست رو جو تھا، اس لیے ابھی راہ میں ہوں۔ مولوی عون صاحب کا کمرہ اس مکان کا خاص کمرہ تھا۔ صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا اسی کمرے میں ہوتا تھا۔ سہ پہر کی چائے بھی یہیں ہوتی تھی۔ سادہ (بے دودھ کی) چائے اور بھنے ہوئے چنے اس محفل کی خاص چیز ہوتی تھی۔ پانچوں وقت کی نمازیں ہم درگاہ کی متعدد مسجدوں میں سے شاہ جہانی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جس کے امام مولوی محمد یونس صاحب میرٹھی تھے، جو مفتی کفایت اللہ صاحب کے رفیق درس اور دیوبندی مکتب فکر سے وابستہ تھے مگر ہمیں کبھی خیال نہیں آیا کہ ان کا کیا مسلک ہے اور ہمارا کیا اور ان کی اقتدا میں نماز ہو بھی جاتی ہے یا نہیں۔ ۱۹۴۲ء میں ان دونوں شاہ صاحبان کی شادیاں بھی ہو گئی تھیں۔ میرے پاس مولانا شاہ محی الدین صاحب کا دعوت نامہ شادی محفوظ ہے۔ اس میں ۳ جنوری ۱۹۴۲ء (۱۵۔ ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ) تاریخ عقد درج ہے۔ ہم تینوں کئی کتابوں میں ہم درس تھے۔ صدرا، سبعہ معلقہ، ہدایہ، قاضی مبارک، مدارک وغیرہ۔ جولائی ۱۹۴۳ء (رجب ۱۳۶۲ھ) میں یہ دونوں فارغ ہو کر وطن چلے گئے۔

میں ایک سال بعد جولائی ۱۹۴۴ء (رجب ۱۳۶۳ھ) میں فارغ ہوا تھا۔ مولانا عون احمد درس کے بعد ہمیں تکرار کروایا کرتے تھے۔

ان کی صحت اجمیر کے قیام کے دوران ہی متاثر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ پھلواری پہنچ کر ڈاکٹروں سے رجوع کیا تو تپ دق تشخیص ہوا اور وہ ۱۹۴۳ء میں حصول صحت کے لیے رانچی کے سینی توریم میں داخل ہو گئے۔ رانچی سے مسلسل اُن کے خط آتے رہے۔ آخری خط ۴۔ اگست ۱۹۴۴ء کا لکھا ہوا تھا۔ پھر وہ ۱۹۴۴ء کے آخر میں پھلواری آ گئے تھے۔ میں اجمیر سے فارغ ہو کر طبیہ کالج، دہلی میں داخل ہو گیا تو وہاں سے ان سے مراسلت رہتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں طب سے فارغ ہو کر ٹونک آ گیا تو ٹونک سے مراسلت ہوتی رہی۔ ۱۹۵۲ء میں مجھے ہجرت کرنی پڑی اور کراچی آ گیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اپنے اعزہ سے ملنے کے لیے کراچی تشریف لائے تو دس سال بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ پھر وہ سال دو سال بعد کراچی آتے رہے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ درمیانی عرصے میں خطوں کے تبادلے ہوتے رہے۔ اپنے ایک سفر کراچی میں وہ میری کتاب ''حیات شاہ محمد اسحاق دہلوی'' کا مسودہ ساتھ لے گئے، جس کا خلاصہ انھوں نے خانقاہ کے مجلّے ''المجیب'' میں شائع کر دیا اور مسودہ کراچی آتے ہوئے ساتھ لیتے آئے۔ پھر یہ دہلی سے مولانا ابوالحسن زید فاروقی نے شائع فرما دی۔

۱۹۸۴ء میں پٹنہ سے خدا بخش لائبریری میں طبی مخطوطات پر ایک سیمینار کی دعوت آئی تو اگرچہ کانفرنسوں اور سیمیناروں سے مجھے دلچسپی نہیں ہے اور ایسے دعوت نامے میں کبھی قبول نہ کر سکا، مگر اولاً تو دعوت میرے بہار میرے عظیم آباد سے آئی تھی، ثانیاً اس طرح مجھے اپنے بچھڑے ہوئے دوست مولانا شاہ امان اللہ سے ملاقات کا ایک نادر موقع مل رہا تھا، جن کی شکل دیکھے ہوئے ۴۵ سال ہو گئے تھے، کیوں کہ وہ زینت سجادہ ہونے کے باعث معتکف خانقاہ ہو چکے تھے، چنانچہ میں سیمینار کی تاریخ ۲۹ مارچ کی بجائے ۲۳ کو پٹنہ پہنچ گیا۔ اور سٹیشن سے سیدھا پھلواری جا پہنچا۔ دوسرے دن خدا بخش لائبریری کے ڈائریکٹر محبی ڈاکٹر عابد رضا بیدار پہنچ گئے کہ ''تشریف لے چلیے، آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔'' میں نے عرض کی ''آپ کا مہمان تو ۲۹ مارچ کو بنوں گا۔ اس سے پہلے تو خانقاہوں کے حجروں میں وقت گزاروں گا۔ پھر میں نے

مولانا امان اللہ سے اپنے دیرینہ تعلق کا ذکر کیا۔

میرے حبیب لبیب مولانا شاہ امان اللہ سے ۴۱ سال میں ۴۱ صدیوں بعد ملاقات ہوئی۔ ماہ وسال کی گردشوں نے دونوں کے حلیے تبدیل کر دیے تھے اور وہ تو شدید علیل اور بہت نحیف ونزار ہو گئے تھے۔ اجمیر میں وہ جوان رعنا تھے۔ نازک بدن، سرخ وسفید رنگ، چھوٹی سی ڈاڑھی تھی۔ اب وہ ایک پیر مرد تھے۔ جسم گھل گیا تھا۔ میں نے عرض کی: ''مولوی امان اللہ صاحب! (میں انھیں یہی کہا کرتا تھا) معلوم ہوتا ہے آپ نے صرف روح کی پرورش پر توجہ مرکوز کر دی ہے، جسم کا حق بھلا دیا'' ایک غمگین تبسم کیساتھ فرمایا ''مولوی محمود صاحب! (وہ مجھے اسی طرح خطاب کرتے تھے) ہم تو بہت کوتاہ ہیں، جسم کا حق ادا کیا نہ روح کا۔'' اور میری اور انکی آنکھیں بھیگ گئیں۔

قیام خانقاہ کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سننے کا ہے۔ خانقاہ میں برابر کے حجرے میں مولانا سید احمد عروج قادری مقیم تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ان سے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع میں ملاقات ہوئی تھی۔ چند بار خطوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ میری ایک دو کتابوں پر انھوں نے اپنے ماہنامہ ''زندگی'' میں تبصرہ بھی کیا تھا، ان کی تحریریں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ میں ان کے حجرے میں پہنچا تو پر جوش معانقہ ہوا اور ازراہ بے تکلفی میں نے کہا ''اب جماعت اسلامی خانقاہوں میں بھی آنے لگی۔'' وہ خوب ہنسے اور حسب توقع انھوں نے اس مزاح کا خوب لطف لیا۔

اس قیام میں مولانا امان اللہ کے صاحب زادے مولوی نصیر احمد نے میری اس طرح خدمت کی جیسے میرا بیٹا سہیل کرتا ہے، کیوں نہ کرتا۔ وہ تھا کون، کس کا خلف تھا، کس ماحول میں پلا تھا، کس گلشن کا گل سر سبد تھا۔ مگر اللہ کی مصلحت کہ بہت جلد مرجھا گیا۔ اللہ اسے غریق رحمت فرمائے۔

۲۸ مارچ کو میں لائبریری میں منتقل ہو گیا، جہاں اطراف ملک سے مدعوئین آچکے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کئی روز پہلے آ گیا تھا اور پھلواری کے سجادہ نشین شاہ امان اللہ صاحب سے ملاقات مقصود تھی اور شاہ صاحب اور ان کے متدین اور صاحب علم اسلاف کا ذکر خیر ہوا تو ان حضرات نے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا،

ضرور چلیں مگر فقیروں سے ملاقات کے آداب ہوتے ہیں، ان کا لحاظ ضروری ہے۔ چنانچہ کوئی تیس چالیس اہل علم وقلم کا یہ قافلہ خانقاہ پہنچا۔ شاہ صاحب نے ایک ''مہلک'' تبسم اور عاجزانہ تیوروں سے نیازمندوں کا استقبال کیا۔ میں نے دو ایک حضرات کا تعارف کروایا۔ ان حضرات نے بڑے ادب سے کچھ گفتگو کی اور استدعا کی کہ ''دعا فرمایئے۔'' ارشاد ہوا کہ ''آپ حضرات دعا فرمایئے، میں آمین کہوں گا۔'' ہم گناہ گاروں نے دست دعا دراز کیے اور ایک خاص تاثر کے ساتھ دعا کی گئی جس پر اس مرد خدا نے آمین کہا۔ غرض وہاں سے نسبتاً باادب ہو کر سب لوگ لوٹے۔

دوسرے دن سیمینار کے شرکاء کی گورنر ہاؤس میں دعوت تھی۔ گورنر ہاؤس دنیاوی شان وشوکت کا مظہر تھا مگر مشہور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو اس شاہانہ ماحول میں خانقاہ مجیبیہ یاد آ گئی۔ فرمانے لگے ''یہاں سے زیادہ وہاں کا ماحول باوقار تھا۔''

شاہ عون احمد صاحب علماء ہند کے دونوں مسلک کے علماء کیساتھ یک ساں اور خوش گوار مراسم رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن تھے اور جمعیۃ العلماء کے آخر تک مستقل رکن رکین رہے۔ حال آں کہ جمعیۃ العلماء ہند جو ہر مسلک کے علماء ہند کی جمعیۃ تھی اور اس میں بدایوں، بریلی، فرنگی محل کے غیر دیوبندی علماء بھی شریک تھے، خصوصاً مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سجاد بہاری، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالعلیم صدیقی وغیرہ لیکن رفتہ رفتہ تمام غیر دیوبندی علماء مجبوراً کنارہ کش ہوتے گئے اور جمعیۃ العلماء ہند، جمعتیہ العلماء دیوبند ہو کر رہ گئی بلکہ علماء دیوبند میں سے بھی وہ علماء جو کانگریس کے ہم نوا اور ہم قدم تھے۔ اور جو علماء کانگریس سے اختلاف رکھتے تھے ان کی گنجائش جمعتیہ میں نہیں رہی۔

میں اس وقت کی خوشی کو بیان نہیں کر سکتا جب مولانا عون احمد کی پہلی تالیف ''محی اللہ'' مجھے وصول ہوئی۔ اس کے بعد تو ان کی متعدد تالیفات جب بھی چھپتیں مجھے ضرور یاد فرماتے اور میں اپنی کوئی تالیف پیش کرتا تو کلمات تحسین سے نوازتے۔

اس تقریباً پچپن سالہ عہدِ خلت و وداد میں شاہ صاحبان کے بہت سے خط آتے رہے۔ اور وہ میرے پاس محفوظ بھی ہیں۔ اب میں نے ان پر ایک نظر ڈالی تو دل کا عجب عالم ہوا۔

مولانا شاہ امان اللہ قادری سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ جیسے مرد بزرگ نے مجھے ''میرے محمود میاں'' لکھا ہے، اللہ اللہ! مولانا شاہ عون احمد قادری جیسے فاضل جلیل نے مجھے ''حبیب لبیب'' لکھا۔

ایک دن ایک خبر سننا پڑی۔ مولانا شاہ عون احمد قادری ''یہاں'' سے ''وہاں'' بلا لیے گئے۔ خبر سنائی گئی تھی، سن لی، نہ سنتا تو کیا کرتا۔ ایک شریف النفس، پاک باطن، محب، محبوب دوست کی رحلت کی خبر، جس کے ساتھ تین سال اس طرح گزرے کہ ایک ساتھ کھانا پینا، ایک ساتھ پڑھنا، ایک ساتھ نمازوں کے لیے مسجد جانا، صبح سے شام تک مختلف موضوعات پر مباحثے، مذاکرے، غیر درسی کتابوں، رسائل و اخبارات کا ایک ساتھ مطالعہ اور آرا کا تبادلہ؛ غرض کتاب ماضی کے ورق پر ورق الٹتا چلا گیا۔ آنکھیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ دل اپنا کام کر رہا تھا۔ مگر آنکھیں کب تک برستیں، دل کب تک دھڑکتا، صبر کرنا آدمی کی مجبوری ہے۔ چنانچہ بے صبری بھی دکھائی، پھر صبر بھی کیا، اگر ایسی خبر مجھے چند سال پہلے ملتی، تو جانے دل کا کیا عالم ہوتا۔ اگر اتنا رنج نہیں ہوا تو اس لیے کہ میں خود زندگی سے دور ہو رہا ہوں اور موت کی آہٹیں واضح طور پر سن رہا ہوں اور دل کو ڈھارس ہے کہ ہماری یہ جدائی زیادہ طویل نہ ہوگی۔ ان شاء اللہ بہت جلد جنت میں ملاقات ہوگی، آپ تو اپنے اعمال صالحہ کے باعث وہاں ہوں گے اور میں آپ جیسے صلحا سے محبت کے صلے میں جنت میں جا سکوں گا۔

☆......☆......☆

دھنّا لال جی

۱۹۳۷ء کی بات ہے، میں اور میرے مرحوم چھوٹے بھائی اختر میاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ جامعہ کا مدرسہ ابتدائی (پرائمری سکول) جامعہ نگر (اوکھلا) منتقل ہو چکا تھا اور ہم وہیں جوہر منزل (دارالاقامہ) میں مقیم تھے۔ ایک دن ہم درس گاہ میں تھے، سبق ہو رہا تھا کہ مدرسہ کے نگران (پرنسپل) چوہدری اکبر علی مرحوم کا پرچہ ہمارے استاد جماعت عبدالغفار مدھولی کے نام آیا کہ وہ ہم دونوں بھائیوں کو دفتر نگران بھیج دیں۔ ان کے ایک عزیز مولانا ان سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ عبدالغفار صاحب نے وہ پرچہ ہمیں دیا اور جانے کی اجازت دی۔ ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہ کون سے مولانا آئے ہیں اکبر صاحب کے دفتر پہنچے تو وہاں دھنّا لال جی بیٹھے ہوئے تھے، جو ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ اکبر صاحب ادباً کھڑے ہو گئے۔ دھنّا لال جی نے ہمیں لپٹایا، پیار کیا اور جب اکبر صاحب نے ان سے کرسی پر تشریف رکھنے کے لیے کہا تو انھوں نے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ جب ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تب خود بیٹھے۔ ہماری خیر و عافیت پوچھی اور یہ کہ کوئی ضرورت کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ ساتھ ہی ایک بڑے سے ٹوکرے کی طرف اشارہ کیا کہ یہ تھوڑے سے پھل آپ لوگوں کے لیے لایا ہوں۔

اکبر صاحب نے ان کی رئیسانہ وضع قطع کو دیکھ کر جامعہ کی اعانت کی طرف انھیں توجہ

دلائی۔ انھوں نے اپنے ملازم کی طرف، جو پیچھے کھڑا تھا، اشارہ کیا۔ ملازم نے دس روپے نکال کر دیے جو دفتر کے کلرک نے وصول کیے اور رسید قطع کرنے کے لیے پوچھا ''اسم گرامی؟'' اس کے جواب میں انھوں نے کہا: ''خاک سار کو دھنّا لال کہتے ہیں۔''

یہ نام سن کر اکبر صاحب بھی چونک گئے اور کلرک نے بھی حیران ہو کر اس طرح سوال کیا جیسے وہ سن نہ سکا ہو۔ انھوں نے دوبارہ اپنا جواب دہرایا۔ پھر ہم لوگوں سے کہا۔ جائیے میاں! آپ لوگوں کی تعلیم کا حرج ہو رہا ہوگا۔ یہ کہہ کر کھڑے ہو کر ہم لوگوں کو رخصت کرنا چاہا مگر ہم رکنا چاہتے تھے کہ وہ کار میں سوار ہو جائیں، تو ہم جائیں لیکن انھوں نے کار میں ہمارے سامنے بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے ہم درسگاہ کی طرف روانہ ہو گئے تب وہ سوار ہوئے۔

میں نے شام کو اساتذہ کی محفل میں اکبر صاحب کو اپنی غلط فہمی یعنی دھنّا لال جی کو مسلمان اور مولانا سمجھ لینے کی غلطی کا تذکرہ کرتے اور سب کو حیرت سے سنتے دیکھا۔ اکبر صاحب کی غلط فہمی کی وجہ دھنّا لال جی کا سراپا تھا۔ لانبا قد، بھرا بھرا بدن، گورا چٹا رنگ، بڑی سی سلیقے سے ترشی ہوئی سفید داڑھی، سفید پاجامہ، بدن پر شیروانی، شیروانی کی جیب میں گھڑی، ہاتھ میں چھڑی، سر پر صافہ ۔۔۔۔ بھلا ایسے آدمی کے مولانا ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اور جب یہ مولانا نہیں بلکہ دھنّا لال نکلیں تو حیرت ہی ہونی چاہیے پھر دھنّا لال کا جامعہ ملّیہ میں دو مسلمان بچوں سے ملنے کے لیے دہلی سے آٹھ میل دور اوکھلے آنے والے پر مسلمان ہونے کا ہی گمان ہو سکتا ہے۔

دھنّا لال جی ریاست ٹونک کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے ہندوؤں کے ایک معزّز اور موقّر خاندان کے فرد تھے، پرانے ٹونک میں بڑی اور شان دار حویلی تھی۔ برسوں ریاست بوندی میں وزیر اعظم رہے تھے اور اب وظیفہ یاب ہو کر اپنے وطن میں مقیم تھے۔ ہمارے بزرگوں سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ اکثر آنا جانا، تہواروں کے موقعوں پر ہدیوں کا تبادلہ، ہر تقریب میں خصوصیّت سے شرکت، مسائل میں صلاح و مشورت، بیماری آزاری میں عیادت، غرض گہرے اور دیرینہ مراسم تھے اور یہ مراسم اس وقت بھی علیٰ حالہا برقرار رہے جب میرے والد اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

دھنا لال جی کو کسی ضرورت سے دہلی کا سفر پیش آیا تو انھیں یہ بھی یاد آیا کہ حکیم جی کے دو بچے حصول علم کے لیے دہلی گئے ہوئے ہیں چنانچہ ہمارے گھر آئے اور اندر کہلوایا کہ ''دہلی جا رہا ہوں۔ بچوں کو کچھ بھیجنا یا کہلوانا ہو تو حاضر ہوں۔ ان سے ملنے جاؤں گا۔'' چنانچہ دہلی پہنچ کر ہم سے ملنے کے لیے بھی وقت نکالا۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے والد کو دنیا سے سدھارے چار برس ہو چکے تھے۔ پھر اوکھلا دہلی سے آٹھ میل دور تھا۔ اور اس دور میں وہاں صرف خصوصی سواری سے آ جا سکتے تھے۔ ہم دونوں بھائی بہت خورد سال تھے۔ میں دس برس کا اور اختر میاں آٹھ سال کے تھے۔ مگر ہمارے ساتھ جو عقیدت اور احترام کا معاملہ انھوں نے کیا وہ بہت دن تک جامعہ کے حلقوں میں موضوع گفتگو رہا۔

☆......☆......☆

''امام آخرالزماں'' سے ملاقات

غالباً ۱۹۴۴ء تھا، میں طبیہ کالج، دہلی میں زیرِ تعلیم اور کالج ہی کے ہوسٹل میں مقیم تھا۔ کالج کے سامنے والی سڑک اجمل روڈ کہلاتی تھی۔ اجمل روڈ کے دوسری طرف ایک وسیع پارک تھی۔ ہم چند طلباء روزانہ صبح اس پارک میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی قریب ہی نسیم بلڈنگ نامی ایک تاریخی عمارت میں رہا کرتے تھے اور باقاعدگی سے روزانہ صبح پارک میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم سب حسب معمول چہل قدمی کر رہے تھے، مولانا سعید نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''یہ شخص متنبّی ہے۔''

میں یہ سمجھا کہ یہ عربی میں شعر کہتا ہے اور مولانا کی رائے میں اپنے وقت کا متنبّی ہے، جو عربی کا مشہور شاعر تھا، چنانچہ میں نے ان سے کہا:

''اچھا عربی میں شعر گوئی کا ملکہ ہے اسے؟''

''''جی نہیں، مدعی نبوت ہے'' مولانا نے جواب دیا۔

''مدعی نبوت! ہم سب غلامانِ محمد کے درمیان اور مدعی نبوت زندہ سلامت'' یہ کہہ کر میں اس کی طرف لپکا، وہ ایک سن رسیدہ مگر صحت مند آدمی تھا۔ سفید داڑھی، سفید عمامہ، ہاتھ میں چھڑی لیے ٹہل رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے آواز دی:

''او متنبّی! او متنبّی''

اس شخص نے پلٹ کر دیکھا اور ہمارا مکالمہ شروع ہو گیا۔ میں نے جوش میں اس سے تابڑ توڑ سوالات شروع کر دیے۔ تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ کیا حضور ﷺ کو خاتم النبیین نہیں مانتے؟ خاتم النبیین کا تمھارے نزدیک کیا مفہوم ہے وغیرہ۔ بڈھا بھانپ گیا کہ نوجوان جوش میں ہے، تنہا بھی نہیں ہے، ہنگامہ نہ ہو جائے۔ کہنے لگا:

''افواہوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے، تم بھی چہل قدمی کے لیے آئے ہو اور میں بھی، یہاں ہم کتنی دیر ٹھہر سکیں گے۔ اس قسم کی باتیں سکون سے بیٹھ کر کرنے کی ہوتی ہیں۔ کسی وقت میرے گھر آؤ تو گفتگو ہو، یہ وقت اور یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔''

بات ٹھیک تھی۔ میں اس سے پتہ لے کر اور وقت طے کر کے آ گیا۔

ہوسٹل آ کر اپنے حلقے کے ساتھیوں کو بتایا، وہ سب میری طرح دینی جذبات سے سرشار تھے۔ ادعائے نبوت کی بات سن کر وہ بھی بے چین ہو گئے اور اس سے جلد سے جلد نمٹ لینے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ہم چند دوستوں نے اس روز ناشتہ بھی نہیں کیا۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ کالج میں حاضری کا پروگرام بھی ملتوی کر دیا اور متنبّی سے گفتگو کے لیے ذہنی تیاری شروع کر دی۔ نکات اور دلائل کا باہم تبادلہ کیا اور مناظرے کا ایک منصوبہ بنا کر اس کی طرف چل پڑے۔ میرے ساتھ دو رفیق درس بھی تھے۔ ایک سواتی طالب علم سالار روم صاحب (معلوم نہیں اب کہاں ہیں) دوسرے محمد صدیق جامی (جو ۱۹۸۹ء میں رحلت فرما گئے)۔ وہ متنبّی ہمارے کالج کے قریب ہی بیڈن روڈ پر ایک مکان میں رہتا تھا۔ مکان کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ ایک پڑوسی نے بتایا کہ گھر میں خواتین نہیں ہیں۔ ہم اندر گئے تو وہ ایک کمرے میں فرش پر سو رہا تھا۔ سالار روم دھاڑے، ''او متنبّی! اُٹھ'' وہ شخص اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا، ''اب وقت ہے، سکون ہے، اب بتاؤ تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟'' اس بات کا جواب اس نے اثبات یا نفی میں دینے کی بجائے ایک طویل تقریر شروع کر دی اور ہوشیاری سے تقریر کو اتنا طول دیا کہ ہمارا درجہ حرارت کم ہوتا گیا۔ اس کی تقریر میں ایک تو چھوٹے چھوٹے کئی واقعات تھے جن کی وجہ سے اس کی تقریر بے لطف نہیں رہی۔ دوسرے اس نے ادعائے نبوت سے صاف انکار کر دیا اور کہا

کہ میں تو محمد ﷺ کا امتی ہوں۔ خود پیغمبر نہیں نہ کوئی پیغمبر آپ ﷺ کے بعد آئے گا۔ بلکہ میں امام آخر الزماں ہوں اور اپنی امامت کے لیے قرآنی آیات سے جو استدلال کیا وہ اتنا مضحکہ خیز تھا کہ ہمارے خشم ناک تیور مسکراہٹ میں بدل گئے۔ لطف یہ کہ خود بھی مسکرا رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے بمبئی کے غلامانِ نبیؐ کے ہاتھوں اپنی پٹائی اور کسی دین دار مسلمان سے اپنی مقدمہ بازی کی تفاصیل دلچسپ انداز میں سنائیں۔ پھر اپنی ایک تصنیف اٹھا لایا، اس کی بعض عبارات سنائیں جو قابل اعتراض نہیں تھیں، غرض ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اسے ادعائے نبوت نہیں ہے بلکہ ادعائے امامت ہے اور اس میں بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ دراصل مسخرہ ہے۔ اس تاثر کے بعد ہم معتدل ہو گئے اور ہمارا وہ جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ مگر ہمارے دوست جامی صاحب کو نئی سوجھی، وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گئے اور اچانک اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ شخص تقریباً ساٹھ سال کا بوڑھا تھا اور جامی صاحب نہ صرف جوان بلکہ روزانہ ڈنڈ بیٹھک کے عادی، ان کے پنجے کی گرفت کے بعد بھلا اس میں چھڑانے کی طاقت و ہمت کہاں ہو سکتی تھی۔ جامی صاحب نے اس کی گردن پر قبضہ کرنے کے بعد کہا:

''امام صاحب! اب کوئی معجزہ یا کرامت دکھاؤ۔''

اب صورت حال یہ تھی کہ بڈھے امام آخر الزماں کی گردن جامی صاحب کے فولادی پنجے میں تھی اور بڑی زاری سے التجائیں کر رہا تھا کہ گردن تو چھوڑو، بات تو سنو اور جامی صاحب مصر ہیں کہ ''رفع قبض'' تو معجزے کے بعد ہی ہو گا۔ آخر جب اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے تو جامی صاحب کو رحم آ گیا اور انھوں نے رفع قبض کیا۔

دوسرے دن صبح جب اجمل پارک میں ہم نے مولانا سعید احمد کو یہ قصہ سنایا تو چہل قدمی تو کجا وہ کھڑے بھی نہ رہ سکے، ہنستے ہنستے بیٹھ گئے۔ لطف یہ کہ امام آخر الزماں آج بھی بدستور چہل قدمی فرما رہا تھا۔

حال ہی میں اس کی ایک کتاب اتفاق سے ہاتھ آ گئی۔ کتاب کا نام ہے۔ ''آئینہ حق و باطل'' معروف بہ ''روئدادِ مقدمہ خاتم النبیین'' یہ جنوری ۱۹۴۳ء میں دارالفلاح، قرول باغ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب سے موصوف کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ درج ذیل

ہیں:

نام سید ظہیر حسن ولد سید مہدی حسن، امروہہ (یوپی) کے ایک محلے بارہ پوتیاں میں ایک شیعی گھرانے میں ولادت ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں "معراج" ہوئی، ۱۹۳۴ء میں اس پر ظاہر ہوا کہ وہ مہدی موعود ہے۔ اس کا اعلان اس نے "آوازِ حق" کے نام سے ایک رسالے میں کیا۔ جس پر عبدالمجید سالک نے روزنامہ انقلاب، لاہور میں اس پر ایک فکاہی کالم لکھا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں اس نے آریہ سماج کانفرنس دہلی میں ایک تقریر کی تھی۔ امام آخرالزماں، مہدی موعود کے علاوہ اپنے نام کے ساتھ "مثیل عیسیٰ روح اللہ" بھی لکھا کرتا۔ اس کا اصل ذریعہ معاش یہ تھا کہ یہ چاول پر قرآن مجید کی سورتیں لکھ کر امراء اور قدرشناسوں کے پاس لے جایا کرتا تھا اور اُن سے انعام پاتا تھا۔

کہتا تھا کہ میرا نام (ظہیر) قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ وبعد ذالك ظهير (سورۃ ۶۶، آیت ۴) اور میرے وطن امروہے کا نام بھی قرآن مجید میں ہے۔ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا اراد شيئاً ان يقول لَهُ كُنْ فيكون (سورۃ ۳۶، آیت ۸۲) اور اس لیے وہ اپنے نام کے ساتھ امروہوی نہیں بلکہ "امرہی" لکھا کرتا تھا اور پورا نام یوں لکھتا تھا۔

"ظہیر حسن سفیر اللہ امرہی مثیل عیسیٰ روح اللہ"

سر محمد یامین خان نے ایک بار وائسرائے کی بیگم کو پیش کرنے کے لیے اس سے ایک چاول پر تین سطری انگریزی عبارت لکھوائی تھی۔ سر یامین نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

"ایک مسلمان امروہے کا ہے جو چاول پر لکھتا ہے۔" (ص ۶۲۷ نامہ اعمال جلد اول)

☆......☆......☆

حکیم جگناتھ پرشاد

اکہرا بدن، لانبا قد، بڑی سفید ڈاڑھی، نوکیلی مونچھیں، صافہ، انگرکھا، چست پاجامہ، وعدہ
ماشاء اللہ پر ختم اور تعریف ماشاء اللہ سے شروع، طب یونانی سے عشق، طب کی اردو اور فارسی
متداول کتابوں پر نظر، اطباء قدیم کے معالجات کی معجز نمائیاں موضوع خاص، گفتگو میں موقع
بےموقع سے فارسی اساتذہ کے اشعار یا مصرعے، گلستان، بوستان، دفتر ابوالفضل وغیرہ کے جملے
ہر ایک زبان پر مگر نام حکیم جگناتھ پرشاد۔

ٹونک کے ایک ہندو طبیب مگر ٹونک ہی کی تہذیب کا ایک نمونہ۔ ٹونک میں ہندو آبادی
کے مخصوص محلّے تختہ میں رہتے تھے۔ یونانی مطب کرتے تھے۔ ویدک اور ایلوپیتھی دونوں پر
بیک لسان زبان نقد و جرح دراز اور طب یونانی کے دفاع میں ہر وقت کمر بستہ رہتے۔ سج دھج
مسلمانوں کی سی۔ دور سے آتا دیکھ کر اکثر لوگ یہ گمان کرتے کہ کوئی مسلمان آ رہا ہے۔ مگر
جب قریب آ کر آداب عرض کہتے تو ہندو ہونے کا پتہ چلتا۔

انھی حکیم جگناتھ پرشاد کا ایک واقعہ جب یاد آتا ہے تو میں کھوسا جاتا ہوں کہ یا خدا! کیا
زمانہ تھا اور زمانہ بھی بہت دور کا نہیں، ابھی ابھی تو گزرا ہے، ۱۹۴۸ء ہی کی تو بات ہے جب
میری ان سے ''گفتگو'' سی ہو گئی تھی، چھوٹا موٹا سا اختلاف ہو گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ انھوں نے
طب پر ایک کتاب لکھی تھی اور اس پر مجھ سے تقریظ لکھوانا چاہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ میں ان

کی نظر کسی قابل تھا بلکہ اس لیے کہ مجھے کچھ ایسے حضرات سے نسبت تھی جو ان کی نظر میں قابل احترام تھے۔ بہر حال میں نے خوش ہو کر اقرار کر لیا۔ مگر کتاب لے کر دیکھی تو وہ فارسی میں تھی۔ میری جوانی، بلکہ نوجوانی کا زمانہ تھا جس کو ہوش اور دانائی سے ازلی بیر ہے، چنانچہ میں نے اردو کی حمایت اور محبت کے جوش میں یہ اعتراض کر دیا کہ فارسی میں کتاب لکھنے کا کیا جواز ہے؟ ہماری قومی زبان اردو ہے اس لیے طبی سرمائے کو اردو میں منتقل کرنا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ناپختگی کی رو میں ایک تقریر اردو کی حمایت میں جھاڑ دی۔ حکیم صاحب اس کے جواب میں بڑی شائستگی کے ساتھ، بڑے باوقار انداز میں اس پر زور دیتے رہے کہ بے شک اردو ہماری قومی زبان ہے۔ مگر ہماری علمی وفنی زبان فارسی ہے۔ ہمارا بیش تر فنی سرمایہ عربی کے بعد فارسی میں ہے اور اسے ترک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ طب کو اردو میں منتقل کر دینے میں یہ اندیشہ ہے کہ یہ فن ارزاں ہو کر رہ جائے گا اور ہر کس و ناکس طب کی تحصیل کی جرأت کر بیٹھے گا اور اس طرح یہ شریف فن نااہلوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔

یہ گفتگو بڑی دیر تک رہی تھی اور بڑی پر لطف بھی تھی اور آخر میں صلح اس پر ہوئی تھی کہ میں تقریظ فارسی میں نہیں اردو میں لکھوں گا۔ اب سوچتا ہوں کہ نئے ہندوستان میں ۱۹۴۸ء میں ایک طرف پورا ملک اردو کی مخالفت میں شعلے برسا رہا تھا اور برادران وطن کو اردو اس لیے گوارا نہیں تھی کہ یہ قرآنی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک ہندو طبیب فارسی میں کتاب لکھ رہا تھا اور اس پر مُصر تھا کہ طب کی عملی زبان فارسی ہے اس لیے اس فن پر تصنیف و تالیف کا کام فارسی میں ہونا چاہیے۔

☆......☆......☆

سادھو مہاراج

ایک سادھو مہاراج سے ملاقات آج تک خوب یاد ہے حال آں کہ یہ کوئی نصف صدی پہلے کی بات ہے۔

برسات کا موسم تھا۔ فضا خوش گوار تھی۔ کئی دن تک برس کر ایک دن پہلے بادل چھٹے تھے۔ ہم چند ہم ذوق اور ہم سن دوست صبح سے اطراف شہر کی سیر کو نکلے تھے۔ راستے میں ایک باغ پڑتا تھا، چھوٹا سا، ایک چاردیواری سے محصور، حسن انتظام کا نمونہ، صاف ستھرا۔ ہم لوگ اس باغ میں زیادہ نہیں ٹھہرے اور ایک چکر لگا کر نکل آئے کیونکہ صبح سے پکے بندے، کچے بندے وغیرہ کئی تفریح گاہوں کی سیر کر چکے تھے اور اب گھر پہنچنے کے موڈ میں تھے۔ باغ میں ایک چوبارہ بنا ہوا تھا جس کو اس سے پہلے اکثر ہم نے خالی دیکھا تھا مگر آج اس میں ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔ یہ ایک سادھو مہاراج تھے۔ پھولوں سے لدے ہوئے پودوں، پھلوں سے جھکی ہوئی ڈالیوں اور برسات میں نہائے ہوئے درختوں کے درمیان سادھو جی کو دیکھ کر بے اختیار ان سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ دل نے کہا، بڑے خوش ذوق معلوم ہوتے ہیں کیسی نفیس جگہ دھونی جمائی ہے اور صحبت کے لیے کیسے حسین ساتھیوں کا انتخاب کیا ہے۔ ایسے رنگ رنگ کے پھول اور طرح طرح کے پھل جو خود کھلے پڑتے ہیں اور دوسرے کو مہکائے جاتے ہیں، ان سے اچھا ساتھی اور کون ہو سکتا ہے۔ ان سے باتیں کر کے یقیناً خوشی ہوگی۔ مگر میں نے اپنی خواہش

کا اظہار اپنے ساتھیوں سے نہیں کیا۔ کیوں کہ ایک تو سب کو واپسی کی جلدی تھی، پھر ہم میں سے ایک کو ''بحث خولیا'' کا مرض تھا۔ ہر ایک سے الجھ پڑنے میں وہ کسی کے کاکلوں سے کم نہیں تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی مذہب کے مقتدا سے کوئی کج بحثی کی جائے اس لیے میں اپنے ان رفقا کے ساتھ گھر واپس آ گیا اور فوراً ہی لوٹ کر باغ تنہا پہنچ گیا اور چوبارے کے سامنے کھڑے ہو کر سادھو سے مخاطب ہوا:

''مہاراج! کیا کر رہے ہیں؟''

''ایسے رنگین ماحول میں اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ ان مناظر سے لطف لے رہا ہوں اور مالک کی صناعی کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔''

جواب کی شگفتگی نے میری ہمت بندھائی اور میں احترام اور ادب کے ساتھ چوبارے پر چڑھ گیا اور اجازت لے کر مہاراج کے سامنے جا بیٹھا اور اس تاثر نے ایک انبساط کی کیفیت پیدا کر دی کہ ایک مرتاض، معمّر اور دنیا گریز بزرگ ایک نوعمر اجنبی کی مداخلت خلوت سے چیں بجبیں اور بے مزہ نہیں ہوئے اور مختصر سا اور خشک جواب دینے کے بجائے خوش مزاجی کا ثبوت دیا۔

میں نے اس دن مہاراج سے کوئی تین گھنٹے باتیں کی ہونگی اور آج اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد نہ اپنے سوال یاد ہیں نہ ان کے مفصل جواب مگر یہ خوب یاد ہے کہ جی چاہتا تھا کچھ دیر اور بیٹھوں اور یہ بھی کہ ان سے مل کر ایک انبساط کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ ملاقات کا آغاز میری طرف سے بے تکلفی اور مساویانہ انداز گفتگو سے ہوا تھا اور اختتام پر میرا احترام اور ان کی شفقت نمایاں تھی۔ مہاراج کو میں نے کوئی خشک مزاج، مردم بیزار، شے لطیف سے محروم، سرکہ جبیں، کم گو اور ہندومت کا مبلغ نہیں بلکہ ایک خوش طبع، خندہ رو، دردمند، باذوق، باخبر، مناظر قدرت کا شیدا، وسیع الظرف اور انسان دوست شخص پایا تھا۔ وہ اردو کے سادہ الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کرتے تھے۔ انگریزی کے متعدد الفاظ بھی انھوں نے استعمال کیے تھے۔ غالباً انگریزی کی کوئی ڈگری بھی بتائی کہ انھوں نے حاصل کی تھی۔ طرز فکر فلسفیانہ تھا اور انداز گفتگو استدلالی، تمثیل سے بالعموم کام لیتے تھے۔

میرے متعلق ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ باغ کی سیر کے لیے آیا تھا، ستانے اور دل بہلانے کے لیے چوبارے میں آ بیٹھا۔ جب ان پر واضح ہوا کہ مقصود ملاقات ہے تو پھر انھیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ اپنی کسی خواہش کے حصول کے لیے کوئی عمل وغیرہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میرے متعلق چند سوالات کیے اور جب یہ غلط فہمی دور ہوگئی کہ نہ میں بے روزگار ہوں، نہ کسی کے عشق میں مبتلا اور نہ کوئی ''عمل'' حاصل کرنا چاہتا ہوں، تو متاثر ہوئے، پگھلے، کھلے اور زیادہ متوجہ ہوئے۔ کہنے لگے:

''بڑی حیرت ہوتی ہے، لوگ فقیروں کے پاس انھیں اللہ والا سمجھ کر جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی، گندی گندی خواہشوں کی تکمیل کے لیے درخواست کرتے ہیں حال آں کہ کوئی بھی آدمی وید کے پاس نمک مرچ خریدنے یا بزاز سے آٹا دال لینے یا گندھی (عطر فروش) سے ہینگ لینے نہیں جاتا۔ گندھی کو اگر لوگوں پر حیرت نہ ہو تو کیوں نہ ہو کہ اس سے ہینگ مانگتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے، میں نے ان کے لیے طرح طرح کے پھولوں کی روح نکال کر رکھی کہ لوگ آئیں اور عطر لیں اور ان کی روح کو اہتزاز حاصل ہو۔ اس کے بجائے وہ مجھ سے ایک بدبو چیز کی طلب کرتے ہیں، فقیروں کو جب تم اللہ والا سمجھتے ہو تو ان سے اللہ کی باتیں پوچھو، اللہ سے ملنے کا راستہ پوچھو، اللہ والوں سے دنیا کی باتیں کتنی بے جا ہیں۔ کیوں جی!''

میں ان کی لذت تقریر میں گم تھا، اس سوال پر چونک پڑا، بڑے خلوص سے تائید میں سر ہلایا۔ مہاراج نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ کچھ ہی دن پہلے ہم نے ایک مندر کے سامنے ایک سادھو کو دیکھا تھا جو بالکل برہنہ بیٹھا ہوا تھا۔ اور ہندو عورتیں آ کر اس کے عضو تناسل کو چھوتی تھیں۔ بتایا گیا کہ یہ بہت بڑے سادھو ہیں، بہت دور سے آئے ہیں، آج درشن دے رہے ہیں۔ سادھو جی مہاراج سے باتیں کرتے ہوئے وہ منظر یاد آیا تو میں نے ان سے اپنی اس خلش کا ذکر کیا کہ ایک عبادت گاہ میں ایک مذہبی رسم کے طور پر یہ بات بڑی ناشائستہ معلوم ہوتی ہے۔ مہاراج میری بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے:

''اگر ہم ایک ماں کو دیکھیں کہ وہ اپنے بچے کو نہلا رہی ہے اور سر سے پاؤں تک اس کے ہر عضو کو صاف کر رہی ہے تو اسے قابل اعتراض سمجھیں گے؟''

میں نے کہا ''نہیں'' کہنے لگے:

''اگر ایک معتقد عورت اپنے مذہبی پیشوا کو اس طرح خراج عقیدت پیش کر رہی ہے، تنہائی میں نہیں مجمع میں، بہت سی عورتوں کے سامنے، تو اس میں گندگی کا پہلو کیسے پیدا ہو گیا؟ اب سادھو کی طرف دیکھیے جس کے احساسات میں تحریک پیدا نہیں ہوتی اور اس کی حالت سکون و خفتگی میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا، یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات ہے؟ جناب! یہ منزل برسوں کی ریاضت اور نفس کشی کے بعد پیدا ہوتی ہے کہ ایک مرد کامل اعتماد کے ساتھ مجمع میں آ بیٹھتا ہے اور دعوت دیتا ہے کہ اب مجھے نفس پر وہ اقتدار حاصل ہو گیا ہے کہ صنف مقابل کا تصور نہیں، آمنا سامنا نہیں، لمس بھی میرے حیوانی جذبات میں تحریک پیدا نہیں کر سکتا۔ چاہیں تو یوں کہہ لیں کہ بس اب وہ مرد، نہیں رہا اور اب اس کے لیے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رہا۔''

مہاراج نے لنگ پوجا کی جو توجیہ کی اور اس میں تقدیس اور عظمت کا جو پہلو اجاگر کرنا چاہا، اس نے تو متاثر نہیں کیا البتہ ان کے منطقیانہ طرز فکر و کلام نے بے شک متاثر کیا۔

میرے ایک استاد نے بیان کیا تھا کہ میں نے ایک سادھو کو دیکھا کہ اس کے لیے ایک ٹب میں دودھ بھرا گیا۔ پھر وہ اس میں بیٹھ گیا اور اس دودھ کو سُڑک گیا اور پیٹ میں چڑھا لیا۔ اس وقت مجھے وہ قصہ بھی یاد آیا اور میں نے مہاراج کو وہ سنا کر اس پر اپنی کراہت کا اظہار کیا۔ مہاراج نے میری بات سن کر خود ہماری درس گاہوں کے اساتذہ کی طرح پہلے تو میری بات کی خود توضیح کی:

''آپ کا مطلب یہ ہے نا کہ غذا کے استعمال کے لیے اللہ نے منہ بنایا ہے اور کسی دوسرے راستے کے ذریعہ غذا کا استعمال غیر فطری ہے اور ناپسندیدہ؟''

میں نے تائید کی تو مہاراج نے جواب کا آغاز کیا:

''حال آں کہ آپ بھول گئے۔ غذا کے استعمال کا واحد راستہ منہ نہیں ہے۔ غذا ہر حالت میں صرف منہ سے ہی استعمال نہیں ہوتی، دوسرے راستے بھی ہیں۔ بعض بیماریوں میں انیما کے ذریعے آنتوں کو غذا پہنچائی جاتی ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ غذا کا مقصد تغذیہ (بدن کو

غذائیت پہنچانا) ہے۔اور غذا کے لیے ہم نے لذت کی شرط عائد کر رکھی ہے مگر آپ کو مان لینا چاہیے کہ ہم انسانوں نے لذت کو غذا کا مقصد قرار دے لیا ہے اور ہم غذا صرف لذت کی خاطر کھاتے ہیں چنانچہ دیکھ لیجیے جو غذا وید حکیم ہمارے لیے ممنوع قرار دے دیتے ہیں، مرغوب طبع ہونے کی وجہ سے ہم اس کے کھانے سے باز نہیں آتے ہیں۔یا ایک غذا کی جتنی مقدار تغذیہ کے لیے کافی ہوتی ہے ہم زبان کے چٹخارے کے لیے اس مقدار سے بہت زیادہ وہ غذا کھا جاتے ہیں یا ایک غذا ہماری موجودہ حالت (بیماری یا ضعف) کے پیش نظر ضروری قرار دی جاتی ہے مگر ہم اس کو استعمال نہیں کرتے کیوں کہ وہ مرغوب طبع نہیں ہے۔مختصر یہ کہ ہم نے غذا کی لذت کو اس کے اصل مقصد پر مقدم کر لیا ہے مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارا یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔غذا کا اصل مقصد تغذیہ ہی ہونا چاہیے۔تو اب جو سنت (زاہد اور تارک لذات) غذا صرف تغذیہ کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور تغذیہ بھی اتنی قلیل مقدار میں کہ روح و بدن کا رشتہ برقرار رہ سکے، وہ اولاً تو غذا کی صرف اس مقدار پر اکتفا کرتے ہیں کہ تار نفس چلتا رہے ثانیاً وہ اکل غذا میں سے لذت کا عنصر یکسر خارج کر دینے کی خاطر ایسی غذائیں انتخاب کرتے ہیں جو لذیذ نہ ہوں، کڑوی کسیلی ہوں بلکہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک ذریعہ یہ بھی سوچا گیا کہ غذا کے استعمال کے معروف اور فطری راستے کو ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار کیا جائے تاکہ کسی نہ کسی پیمانے پر تغذیہ بدن بھی ہوتا رہے اور لذت کا سوال ہی ختم ہو جائے۔نفس کشی کے لیے ریاضت اور ترک لذت بہت ضروری ہے، لذت ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔اس دوسرے راستے سے ایک سنت، روزانہ نہیں، ہر چند روز بعد دودھ کی ایک محدود مقدار بدن میں جذب کر لیتا ہے اور اس سے پرماتما کی پوجا کے لیے شکتی (سکت) مل جاتی ہے اور ایک بہت بڑے فتنے، زبان کے چٹخارے کا در بند ہو جاتا ہے۔لذت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور غذا سے صرف حصول غذائیت پیش نظر ہوتا ہے۔ایک اور فائدہ یہ ہوتا ہے کہ غذا کا تنوع ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ اس غیر فطری راستے سے صرف وہ غذا کھائی جا سکتی ہے جو سیال ہو اور ہر سیال غذا بھی نہیں مثلاً چپچپا سیال بھی نہیں کھایا جا سکتا۔پھر بعض سیال غذائیں ہر شخص کے لیے ہر موسم اور ہر حالت میں سہل الحصول نہیں ہوتیں مثلاً پھلوں کا رس وغیرہ مختصر یہ کہ صرف دودھ اور پانی ہی

ایسی چیزیں ہیں جو اس طرح اس راستے سے پی اور سُر کی جا سکتی ہیں۔

دودھ کے بہت سے فائدے ہیں کسی بھی ڈاکٹر سے پوچھ کر دیکھیے۔ ایک طرف یہ مکمل غذا ہے۔ دوسری طرف دوسری غذاؤں ماس (گوشت) وغیرہ کی طرح حیوانی (شہوانی) جذبات کو بھڑکانے والی نہیں ہے۔ پوجا پاٹ میں حیوانی جذبات کا غلبہ حد سے زیادہ حارج اور مانع ہوتا ہے۔ سوچیے، اگر کوئی سنت یہ غذا اس طرح استعمال کرتا ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے تو یہ کوئی قابل تعریف بات ہوئی یا قابل اعتراض؟''

مہاراج سے ان کے مستقل قیام، وطن، مشاغل وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے بتایا کہ مشغلہ اور مقصد حیات تو مالک کی یاد ہے اور تزکیۂ روح، رہا قیام تو وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے۔ کہنے لگے: ''کسی ایک جگہ سے محبت بھی حصول مقصد کے لیے سنگ راہ ہوتی ہے اس لیے ہم کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے، کبھی یہاں کبھی وہاں، بس یہ احتیاط رکھتے ہیں کہ قیام کے لیے وہ جگہ منتخب کریں جو آبادی سے دور ہو۔ اس راہ کا ایک پتھر آدمی اور اس کا تمدن بھی ہے اس لیے ہم زیادہ جنگلوں، پہاڑوں کی بلندیوں پر اور دریاؤں کے کنارے پر قیام کرتے ہیں۔''

''دل نہیں گھبراتا؟''

''نہیں گھبراتا (پھر مسکرا کر) جس کو اتنے ساتھی حاصل ہو جائیں، اس کا دل کیوں گھبرانے لگا؟''

''ساتھی کون سے؟''

''یہی، اٹھلاتی ہوئی موجیں، مہکتے ہوئے پھول، استقبال کے لیے بچھ بچھ جانے والا سبزہ، قیامت قامت درخت، گنگناتا ہوا سناٹا، معصوم چرندوں کے الھڑ مشغلے، چڑیوں کی ساحرانہ موسیقی غرض ہر نوع کے نہایت دل آویز مناظر ہوتے ہیں۔ بھلا ایسے میں کسی کا دل کیوں گھبرانے لگا۔''

مہاراج نے ایسے شاعرانہ انداز میں اس خلوت صحرا کی انجمن، اس آبادی ویراں اور اس ہنگامہ خموشی کی تصویر کھینچی کہ میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ الفاظ یہ نہیں تھے، مگر ہندی اور اردو کے سادہ سادہ لفظوں کے صحیح انتخاب اور موضوع سے ان کے خلوص اور جذبے کی صداقت نے ان کی

تقریر میں جادو بھر دیا تھا۔ میں بھی بہت دیر تک ان کے ساتھ سفر میں رہا۔ کبھی کسی پہاڑ کی بلند و بالا چوٹی پر، کبھی کسی مسطح چٹان پر، کبھی شاداب مرغزاروں میں، کبھی کسی گھنے درخت کے ٹھنڈے سائے میں، کبھی گلاب کے تختے کے پاس، کبھی ندی کی نرم ریت پر غرض بہت دیر تک مناظر قدرت کے نظارے میں کھویا رہا۔ اسی تصوراتی کیفیت میں اچانک مجھے شیر کی دھاڑ سنائی دی اور میں نے چونک کر مہاراج سے کہا:

''آپ کو درندے نقصان نہیں پہنچاتے؟''

''درندے؟۔۔۔۔ درندے تو شہروں میں رہتے ہیں۔ جنگلوں میں تو ہم نے درندے نہیں دیکھے، آبادیوں میں ضرور سننے میں آتا ہے کہ آدمی نے آدمی کو مار ڈالا، لشکروں سے لشکر ٹکرا گئے ہیں اور زمین کو لال کیے دیتے ہیں۔ قوموں سے قومیں جنگ کرتی اور ایک دوسرے کا خون بہاتی ہیں۔ امیر غریب کا، زمیں دار کاشت کار کا، مالک نوکر کا، بنیا گاہک کا، برہمن اپنے معتقد کا مستقل خون چوستا ہے۔ جنگلوں میں تو ایسا منظر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔''

مہاراج کی یہ انسان دوستانہ تقریر مجھ درندے کے سر پر سے گزر گئی اور میں نے مہاراج کے دل کے درد کی گہرائی میں جانے کی بجائے ایک شہری کی سی پست سطح سے سوال داغا:

''جنگل میں شیر، تیندوے، چیتے، ہاتھی نہیں ہوتے مہاراج؟''

''ہوتے ہیں، مگر آپ تو درندوں کی بات کر رہے تھے، شیر اور ہاتھی تو درندے نہیں ہوتے، درندے تو انسان ہوتے ہیں۔ شیر اور چیتے تو بڑی پیاری مخلوق ہے۔ اور بہت ہی حسین۔ ان کی صورت بھی موہنی ہوتی ہے اور سیرت بھی بے داغ۔ جنگل میں ان کی پر امن زندگی کی جھلک بھی جو کوئی دیکھ لیتا ہے وہ آدمیوں سے بھاگنے لگتا ہے۔ ان میں بعض صفات اللہ نے ایسی ودیعت کی ہیں کہ انسان کو ان پر رشک اور ان کی تقلید کرنی چاہیے۔

دو ایک خوبیاں آپ سنیں، بس اس وقت تو سن لیں اور یاد رکھیں کیوں کہ ممکن ہے اس وقت ان صفات کو اہمیت نہ دیں لیکن جب آپ بڑے ہو جائیں گے اور شعور میں پختگی آجائے گی تو آپ ان کی اہمیت کو محسوس کریں گے۔

ایک عجیب بات تو میں نے جانوروں کی جبلت میں دیکھی کہ آج تک کسی جانور کو ایسی

چیز کھاتے ہوئے نہیں دیکھا جو اس کے لیے مضرت رساں ہو۔ جنس حیوان میں سے یہ فخر صرف حضرت انسان کو حاصل ہے کہ وہ مضرت رساں چیزوں کی طرف خصوصی رغبت رکھتا ہے۔ عقل، علم اور تجربہ جس کو مضر بتاتا ہے، انسان اس سے ذوق فرماتا ہے مگر حیوان ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، فاقے میں بھی اس پر منہ نہیں مارتا اور اسی لیے ان کو کسی پیتھی (pathy) کی ضرورت نہیں ہوتی اور جانوروں میں وید اور حکیم نہیں ہوتے۔

دوسری خاص بات جو میں نے مشاہدہ کی یہ ہے کہ کبھی کوئی جانور پیٹ کی گنجائش سے زیادہ نہیں کھاتا اور اسی لیے جانور بیمار کم پڑتے ہیں اور اسی لیے میں نے جنگلوں میں کوئی مطب نہیں دیکھا۔ ہاں، آدمی میں اس کے غافل ہونے کی بنا پر یہ خصوصیت ہے کہ وہ اکثر بے بھوک کھانے بیٹھ جاتا ہے یا بھوک سے زیادہ کھا جاتا ہے اور اسی لیے شہروں میں شفاخانوں کی عمارتیں پھیلتی چلی جاتی ہیں، تن درستوں کی تعداد بیماروں سے کم ہوتی ہے، تن درستی ہوتی بھی ہے تو معیاری نہیں ہوتی، عمریں کم ہوتی ہیں۔ رہی جانوروں سے خوف کی بات تو ہمیں ان سے خوف نہیں آتا بلکہ پیار آتا ہے۔ ان کو بھاگتے دوڑتے، کھاتے پیتے، آپس میں چہلیں کرتے، سوتے جاگتے، کسی حالت میں بھی دیکھیے، پیارے لگتے ہیں۔ اپنے حال میں مگن ہوتے ہیں، دوسروں سے تعرض نہیں ہوتا، اس لیے ان سے کوئی خوف اور خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ بارہا ہم شیر کے قریب سے گزر گئے، شیر ہمارے برابر سے ہو کر گزر گیا، مگر ہماری خیر و عافیت تک نہیں پوچھی، بھئی! ہم نے تو جانوروں کو معیاری ساتھی اور مثالی ہمسایہ پایا ہے۔ ہاں، خوب یاد آیا، ہمارے یہ دوست کبھی آپ کے شہروں میں شکار کھیلنے نہیں جاتے۔ آپ کے آدمی ہمارے جنگلوں میں بے گناہ جانوروں کا بے ضرورت شکار کھیلنے ضرور آتے رہتے ہیں اور ایک ایک حملے میں دسیوں بیسیوں جانوروں کو مار کر چلے جاتے ہیں۔"

"تو جنگل میں آپ کی زندگی بے خطر گزرتی ہے" میں نے پھر اپنی بات دہرائی۔

"بالکل بے خطر، خطرہ کاہے کا؟ سامان کا؟ تو سامان تو ہوتا ہی نہیں۔ اپنی جان کا؟ تو وہ ہماری کب ہے؟ جو اس کی حفاظت ہمارے ذمے ہو۔ جنگل کی زندگی وہی اختیار کرے گا جس کو جان عزیز نہ ہو، جو جان کو اپنی ملک نہیں بلکہ امانت سمجھتا ہو۔ جب آپ دل کی اس پاکیزگی کے

ساتھ جنگل میں جا بسیں گے تو آپ کی حرکات وسکنات، انداز و اطوار سے جانوروں کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ بن کا باسی بن کر آیا ہے، شکاری نہیں ہے۔ اب اس میں، آدمیت، باقی نہیں رہی اور یہ نہ ہمیں چھیڑتا ہے نہ ہم اسے چھیڑتے ہیں۔''

دورانِ گفتگو ایک موقع پر مہاراج نے اپنی ایک تقریر کا آغاز جس جملے سے کیا تھا اور جو تمہیدی فقرہ استعمال کیا تھا، اس کے البیلے پن پر میں بے اختیار جھوم گیا تھا۔ مہاراج اپنے ماضی اور اپنی شہری زندگی کا کوئی واقعہ بیان کر رہے تھے، اس کی تمہید یوں اٹھائی: ''جب میں زندہ تھا۔''



گذشتہ نصف صدی میں جو شخصیت علم [illegible]

شخصیت مولانا محمود احمد برکاتی [illegible]

سے ان [illegible] طب کی بنا [illegible]

مولانا حکیم محمد [illegible]

[illegible]

علما اور طلبا معتبر حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ایک ایسے [illegible] جا تو دے [illegible]

پاک کے نامور عالم وطبیب کی حیثیت سے تمام حلقوں میں قدر [illegible]

خانوادہ فکر ونظر اور علم وفن کا ایک خاص [illegible] تھا جس کی [illegible]

ذات میں ہمیں نظر آتی ہیں۔